MAHS102CCT

ہندوستان میں سیاسی اور انتظامی ادارے

(بارہویں تا اٹھارہویں صدی)

Political and Administrative Institutions in India

(12 th – 18th Centuries)

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

ایم۔اے۔ (پہلا سمسٹر)

دوسرا پرچہ

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد، تلنگانہ، بھارت – 500 032

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: Political and Administrative Instistutions in India (12^{th} – 18^{th} Centuries)
ISBN: 978-93-95203-33-3
Edition: December 2022

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2022
Copies	:	1000
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator – History, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Bussiness Enterprises, Hyderabad

M.A. History

Political and Administrative Institutions in India
(12^{th} – 18^{th} Centuries)
1^{st} Semester

On behalf of the Registrar, Published by

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad – 500 032 (Telangana State), India
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر اعلیٰ

Chief Editor

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head, Department of History and Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi
&
Maulana Azad Chair Professor
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین
سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی &
مولانا آزاد چیئر پروفیسر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر

Editor

***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha**
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر زبان

Language Editor

Dr. Mohd Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر اردو (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مجلس ادارت

Editorial Board

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies
Department of History
Aligarh Muslim University, Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شعبہ تاریخ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College, Azamgarh

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha**
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Ahmad
PGT (History)
MANUU Model School
Hyderabad

ڈاکٹر احمد
پی جی ٹی (تاریخ)
مانو ماڈل اسکول، حیدرآباد

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Mr. Mohd. Aasim
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

جناب محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پروگرام کوآرڈی نیٹر:

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
• ڈاکٹر احمد	1،2
• ڈاکٹر داؤد ابراہیم	3
• ڈاکٹر ارچنا کماری	4
• ڈاکٹر مظفر اسلام	5
• پروفیسر علاؤالدین خان	6،13،14،15
• ڈاکٹر عرشیا شفقت	7،8
• ڈاکٹر فیاض احمد کوٹے	9،10،12
• ڈاکٹر خورشید احمد بٹ	11
• جناب محمد عاصم	16

پروف ریڈرس

1. جناب محمد عاصم
2. ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
3. ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	پروگرام کوآرڈی نیٹر	9
بلاک-I	**ہندوستان میں عہد وسطیٰ**	
اکائی 1	دہلی سلطنت کے ماخذ	13
اکائی 2	مغل سلطنت کے ماخذ	28
اکائی 3	علاقائی سلطنتوں کے ماخذ	51
بلاک-II	**دہلی سلطنت کا ارتقا اور توسیع**	
اکائی 4	ترکوں کی فتح کے وقت ہندوستان	67
اکائی 5	دہلی سلطنت: ریاست کی نوعیت	79
اکائی 6	دہلی سلطنت: نظم ونسق	93
اکائی 7	دہلی سلطنت: سماجی گروہ	113
اکائی 8	علاقائی سلطنتیں	126
بلاک-III	**مغل سلطنت**	
اکائی 9	مغل سلطنت: قیام	141
اکائی 10	مغل سلطنت: ریاست کی نوعیت	157

اکائی11	مغل نظریہ بادشاہت	168
اکائی12	مغل سلطنت: طبقہ امرا	188
اکائی13	مغل سلطنت: نظم ونسق	199
بلاک-IV	**مابعد مغل دور**	
اکائی14	مغل سلطنت کا زوال	221
اکائی15	علاقائی طاقتوں کا عروج	239
اکائی16	اٹھارہویں صدی کا ہندوستان: ایک مباحثہ	264
نمونہ امتحانی پرچہ		281

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔(1)اردو زبان کی ترویج و ترقی (2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کردیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اردو میں دستیاب تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ و شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج دور حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کردی ہے۔یہی وہ مبارزات (Challenges) ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔انہیں مقاصد کے حصول کے لیے اردو یونیورسٹی کا آغاز فاصلاتی تعلیم سے 1998 میں ہوا تھا۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اس کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔فاصلاتی تعلیم کے طلباء کے لیے کم سے کم وقت میں خود اکتسابی مواد اور خود اکتسابی کتب کی اشاعت کا کام عمل میں آگیا ہے۔ پہلے اور دوسرے سمسٹر کی کتب شائع ہو کر طلباء و طالبات تک پہنچ چکی ہیں۔ تیسرے سمسٹر کی کتابیں بھی جلد طلباء تک پہنچیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے ہم ایک بڑی اردو آبادی کی ضروریات کو پورا کر سکیں گے اور اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کر سکیں گے۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 5 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 155 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز متعلمین ! 'ہندوستان میں سیاسی اور انتظامی ادارے (بارہویں تا اٹھارہویں صدی)' کورس میں خوش آمدید۔اس کورس میں، آپ ان متنوع سیاسی اور انتظامی اداروں کے بارے میں جانیں گے جو ہندوستانی تہذیب کے عہد وسطیٰ میں فروغ پائے۔ چونکہ مآخذ، علم تاریخ کی شہ رگ ہیں،اس لیے آپ کو ان مآخذ سے کسی حد تک تفصیلی طور پر واقف کروایا گیا ہے جنہیں مورخین نے ہندوستانی تاریخ لکھنے کے لیے استعمال کیا ہے یا کرتے ہیں۔آپ سمجھ پائیں گے کہ دہلی کے سلطانوں، ہندوستان کے مغلوں اور مختلف علاقائی طاقتوں کے تحت کس طرح سیاسی اور انتظامی اداروں کی مختلف ساختوں کو فروغ حاصل ہوا۔ ریاست کی نوعیت، انتظامی ادارے اور مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے امراء اور انتظامی افسران جیسے پہلو آپ کے سامنے مزید واضح ہوں گے۔ جیسا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ سے متعلق فہم کے بجائے غلط فہمیاں زیادہ ہیں جو ہندوستانیوں کو درپیش چند عصری مسائل خاص طور پر عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کی غلط اور متعصبانہ سمجھ کا نتیجہ ہیں۔اس کورس کی مختلف اکائیاں،اس علم کے معروف دانشوروں کی تحریر کردہ ہیں جو آپ کو ایک طرح سے عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد دیں گی۔ اس کورس کی آخری اکائی آپ کو اس برطانوی نوآبادیاتی الزام کو مسترد کرنے میں مدد دے گی کہ ہندوستانی تاریخ کی اٹھارویں صدی ایک 'تاریک دور' کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ کہ انگریزوں نے اپنے تہذیبی مشن کے ذریعہ اس کو روشن کیا۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔عام لوگ بشمول مرد وخواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور "تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ نا وہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک قلی کون تھے؟'' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ : "جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔" ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ "تاریخ کا معاشرے سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔ وِدیاواچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق ، نظامت فاصلاتی تعلیم ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید اور میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

وِدیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

پروگرام کوآرڈی نیٹر

ہندوستان میں سیاسی اور انتظامی ادارے

(بارہویں تا اٹھارہویں صدی)

Political and Administrative Institutions in India

(12^{th} –18^{th} Centuries)

اکائی 1۔ دہلی سلطنت کے مآخذ

(Sources of Delhi Sultanate)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 ہندوستان میں تاریخ نویسی کا پس منظر

1.2.1 فارسی تاریخ نویسی کے اثرات

1.2.2 عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی پر مذہبی اثرات

1.3 برصغیر میں تاریخ نویسی

1.4 عہد سلطنت کے اہم مورخین اور ان کی تاریخی تصنیفات

1.4.1 تاج الماٰثر: حسن نظامی

1.4.2 آداب الحرب والشجاعۃ: فخر مدبر

1.4.3 طبقاتِ ناصری: منہاج السراج

1.4.4 تاریخ فیروز شاہی: ضیاء الدین برنی

1.4.5 خزائن الفتوح: امیر خسرو

1.4.6 تاریخ مبارک شاہی: یحییٰ بن احمد سرہندی

1.4.7 تاریخ فیروز شاہی: شمس سراج عفیف

1.4.8 فتوح السلاطین: عصامی

1.5 اکتسابی نتائج

1.6 کلیدی الفاظ

1.7 نمونہ امتحانی سوالات

1.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.0 تمہید (Introduction)

قدیم ہندوستان کا ادبی سرمایہ متنوع اور مالا مال ہونے کے باوجود تاریخی اعتبار سے کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر پر دیومالائی مبالغہ آرائی کا بہت زیادہ اثر ہے جن کی تاریخی صداقت مشکوک ہے۔ آر۔ پی۔ ترپاٹھی لکھتے ہیں کہ 'برہمنوں، بودھوں اور جینیوں کی ادبی کتابوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو سلاطین کی کتابوں، لیوی کی تاریخ، یا ہیروڈوٹس کی تواریخ کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کا ماضی عظیم الشان کارناموں سے بالکل عاری ہے۔' اس کے باوجود کہ یہ عہد جرأت مند کارناموں، سماجی انقلاب اور خاندانی تغیرات سے بھرا پڑا ہے لیکن یہ تمام واقعات تسلسل کے ساتھ باقاعدہ تاریخ کا حصہ نہیں بن سکے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔

ایک بات تو یہ کہی جاتی ہے کہ قدیم ہندوستان کے لوگوں میں تاریخی ذوق نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ یہاں کا مذہبی فرقہ جو ادبی ذوق رکھتا تھا اور ادب کے فروغ اور اس کی نشوونما میں دلچسپی رکھتا تھا اس سے بے توجہی برت رہا تھا۔ تیسرے یہ کہ اس عہد کے مذہبی ادب پر جن کو اقتدار حاصل تھا (برہمن) وہ اپنے دیگر ہم وطنوں کو اس سے بے بہرہ رکھنا چاہتے تھے اور اس پر شدت سے عمل پیرا تھے۔ اسی وجہ سے قدیم ہندوستان کے مورخین کو تاریخی شواہد اور اسناد کی کمی کا سامنا ہمیشہ کرنا پڑتا ہے۔ البیرونی نے بھی لکھا ہے کہ 'ہندو لوگ تاریخی تسلسل کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے اور نہ ہی تاریخ وار واقعہ نگاری کی پرواہ کرتے ہیں۔'

ہندوستان میں تاریخ نویسی کا باقاعدہ آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے شروع ہوا۔ تاریخ اور تاریخ نگاری کا احساس شروع سے ہی مسلمانوں میں زیادہ رہا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ نویسی مسلمانوں کی دین ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام سے پیغمبرِ اسلام، خلفاء راشدین، سلاطین اور امراء کی زندگیوں پر عربی زبان میں سیرت اور تاریخ پر کتابیں لکھی جانے لگی جو کہ صرف قرآن اور دانشور طبقہ کی زبان تھی۔

لیکن دسویں صدی کے دوسرے نصف سے جب ایران میں جذبۂ قومیت کی تجدید ہوئی اور ترک حکومتوں نے فارسی زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کو اختیار کیا تو تاریخی کتابیں فارسی میں لکھی جانے لگیں اور جب مسلمان ہندوستان آئے تو تاریخ نویسی کی فارسی روایات بھی ساتھ لائے تھے۔ فارسی میں لکھی ہوئی تاریخی کتابیں ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے اہم تاریخی ماخذ ہیں۔ عہد سلطنت کی تاریخ نویسی کی خصوصیات اور ارتقاء پر بحث سے قبل ہندوستان میں تاریخ نویسی کے پس منظر کا مختصر جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں تاریخ نویسی کے پس منظر کو جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں تاریخ نویسی کے ارتقا پر گفتگو کر سکیں گے۔
- ہندوستانی تاریخ نویسی پر فارسی تاریخی اثرات سے واقف ہو سکیں گے۔
- برِ صغیر میں تاریخ نویسی پر مذہبی اثرات پر بحث کر سکیں گے۔
- تاج المآثر اور طبقات ناصری کی تاریخی اہمیت بیان کر سکیں گے۔
- برنی، خسرو، عصامی اور سرہندی، کی تاریخی خدمات کو پہچان سکیں گے

1.2 ہندوستان میں تاریخ نویسی کا پس منظر (Background to Historiography in India)

اسلامی تاریخ نویسی کی کچھ خاص خصوصیات بتانے سے ہمیں ہندوستان میں تاریخ نویسی کے طریقہ کار کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی۔ سب سے پہلی چیز کہ قرآن وحدیث اس کا بنیادی مرکز تھے۔ یہاں قرآن وحدیث اور سنت پر تنقید ممکن نہیں۔ تنقید صرف مذہب کی حدود میں ہونی چاہیے۔ اسلامی تاریخ نویسی کی ایک اور خصوصیت واقعات کا تفصیلی بیان ہے اور کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت فراہم کرنا ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے کوئی واقعہ بیان کرنے کے لیے کسی ہم عصر شخص کی شہادت کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ یہ روایت اتنی مضبوطی سے قائم ہے کہ بیسویں صدی کے مورخین بھی اس پر یقین کرتے ہیں۔

1.2.1 فارسی تاریخ نویسی کے اثرات (Impact of Persian Historiography)

فارسی نشاۃ ثانیہ نے تاریخ نویسی پر انتہائی اہم اور گہرے نقوش مرتب کیے۔ اس دور کی تاریخ سلاطین، بادشاہوں، حکمرانوں اور ان کی درباری سرگرمیوں کی تاریخ میں بدل گئی۔ اب تاریخ کی کتابیں سلاطین اور بادشاہوں کے لیے وقف کی جارہی تھیں۔ عربوں میں واقعات کی شہادت دینے کا جو طریقہ تھا وہ بھی ختم کر دیا گیا۔ لہٰذا تاریخ نویسی اس بدلی ہوئی شکل میں ہندوستان میں داخل ہوئی، جو ایرانی اور عرب دونوں طریقوں کا مرکب تھا۔ ہندوستان کی تاریخ نویسی میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی جس سے مسلم تاریخ نویسی کی تحریر میں کوئی بڑی تبدیلی آتی۔ پھر بھی 'نیائے' اور 'کرما' کے اصول نے اسے کافی حد تک متاثر کیا۔ حکمرانوں کو رعایا کی حالت سے نیکی اور بدی کا براہ راست تعلق بتایا گیا۔ عام لوگوں کو یقین تھا کہ لوگوں کے برے اعمال سے ناخوش ہو کر خدا ان پر بے وقوف اور خونخوار حکمرانوں اور آسمانی قوتوں کو بھیجتا ہے، وہ اپنا غصہ اس طرح نکالتا ہے۔ یہ نظریہ عہد وسطیٰ کی تاریخ میں بڑے پیمانے پر استعمال ہوا اور مسلم حکمرانوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا۔ زوال کو ان کی بے کرداری سے جوڑنا اسی اصول پر مبنی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں پروان پانے والی تاریخ نویسی کے رجحانات میں اسلامی، ایرانی اور ہندوستانی روایات موجود تھیں۔ اس کی اپنی کچھ خصوصیات تھیں۔ جیسے سیاسی واقعات کا تفصیلی بیان، جیسا کہ منہاج الدین

سراج کی طبقاتِ ناصری میں موجود ہے۔ کھجور کے استعمال پر زیادہ زور دیا گیا۔ مشق بھی زور پکڑ گئی۔ جس کی بہترین مثالیں برنی اور بدایونی کی کتابیں ہیں۔ واقعات کی عصری وضاحتوں پر زیادہ توجہ دی گئی۔ صوبوں کی تاریخ لکھنے کی ایک اور خصوصیت تاریخ پر انفرادی افکار واحساسات کی نقوش ہے اس دور کی ایک خصوصیت سماجی ڈھانچے کے خلاف کسی چیلنج کی عدم موجود گی ہے۔

اولیاء کے رویے کو باغی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ وہ خود اس معاشرے کا حصہ ہیں۔ انہوں نے بادشاہ اور سماج کے جاگیر دارانہ خاندانوں کی مخالفت نہیں کی، شاید اس لیے کہ ان کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ بادشاہوں اور درباروں سے الگ رہنا چاہتے تھے تاکہ وہ بادشاہوں کے جرائم اور مظالم سے جڑے نہ رہیں۔ انہوں نے حکمراں طبقے کے ظلم وجور کو 'کرم' کے اصول سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اس طرح کے جبر واستبداد کو جو روایت قائم ہوئی اس کے مطابق اسے استحصال تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ روایتی اصول وضوابط اور قانون کی خلاف ورزی کو ظلم سمجھا جاتا تھا اور اس کی سماج میں سخت ممانعت کی جاتی تھی۔ لہٰذا، لفظ "استحصال" کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے تناظر میں ہمیشہ انصاف کو سامنے رکھنا چاہیے اور اس لفظ کو بہت احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے۔ اس تحصال کو ہمیشہ انصاف کے ضد کے طور پر ہی دیکھنا چاہئے۔

1.2.2 عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی پر مذہبی اثرات

(Impact of Religion on Medieval Historiography)

عہد وسطیٰ کو مذہب کا دور کہنا شاید بے جا نہیں ہوگا کیونکہ اس دور میں مذہب کے علاوہ کوئی دوسرا فلسفہ دستیاب نہیں تھا۔ تمام خیالات و نظریات کو مذہبی انداز میں بیان کیا جاتا تھا۔ اس لیے یہ فطری بات تھی کہ حکمراں طبقہ اپنی کچھ پالیسیوں کو مذہب کا رنگ دے کر پیش کرے۔ چنانچہ اس دور کے مورخین نے بھی مذہبی اصطلاحات کا بہت زیادہ استعمال کیا کیونکہ اس عہد کے زیادہ تر مورخین دینی مدارس کے تعلیم یافتہ اور اسی ماحول کے پروردہ تھے۔ دلچسپ بات یہ کہ غالباً اس دور کا ہر پڑھا لکھا شخص عالم دین ہوا کرتا تھا۔ ان مورخین کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے اس پس منظر کو دھیان میں رکھنا بے حد ضروری ہے۔ تاریخ کے واقعات میں اس طرح کے بہت سے شواہد موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان مذہبی الفاظ کے استعمال کی اصل وجہ اس عہد کا طرز تحریر تھا۔ ان کے تاریخی رجحانات کو ان کی مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں جوڑا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر شاہجہاں کے زمانے میں وسطی ایشیا کی جنگ میں دونوں جانب سے فون میں لڑنے والوں میں مسلمان تھے۔ لیکن اس وقت کے مورخین نے مخالف فوج کو لشکر کفر اور شاہی دفاع کو لشکر اسلام کہتے تھے۔ واضح رہے کہ یہ الفاظ اس دور کے لکھنے کے فن کا اظہار کرتے ہیں اس کا تعلق کسی بھی طرح کے مذہبی جنون سے نہیں تھا۔ لیکن جب یہ الفاظ ہندوستان کے لوگوں کے حوالے سے استعمال ہوئے تو اسے مذہبی جنون اور مسلمانوں کا ہندو دشمن سمجھا گیا۔ اس اصطلاح نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ میں بڑی الجھنیں پیدا کی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔

ایک نظریہ کے مطابق بادشاہ کا اختیار قرآن وحدیث کے زیر کنٹرول تھا۔ علماء نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ حکمراں طبقہ شریعت

کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ لیکن در حقیقت بادشاہوں نے کبھی بھی اس کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ بعض موقعوں پر مذہب کے نام پر ایسے اقدامات کیے جو نہ صرف غیر مذہبی تھے بلکہ مذہبی تعصب کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئے۔ جیسے مندروں کے انہدام غیر اسلامی ٹیکس کی وصولی جیسے کام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھے۔اس لیے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کو اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس دور کے ادیب اور دانشور یہ کوشش کرتے تھے کہ مذہبی معاملات کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں۔

1.3 ہندوستانی برصغیر میں تاریخ نویسی (Historiography in Indian Subcontinent)

قابل غور بات یہ کہ ہندوستانی لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ بادشاہ (راجا) کے ذریعہ بھگوان (پرماتما) اپنی مرضی سے کرتا ہے اس وجہ سے اس کو لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں نیز یہ کہ تاریخ نویسی خالص سائنسی رجحانات (scientific trends) پر مبنی ہے اس میں مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ تاریخ میں سوالات اور حقائق پر زور دیا جاتا ہے جو کہ مذہب میں درست نہیں ہے۔اس وجہ سے بھی عہدِ قدیم کے ہندوستانی دانشوروں نے سائنسی طریقہ یا تاریخی رجحان پیدا نہیں کیا۔ لیکن اس کے برعکس جیسا کہ پہلے بتایا جا گیا ہے کہ مسلمانوں میں شروع ہی سے تاریخی رجحان تھا اور انہوں نے تاریخ نویسی کو ارتقائی منزل تک پہنچانے میں انتہائی اہم اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں تاریخ نویسی کی روایات مسلمان اپنے ساتھ لائے جب تک مسلمانوں کا اس ملک سے تجارتی تعلق رہا فلسفہ، مذہب، طب، علم نجوم، علم فلکیات اور دیگر علوم وفنون سے دل چسپی رہی لیکن جب انہوں نے یہاں پر سیاسی اقتدار حاصل کر لیا تو اس میں نمایاں تبدیلی آئی اور ان کا رجحان تاریخ اور تاریخی علوم کی جانب بھی م کی طرف بھی بڑھا۔

محمد بن قاسم (712ء) کی فتح سندھ سے عربوں کی حکومت قائم ہوئی اور سندھ خلافت بنوامیہ کا ایک حصہ بن گیا سندھ کی فتوحات کی معلومات جو عربی مورخین کے یہاں ملتی ہیں محدود ہیں۔ سندھ کی تاریخ کے بارے میں پہلی کتاب فتح نامہ (چچ نامہ) ہے جسے علی کوفی نے ناصرالدین قباچہ (1206 تا 1228ء) کے زمانہ میں عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا اس کتاب میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ایسے قصے اور کہانیاں بھی موجود ہیں جو کہ ناقابل یقین ہیں جن کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہے اس نے چچ نامہ کو تاریخی ماخذ کے طور پر بہت کمزور کر دیا ہے۔

ہندوستان میں مسلم تاریخ نویسی کا دوسرا دور غزنویوں اور غوریوں کے ہندوستان پر حملے کے وقت سے شروع ہوا۔ ان کے درباری مورخوں نے ان حملوں اور ہندوستان میں ہونے والی جنگوں کے بارے میں لکھا۔اس دور میں بھی مورخین کا مرکز ''غزنہ'' ہی تھا جہاں بیٹھ کر وہ ہندوستان کے بارے میں لکھ رہے تھے۔ چونکہ وہ درباری مورخ تھے اس وجہ سے ان کا مرکز سلطان کی شخصیت تھی دوسرے انہوں نے ہندو طبقہ کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ یہاں ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس سے قبل ہندوستان میں تاریخ نویسی کا رجحان کیوں نہیں تھا؟ اس کے

لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہندوستان کا پڑھا لکھا دانشور طبقہ تاریخ نویسی میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ صرف اس کے لیے کلہن کی ''راج ترنگنی'' ہی ایک ایسی کتاب لکھی گئی جس میں کچھ تاریخی مواد ملتے ہیں راج ترنگنی ایک بیانیہ نظم ہے جس میں ابتدائی زمانہ سے بارہویں صدی عیسوی تک کے کشمیر کے حالات قلمبند ہیں۔

جہاں تک سماجی علوم کا تعلق ہے ہندوستانی لوگوں میں ہندوستان سے باہر جانے کا تصور نہیں تھا اور اعتقاد تھا کہ بیرونی ممالک کے سفر سے ان کے مذہبی اقدار مجروح ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان باہری دنیا سے تعلقات نہیں رکھتے تھے۔ انہیں باہری دنیا کی واقفیت نہیں ہوئی۔ نیز تاریخ نویسی سے بھی وہ بے بہرہ رہے۔ اس کے بالمقابل عربوں (مسلمانوں) میں علاقائی حد بندی یا مذہبی اجارہ داری نہیں تھی نیز ''اُطلبُوا العلمَ وَلوکانَ فِیِ الصِّیْنِ'' کے تحت انہوں نے دوسرے علوم وفنون حاصل کیے اور دوسروں کو اپنے علوم سے آشنا بھی کیا۔

الغرض قطب الدین ایبک کے دہلی میں اپنی سلطنت کے قیام کے بعد بھی اسلامی مرکز غور اور غزنہ رہا اس وجہ سے تاریخ نویسی کا مرکز مکمل طور پر ہندوستان میں قائم نہ رہا۔ اور مورخین ہندوستان کی تاریخ کو اسلامی تاریخ کے تسلسل میں لکھتے رہے۔ ان کی تاریخ نویسی کی روایات اسلامی ممالک کے مورخین کی تھی وہ تاریخ کی ابتداء تخلیق کائنات اور حضرت آدم سے شروع کرتے تھے۔ اس کے بعد اسلام کی ابتدائی تاریخ بیان کرتے تھے پھر مختلف علاقوں اور ملکوں میں مسلمانوں کی حکومتوں کا ذکر ہوتا تھا اس کے بعد ہندوستان کی فتح اور یہاں مسلم حکمراں خاندانوں کے قیام اور ان کے حالات ہوتے تھے اس کی سب سے عمدہ مثال منہاج سراج (1269ء) کی 'طبقات ناصری' ہے۔

ہندوستان میں مسلم سلاطین کے سیاسی اقتدار قائم ہونے کے ساتھ ہی یہاں دربار میں ایرانی روایات اور ادارے قائم ہوئے۔ انہیں میں درباری مورخوں کی تقرری کا بھی رواج تھا یہ تاریخ لکھنے والے صرف درباری مورخ ہی نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ شاہی عہدیدار اور علماء بھی ہوا کرتے تھے لیکن ان کا تعلق چونکہ حکمراں طبقہ سے ہوا کرتا تھا اس لیے تاریخ لکھنے کا مقصد حکمراں کی خوشنودی ہوا کرتا تھا۔

ان مورخین کے یہاں بھی اسلامی تاریخ نویسی کی تقلید نظر آتی ہے۔ اپنے عہد سے پہلے کی تاریخ لکھنے میں وہ صرف لکھے ہوئے ماخذوں کی بنیاد پر مَن و عَن لکھتے تھے نئے مواد کی تلاش و جستجو نہیں کرتے تھے ان کی تاریخ میں صرف اس حصہ کی اہمیت ہوتی تھی جو ان کے اپنے عہد کا کام ہوتا تھا۔ الغرض ان حقائق کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نویسی ابتدائی عربی میں شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ منگول حملہ کے بعد یہ فارسی میں لکھی جانے لگیں۔

پروفیسر اقتدار حسین کہتے ہیں کہ ''گیارہویں صدی سے فارسی تاریخ نویسی شروع ہوئی لیکن عربی تاریخ نویسی بھی جاری رہی۔'' ''مختلف مدارج طے کرتے ہوئے فارسی تاریخ نویسی اس مقام پر پہونچی کہ عہد وسطی کے سارے ماخذ کے لیے ہمیں اسی کی طرف رجوع کرنا پڑا ہے جس کے ارتقاء میں البیرونی مصنف ''کتاب الہند'' ابوالفضل بن الحسن بیہقی (تاریخ بیہقی یا مجلدات بیہقی)، فخر مدبر (شجرۃ الانساب) اور (آداب الحرب والشجاعۃ) حسن نظامی (تاج المعاصر) ضیاء الدین برنی (تاریخ فیروز شاہی)، شمس سراج عفیف (تاریخ فیروز شاہی، عصامی (

فتوح السلاطین) وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔ اور ان سب مورخین نے فارسی تاریخ نویسی میں زبردست کام کیا اور اسے بامِ عروج تک پہنچایا۔

1.4 دہلی سلطنت کے اہم مورخین اور ان کی تاریخی تصنیفات

(Important Historians of the Delhi Sultanate and Their Historical Works)

وہ عناصر جو عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کو قدیم ہندوستانی تاریخ سے الگ کرتے ہیں وہ تاریخی رجحانات ہیں جو عربوں اور ترکوں میں فروغ پایا۔ ان میں ایک اہم عنصر یہ ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان سے متعلق معاصر تاریخی ادب نسبتاً بکثرت پایا جاتا ہے۔ جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا، عرب سیاح انجیل کی بشارت اور تجارتی جوش سے متاثر ہو کر ہندوستان کے مختلف حصوں سے تاجروں کی حیثیت سے رابطے میں آئے۔ وہ مسافر اپنے سفر کی قیمتی اور دلچسپ تفصیلات اپنے ساتھ لے گئے۔ اگرچہ ان وضاحتوں کی نوعیت زیادہ جغرافیائی ہے لیکن تاریخی نقطہ نظر سے یہ آج بھی ہمارے لیے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

آٹھویں صدی میں عربوں نے سندھ کو فتح کیا تھا اور بعد میں ترکوں کی بڑھتی ہوئی سلطنت نے اس کا الحاق کر لیا تھا۔ اس لیے حقیقی معنوں ہمیں میں ہندوستانی تاریخ سے متعلق تاریخی ادب فتح سندھ کے بعد ہی ملتا ہے۔ اس دور سے ہمیں سندھ کے واقعات سے متعلق تاریخ ملنا شروع ہو جاتی ہے۔ فتح نامہ، جسے غلطی سے چچ نامہ کہا جاتا ہے، سندھ کی تاریخ کا ایک ایسا ہی اہم کارنامہ ہے۔ عربی مورخین کی تصانیف جیسے بلاذری (متوفی 892-93) کی مشہور تصنیف فتوح البلدان میں ہمیں سندھ کی فتح کی تفصیلات ملتی ہیں۔ تب سے ہندوستان کے بارے میں تاریخی کاموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

1.4.1 تاج المآثر: حسن نظامی (*Taj-ul Maasir* : Hasan Nizami)

دہلی سلطنت کے ابتدائی مورخین میں خواجہ حسن نظامی اور فخر مدبّر کے نام قابل ذکر ہے جس میں حسن نظامی کو اولیت حاصل ہے جنہوں نے اپنی کتاب کی تکمیل التمش کے آخری دور میں کی تھی۔ انہوں نے اپنی اس فارسی کتاب کی ابتداء 1205ء میں اپنے دہلی کے دوستوں کی درخواست پر کی تھی بلکہ اس شاہی حکم کو پورا کرنے کے لیے بھی کی تھی جس میں انہیں فاتح حکومت کے واقعات کو تفصیلات سے قلمبند کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس میں جزوی طور سے محمد غوری (1191ء) کی اور خاص طور سے قطب الدین ایبک اور التمش کے عہد کے کچھ تاریخی واقعات کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ مصنف نے جگہ جگہ تشبیہات اور اشارات کے ذریعہ نظم و نثر میں اپنے علم کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس بات کا تذکرہ کہیں نہیں کرتا کہ وہ فرمانرواؤں کے کارناموں میں کہیں شریک رہا ہو۔ اس کی تاریخ نویسی میں کسی بات سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ وہ ان واقعات کے زمانہ میں موجود تھا جنہیں وہ بیان کرتا ہے۔

جگدیش نرائن سرکار لکھتے ہیں کہ 'چند تاریخوں کے بارے میں جو گنجلک اور بے ربط ہیں باقی ساری تفصیلات غائب ہیں' وہ مزید لکھتے ہیں کہ 'حسن نظامی ایک قصیدہ خواں تھا اور دوسرے بہت سے مورخین کی طرح تعصبات کا شکار تھا۔' وہ ترائن کی پہلی جنگ میں محمد غوری کی

شکست کا ذکر نہیں کرتا ہے لیکن دوسری جنگ میں اس کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ حسن نظامی یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ابتدائی مسلم فاتح اچھے اور سچے مسلمان اور مذہب اسلام کے حامی تھے حکومت کے متعلق ان کا مقصد معاشی نہیں بلکہ مذہبی تھا۔

پروفیسر اے۔بی۔ایم حبیب اللہ لکھتے ہیں کہ ''اس نے قطب الدین ایبک کے فرمان کے مطابق 1192ء سے 1228ء تک کے اہم فوجی واقعات اور کارناموں کا ذکر کیا ہے پہلے حصہ میں 1217ء۔1192ء کے عسکری واقعات ہیں دوسرے حصہ میں 1228ئ۔1217ء تک کے حالات ہیں۔ان کی تاریخ نویسی میں عربی اور فارسی زبان کا امتزاج نظر آتا ہے ابتداء وہ عربی سے کرتے تھے اور اچانک مختلف واقعات کی تفصیل پیش کرتے وقت فارسی کا استعمال کرتے ہیں اور پھر عربی میں لکھنا شروع کردیتے ہیں۔اس کے باوجود ان کی کتاب عہدِ وسطیٰ کے تاریخی واقعات کو جاننے کا اہم اور مستند ذریعہ ہیں۔پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ''اگر حسن نظامی کی کتاب سے الفاظ کی مبالغہ آرائی کو نکال دیا جائے تو ان کی شخصیت ایک سچے واقعہ نگار کی طرح نکھر جائے گی۔''

ڈاکٹر آر کے سکسینہ لکھتے ہیں کہ ''کہیں کہیں ان کی معلومات منہاج سراج سے زیادہ معلومات فراہم کرتے ہیں''اس کتاب میں سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ سماجی واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔کنور محمد اشرف لکھتے ہیں کہ اگرچہ اس میں کچھ خامیاں ہیں تاہم اس کے باوجود یہ ایک سود مند حوالہ ہے۔جس میں جشنوں اور تیوہاروں کا ذکر کیا ہے۔نیز شہری انتظامیہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔''ان سب باتوں کے باوجود ابتدائی سلطنت کو جاننے کے لیے یہ ایک اہم ماخذ ہے اگرچہ اس میں کچھ حقائق کو توڑ مروڑ کر بیان کیا گیا ہے پھر بھی اس سے تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

1.4.2 آداب الحرب والشجاعۃ: فخر مدبر (*Adab al-Harb wal-shaja'a* : Fakhr-i-Mudabbir)

فخر الدین مبارک شاہ معروف بہ فخر مدبر نے ''آداب الحرب والشجاعۃ'' لکھی۔جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فوجی کارروائیوں پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔پروفیسر حبیب اللہ کا بھی یہی کہنا ہے۔کہ یہ جنگ سے متعلقہ امور پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔اقتدار حسین صدیقی کا کہنا ہے کہ ''اس کتاب میں ہم کو بہت ساری سماجی معلومات بھی ملتی ہیں مثلاً فخر مدبر کا کہنا ہے کہ قطب الدین ایبک نے فرمان جاری کیا تھا کہ جو شخص عشر دیتا ہے یا نیم عشر یا خراج دیتا ہے اس سے ٹیکس نہیں لیا جائے گا نیز جو افسران کسانوں سے زبردستی بکریاں اور مرغے لیتے تھے انہیں بھی منع کر دیا گیا تھا۔ اقتدار حسین لکھتے ہیں کہ ''آداب الحرب والشجاعۃ''''آداب الملوک و کفایت الملوک'' سے الگ نہیں جو کہ 1230ء میں لکھی گئی کیونکہ فخر مدبر کے کتاب میں اس کے پانچ ابواب کا ذکر ملتا ہے۔

1.4.3 طبقاتِ ناصری: منہاج السراج (*Tabkat-i-Nasiri* : Minhaj-us-Siraj)

منہاج الدین ابن سراج الدین جرجانی کی ولادت 1193ء میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شریف خاندان میں ہوئی۔وہ پیدائش اور شادی دونوں اعتبار سے امراء طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔اس کے آباواجداد بڑے ممتاز لوگ تھے اس کے والد محمد غوری کی کمان میں آنے والی فوج میں

قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔ منہاج خود ایک بڑا عالم تھا۔ اسے 1227ء میں اُچ کے فیروزی مدرسہ کا نگراں، 1232ء میں افسر قانون نیز مذہبی، اخلاقی اور قانونی امور کی تبلیغ کا ناظم بنایا گیا۔ 1241ء میں دہلی کا قاضی، 45-1244ء میں دہلی کے ناصریہ مدرسہ کا نگراں اور اس کی جائداد و املاک کا منتظم تھا۔ نیز ام البلاد کی مسجد میں مبلغ، 1246ء میں ناصر الدین کی تخت سلطنت کا قاضی اور دار السطنت کا حاکم فوجداری مقرر کیا گیا بنگال کے صدر مقام لکھنوتی میں تین سال تک رہا نیز جاج نگر میں بھی رہے جہاں مسلمانوں کے دور دراز علاقوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

ابتدائی مسلم مورخین نے تاریخی کتابیں تورات، انجیل اور قرآن کو بنیاد بنا کر حضرت آدمؑ سے شروع کی تھی تاکہ تاریخ ادھوری نہ رہ جائے۔ اسی طرح منہاج نے بھی اپنی طبقات ناصری کو حضرت آدم کی تاریخ سے شروع کیا تھا جیسا کہ ابتدائی مورخین نے تاریخ آزادانہ طور پر اپنے نام سے لکھا تھا۔ جسے طبری، ابن ھشام، ابن خلدون وغیرہ نے۔ لیکن جب خلافت کے بعد ملوکیت آئی تو لوگوں نے تاریخ کو سلاطین کی طرف منسوب کر کے لکھا اور اپنی کتابوں کے نام (title) سلاطین کے نام پر رکھے۔ منہاج نے بھی یہی کیا اور اپنی کتاب کو سلطان ناصر الدین کی طرف منسوب کرتے ہوئے ''طبقات ناصری'' نام رکھا۔

واضح رہے کہ شروع میں وحدانی (unitary) طرز میں پھر طبقاتی (sectioned) طرز پر اور اس کے بعد سانحاتی (episodic) طرز پر تاریخ لکھی جانے لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تاریخ نویسی میں بہت ساری سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ منہاج کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ہندوستان آتے ہوئے بھی کتابیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ برنی نے بلبن کے دور میں جن علماء کا ذکر کیا ہے ان میں منہاج بھی ہے۔ منہاج سراج نے اپنی کتاب کو 23 طبقوں میں تقسیم کیا ہے پہلے دو طبقوں میں آدم سے لے کر چاروں خلفاء کا ذکر ہے پندرہویں طبقہ میں اس نے وہ معلومات دی ہیں جو دوسرے مآخذ میں نہیں ہیں۔ اس میں اس نے غزنوی خاندان کی تاریخ لکھی ہے۔ شروع میں ایرانی بادشاہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بیسویں اور اکیسویں طبقہ میں ہندوستان کے معزی سلطانوں، خاص کر شمسی سلطانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس نے التتمش یا کسی بھی سلطان کی ان کی غلط پالیسیوں کے لیے نہ تو تنقید کی ہے اور نہ ہی انہیں کسی برائی کا خوگر ہی گردانا ہے۔ اس کے اگلے طبقہ میں منگولوں کے حملہ چنگیز خاں کا ذکر کیا ہے۔ منہاج نے وسط ایشیا سے آنے والے تاجروں کا بھی ذکر کیا ہے۔

اقتدار حسین صدیقی کہتے ہیں کہ چونکہ وہ اپنی کتاب ناصر الدین محمود کے زمانہ میں لکھ رہا ہے اس وجہ سے التتمش کے نقائص اور برائیاں نہیں لکھ رہا ہے کیونکہ اس وقت کے رواج کے مطابق سلطان سے عطیہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور سلطان اپنے پیروؤں کے خلاف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی مزید لکھتے ہیں کہ ''منہاج نے اپنی کتاب عقلیت پسندی (rational way) کی بنیاد پر لکھی ہے۔ اور اس نے تاریخ نویسی کو ایک نیا اور سائنٹفک رجحان دیا۔'' منہاج چونکہ ایک بڑا عالم تھا اور مختلف اونچے عہدوں پر فائز رہا تھا۔ چنانچہ اس کے تجربات نے اس کی کتاب پر جو کہ بہت فاضلانہ اور مداحانہ ہے بڑا اثر ڈالا ہے۔

1.4.4 تاریخ فیروز شاہی: ضیاالدین برنی (*Tarikh-i-Firoz Shahi* : Ziauddin Barani)

تاریخ فیروز شاہی مملوک بادشاہ غیاث الدین بلبن کے دور 1265ء سے فیروز شاہ تغلق کے چھٹے سال جلوس 1357ء تک سلاطین دہلی کی 95 سال کی نہایت اہم تاریخ ہے۔ اس کا مصنف ضیاء الدین، برن (بلند شہر، یوپی) کا رہنے والا تھا اور عہدِ بلبن کے اواخر میں 1285ء کے آس پاس پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک ذی حیثیت خاندان کا فرد تھا۔ اس کے والد معید الملک، چچا ملک علاء الملک اور دادا سپہ سالار حسام الدین اپنے دور کے سلاطین کے درباروں میں اہم عہدوں پر فائض تھے۔ ضیاء الدین برنی بھی سترہ سال تین مہینے سلطان محمد بن تغلق سے اس کے ندیم کی حیثیت سے وابستہ رہا۔ فیروز شاہ تغلق کے دورِ حکومت (1388ء۔1351ء) میں اس کے مخالفین کی ریشہ دوانیوں نے اسے دربار سے دور کر دیا۔ اس لیے وہ اپنی تاریخ بھی بادشاہ کو، جسے تاریخ سے دلچسپی تھی پیش نہ کر سکا۔ برنی کو سخت پریشانیوں اور مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ برنی خواجہ نظام الدین اولیاء کا مرید اور امیر خسرو دہلوی کا قریبی دوست تھا۔ عمر کے آخری حصے میں اس نے تاریخ فیروز شاہی کے علاوہ فتاویٰ جہانداری، نعمت محمدی وغیرہ تالیف کیں۔ تاریخ فیروز شاہی میں برنی نے صرف ان آٹھ سلاطین کی تاریخ لکھی ہے جن کے حالات منہاج سراج نے چھوڑ دیے تھے۔

1.4.5 خزائن الفتوح: امیر خسرو (*Khazain-ul Futuh* : Amir Khusrau)

امیر خسرو (1251 تا 1325ء) کا شمار طبقۂ امراء میں ہوتا تھا چونکہ ان کے والد التتمش کے عہد میں ایک امیر تھے۔ ان کی والدہ عماد الملک (جو بلبن کے عہد میں اعلیٰ عہدے پر تھے) کی بیٹی تھیں، جس کی وجہ سے امیر خسرو نے دہلی کے درباری حلقوں میں اہم مقام پا لیا تھا، انہوں نے دہلی کے تقریباً چھ سلاطین کے ماتحت ملازمت کی تھی جس کی وجہ سے انہیں اس دور کے صحیح حقائق اور سماجی تعلقات کا مشاہدہ کرنے کا موقع ہاتھ آگیا، اور اس موقع سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا، ان کی تاریخی کتابیں تقریباً 36 برسوں (1289ء تا 1325ء) کا احاطہ کرتی ہیں، ان کی کچھ کتابیں شہزادوں اور سلطانوں کی فرمائش پر لکھی گئیں، بعض انعام و اکرام یا ادبی شہرت کے لیے موقع بہ موقع حیطۂ تحریر میں آئیں اس لیے موصوف تاریخ نویسی میں کم اور مدح سرائی میں زیادہ نظر آتے ہیں، تاہم ان کی کچھ کتابیں تاریخی مواد بھی فراہم کرتی ہیں، شاعری میں قران السعدین (دوستاروں کا ملن 1289) کئی طویل بیانیہ نظموں پر مشتمل ہے جس میں وہ سوال و جواب شامل ہے جو باپ (بغرا خاں حاکم لکھنوتی) اور بیٹے (سلطان معز الدین کیقباد) کے درمیان ہوئے۔

خزائن الفتوح یا تاریخ علائی، اس کتاب میں امیر خسرو نے علاؤالدین کے ابتدائی سولہ برسوں کی معتبر اور مستند تاریخ نویسی کی ہے، جس میں ادبی مہارت، تشبیہات، استعارے، شاعرانہ شوخی، وسیاسی موقع پرستی اور ہر ہندوستانی چیز سے انسیت و محبت کا ذکر ملتا ہے، قرآنِ کریم کی آیات مثالوں کے لیے کثرت سے استعمال ہوئی ہیں، وہ علاؤالدین خلجی کی فوجی مہمات بیان کرتے وقت وہ کارنامے بھی بیان کرتے ہیں جن کا تعلق استحکام سلطنت، نظم و ضبط اور انصرام سلطنت سے ہوتا ہے جس کو عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے اٹھایا گیا ہو، لیکن امیر خسرو نے علاؤالدین خلجی کی اس دھوکہ بازی کو نہیں بیان کیا ہے جو اس نے حصولِ تخت کے لیے اپنے چچا سے غداری کی تھی، اور ان کو دھوکے سے قتل کر کے خود سلطان بن گیا تھا۔

1.4.6 تاریخ مبارک شاہی: یحییٰ بن احمد سرہندی

(*Tarikh-i-Mubarak Shahi* : Yahya bin Ahmad Sirhindi)

یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی (وفات 208ھ/1399ء) نے اِس کتاب کو تاریخ مبارک شاہی کے نام سے لکھا ہے کتاب کی ابتداء میں وہ لکھتا ہے کہ ابوالفتح مبارک شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر وہ تحفہ میں اس کتاب کو دینا چاہتا تھا۔ اس نے دہلی سلاطین کے واقعات منہاج سراج، برنی اور امیر خسرو سے جو اس کے پیشرو تھے جمع کر لیے ہیں، اور فیروز تغلق کے سالِ جلوس 1351ء سے 1425ء تک کے واقعات ثقہ روایات اور عینی مشاہدات کی بنا پر قلم بند کئے ہیں، اس نے امیروں سپاہیوں کے کام ادوارِ حکومت کے اعتبار سے سلسلہ وار تاریخ اور ترتیب یعنی تخت نشینی، تقرر، فوجی مہمات بغاوتوں کو علی الترتیب تحریر کیا ہے، اور لوگوں کی شہادتوں اور گواہیوں پر بھروسہ کیا ہے۔ اس کی کتاب در حقیقت ایک علاقائی روزنامچہ تھی۔ وہ تاریخ کو فوجی اور سیاسی واقعات کا مجموعہ بنا دیتا ہے اور وہ تاریخ نویسی کو داخلیت پر محمول کرتا ہے گویا سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوا، وہ ہر دور کی تاریخ اس جملے پر ختم کرتا ہے کہ اصل حقیقت خدا ہی جانتا ہے، محمد غوری کے زمانے سے ہندستان میں بدلتی ہوئی اسلامی تصویر کو تقدیر اور خدا کی مرضی پر منحصر کرتا ہے اور محمد بن تغلق کی دشواریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانی افعال اور فیصلوں سے منسوب کرتا ہے۔

1.4.7 تاریخ فیروز شاہی: شمس سراج عفیف (*Tarikh-i-Firoz Shahi* : Shams Siraj Afif)

شمس سراج عفیف (1342ء تا 1399ء) نے اپنی کتاب میں دلّی سلطنت کے تین فرمانرواؤں (غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق) کی خوبیوں، خامیوں اور تیمور کے ہاتھوں دلّی کی تباہی کا ذکر کیا ہے، وہ برنی، عصامی کی طرح شکستِ آرزو یا صلاحیت کی ناقدری کے احساس کا ذکر نہیں کرتا بلکہ اخلاقی قدروں کی پامالی پر آزردہ ہے اور اس کی اصلاح چاہتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ لوگ اس پر عمل کریں، اس نے واقعات کو اسناد کی مدد اور معتبر لوگوں کی گواہیوں کی بنیاد پر جانچا، پرکھا اور قابل قبول جانا، نزاعی اور مختلف فیہ معاملات پر فیصلہ کرنے کے لیے دلائل و ثبوت نہیں پیش کئے بلکہ تاریخی حقائق کی تصدیق کے لیے آخری معیار مذہب اور خدا کو مانا، وہ تاریخ میں غیر تاریخی حقائق کی مدد سے فہم و بصیرت تلاش کرتا ہے اور اس کی متلاشی (ڈھونڈتی) نگاہیں اس پوشیدہ نظام کی طرف جاتی ہیں جسے خدا نے تخلیق کیا ہے، برنی کی طرح وہ بھی تاریخ سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہے اور تاریخ کے فوائد کا بھی ذکر کرتا ہے۔ لیکن تاریخ فیروز شاہی کے پہلے ایڈیشن میں جو فیروز شاہ کے چار سال پر محیط ہے، محمد بن تغلق کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے۔

1.4.8 فتوح السلاطین: عصامی (*Futuh-us-Salatin* : Isami)

خواجہ عبدالملک عصامی (1311ء) دہلی میں پیدا ہوا، اس کے دادا عزالدین عصامی اسماعیل بلبن کے عہد میں سپہ سالار تھے، اس نے اپنے والد کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی کم عمر میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا ہوگا جب محمد بن تغلق نے 1327ء میں دہلی کے امراء کو اور صوفیا وغیرہ کے تقریباً بارہ سو خاندانوں کو دیوگیر جانے پر مجبور کیا تو عصامی بھی اپنے نوّے سالہ دادا کے

ساتھ روانہ ہوا، اس کے دادا تلپت ہی میں (دلّی کے قریب) فوت ہو گئے لیکن عصامی بعافیت دیوگیر پہنچ گیا اور آئندہ بائیس سال کے دوران وہ ایک غیر معمولی ادیب کی حیثیت سے تلخی وناکامی کی زندگی بسر کرتا رہا، اپنے معاصرین سے متنفر ہو کر وہ حجاز جانا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی مثنوی 49-1350ء میں مکمل کرنے کے تھوڑے دنوں بعد رختِ سفر باندھا اور مدینہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں پر وفات پائی۔

عصامی کی شہرت کا دار و مدار اس کی تصنیف مثنوی فتوح السلاطین پر ہے۔ جسے اس نے بہمنی خاندان کے بانی علاؤالدین حسن بہمن شاہ کی سرپرستی میں نظم کیا، یہ مثنوی تقریباً آٹھ ماہ کی مدّت میں مکمل ہوئی اس میں کل 11693 اشعار ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی مثنوی فتوح السلاطین، شاہ نامہ ثابت ہو اور وہ بہمنی سلطان کے لیے فردوسی بن جائے جس کے نام سے اس کو معنون کیا تا کہ اس کی سرپرستی حاصل رہے اور ایک دائمی شہرت حاصل ہو۔ اس نے محمد بن تغلق کو جو سخت وسست کہا اس کا بنیادی سبب اس کے اپنے مصائب تھے۔ حالانکہ وہ تغلق دور کا اکیلا مصنف ہے جو سلطان کے خوف و عنایات سے اوپر ہے۔

فتوح السلاطین (50-1349ء) ہندوستان میں غزنوی حکومت (997ء-1173ء) غوری حکومت (1173ء-1205ء) اور دہلی سلطنت کے زمانے تک مسلمانوں کے کارناموں کا ایک سرسری جائزہ ہے جو طویل رزمیہ نظم کی صورت میں ہے، تاریخی نقطۂ نظر سے اس کی قدر و منزلت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس میں حقائق بیان ہوئے ہیں اور شاعرانہ مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا گیا ہے، نظام الدین احمد نے طبقاتِ اکبری میں اور بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کی تصنیف کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ عصامی حسن نظامی کا مرہونِ منت ہے، جس کا وہ اعتراف کرتا ہے جس کی اس نے پیروی کی لیکن وہ اس بلندی کو نہ پا سکا جس کو نظامی نے حاصل کیا کیونکہ وہ تاریخی کتاب نہیں لکھنا چاہتا تھا بلکہ رزمیہ نظم کہنا چاہتا تھا۔

دلّی سلطنت کے مورخین پر فارسی روایات کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ عرب تاریخ نویسوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات، سماجی واقعات، معاشی تبدیلیوں کو تاریخ میں جگہ دی جب کہ فارسی تاریخ نویسوں کی تاریخ نگاری زیادہ تر دربار سے متعلق ہوتی، یا وہ شاہی سرپرستی کے طلب گار ہوتے، انہیں افراد کے ارد گرد یہ تاریخی کتابیں گھومتی نظر آتی ہیں، امیر خسرو، عصامی، برنی، عفیف، یحییٰ سرہندی کی تاریخ نویسی امراء و سلاطین، شہزادوں اور حکمرانوں کی تاریخ تھی، عوام کی تاریخ، ان کے رہن سہن، سماجی و معاشی حالات کا ذکر نہیں ملتا۔ ان مورخین نے تاریخ کو مذہب کا مقصد حاصل کرنے اور عظمتِ اسلام کے تفوق و برتری کے لیے استعمال کیا ہے۔ بقول برنی تاریخ انبیاء، خلفاء، سلاطین و امراء، حکومت اور مذہب کے دوسرے بڑے لوگوں کے واقعات اور روایات کا علم ہے اگر وہ کمتر یا نااہل لوگوں کے کام بیان کرنے لگے تو اس کی اہمیت وافادیت ختم ہو جاتی ہے، ایسے اشخاص کو عام طور پر علم کا ذوق نہیں ہوتا اور اس کے مطالعے سے انہیں کوئی فائدہ پہونچنے والا نہیں ہے۔ خدا کے حکم سے ہونے والی تاریخ انسانی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس میں صرف انسان معمولی کارکنوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

1.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ قدیم ہندوستان میں چند مذہبی بندشوں کی وجہ سے تاریخی رجحان کا فقدان رہا ہے۔ابتدائی مذہبی رزمیہ داستانوں میں کچھ واقعات کا پتہ چلتا ہے لیکن ان پر مذہبی رنگ زیادہ غالب ہے۔ کلھن کی تصنیف کردہ راج ترنگنی کو جو کشمیر کے تاریخی وقعات پر مبنی ہے ہندوستان کی پہلی باقاعدہ تاریخ تصور کیا جاتا ہے۔ کلھن کی راج ترنگنی کشمیر کی تاریخی واقعات پر مبنی علاقائی تاریخ کا بہترین شاہکار ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان میں تاریخ نویسی کا باقاعدہ آغاز مسلمانوں خاص کر ترکوں کی آمد کے بعد شروع ہوا تو غالباً بے جا نہیں ہوگا۔اس اکائی میں عہدِ سلطنت کے اہم مورخین اوران کی تاریخ نویسی کا احاطہ کیا گیا عہدِ وسطیٰ کی تاریخ نویسی میں البیرونی کی مشہور زمانہ تصنیف "کتاب الہند" کو اولیت حاصل ہے۔ جس میں انہوں نے ہندوستانی علوم وفنون، سائنس، طب، مذہب اور ہندوستانی سماج و معاشرت پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ابوریحان البیرونی ایک بہت ہی باشعور مصنف تھا۔کتاب الہند کی تصنیف ان کا بڑا تاریخی کام ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی تحریر کردہ تاج الماٰثر عہدِ وسطیٰ کے تاریخی واقعات کو جاننے کا اہم اور مستند ذریعہ ہے۔ فخر مدبر کی 'آداب الحربِ والشجاعہ' فوجی کارروائیوں پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔اس میں دہلی سلاطین کی فوجی مہموں اور کاروئیوں کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں منہاج السراج جرجانی کی طبقاتِ ناصری، ضیاءالدین برنی تاریخ فیروز شاہی اور شمس سراج عفیف کی ''تاریخ فیروز شاہی'' نمایاں ہیں۔منہاج السراج نے دہلی سلطنت کے قیام،استحکام اور عروج وزوال کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ ہندوستان میں ترکوں کی ابتدائی فتوحات کا واحد بیان ہے منہاج کی کتاب میں سب سے پہلے دہلی سلطنت کا ایک تاریخی، درجہ بندی کا بیان پیش کیا گیا تھا۔ ضیا الدین برنی نے دہلی سلطنت کی تاریخ کا آغاز وہیں سے کیا جہاں سے منہاج نے اپنی تاریخ ختم کی تھی۔ عفیف کا دعویٰ ہے کہ اس نے برنی کے کام کو آگے بڑھایا اور سے فیروز شاہ تغلق کے عہد پر ختم کیا ہے۔ یہاں امیر خسرو کے کاموں کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔اگرچہ وہ صحیح معنوں میں مورخ نہیں تھے، لیکن انہوں نے تاریخی حوالوں پر مبنی مثنوی لکھی اوران کے تمام کام سماجی تاریخ پر گہری روشنی ڈالتے ہیں۔

1.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

راوی : تدوینِ احادیث کی اصطلاح میں کسی حدیث کو بیان کرنے والا۔

نسّاب : عرب کے وہ ماہر افراد جو افراد اوران کے خاندانوں کے نسب نامے تیار کرنے کے ماہر ہوتے تھے۔

اسناد : سند کی جمع ہے۔اصولِ حدیث کی اصطلاح می اُس سلسلہ رجال کو کہاجاتا ہے جو **حدیث** کے متن تک پہنچادے۔

طبقات : حصے، درجے اور ابواب، کسی کتاب کو کوئی ایک حصہ

خلافت : لغوی معنی نیابت۔کسی بادشاہ یا رسول کا نائب، تاریخ میں وہ طرز حکومت جو اسلامی اصولوں کے مطابق تصور کی جائے۔

ملوکیت : بادشاہت، شاہی مطلق العنان طرزِ حکومت

علومِ عقلیہ : وہ علوم جو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

اجارہ داری: تجارت معیشت، یا حکومت کی اصطلاح میں کوئی مخصوص فرد، طبقہ یا ادارہ زبردست طاقت و قدرت حاصل کرلے۔

عشر : کسی بھی زرعی پیداوار کا دسواں حصہ

خراج : ٹیکس

قطب نما : سمت جاننے کا مقناطیسی آلہ

ام البلاد : راجدھانی

1.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. تاریخ کا مادہ کیا ہے؟
2. ایام العرب کن کی داستان ہے؟
3. پہلا عرب سیرت نگار کون ہے؟
4. بلاذری کی کتاب کا نام کیا ہے؟
5. تاریخِ جہاں کا مصنف کون ہے؟
6. جوامع التاریخ کس کی تصنیف ہے؟
7. راج ترنگنی ایک ــــــــ نظم ہے؟
8. ہندوستانی تاریخ سے متعلق بیرونی کی مشہور کتاب کا کیا نام ہے؟
9. تاریخ فیروز شاہی کو برنی نے کس بادشاہ کے نام معنون کیا ہے؟
10. فتوح السلاطین کا مصنف کون ہے؟

1.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مسلمانوں میں تاریخی رجحان کیسے فروغ پایا؟ وضاحت کریں؟
2. تاج المآثر کی تاریخی اہمیت بیان کیجیے۔
3. آداب الحرب والشجاعۃ کس طرز کی تصنیف ہے؟ بیان کیجیے۔
4. منہاج السراج کی تصنیف طبقاتِ ناصری کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
5. ضیاءالدین برنی کی تصنیف تاریخ فیروز شاہی کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

1.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. برِصغیر ہند میں تاریخ نویسی کا رجحان کب اور کیسے فروغ پایا؟ وضاحت کیجیے۔
2. ہندوستان میں فارسی تاریخ نویسی کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے۔
3. عہدِ سلطنت کے مورخین اور ان کی تصنیفات کا اختصار سے جائزہ لیجیے۔

1.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. تاریخ نویسی قدیم اور جدید رجحانات، سید جمال الدین۔
2. امتیاز محمد خاں: سر گزشت تاریخ، اردو اکیڈمی، کراچی، 1969۔
3. غلام قادر لون: عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کے سائنسی کارنامے، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، طبع اول، 1999۔
4. ڈاکٹر خرم قادر: تاریخ نویسی۔ نظریات وارتقا۔
5. محمود الحسن: عربوں میں تاریخ نویسی آغاز وارتقا، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1975۔
6. ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ کے نظریات، فکشن ہاؤس، لاہور 1988۔
7. ہندوستان کا شاندار ماضی، اے۔ ایل۔ باشم/ مترجم ایس غلام سمنانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
8. قدیم ہندوستان کی تہذیب وثقافت تاریخی پس منظر میں، ڈی۔ ڈی۔ کوشامبی/ مترجم بال مکند ملسیانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
9. تاریخ تمدن ہند، محمد مجیب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
10. جنوبی ہند کی تاریخ، کے۔ اے۔ نیلکنٹھ شاستری/ مترجم آر۔ کے۔ بھٹناگر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
11. قدیم ہندوستان۔ ایک تعارفی خاکہ، جھا، ڈی۔ این، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

اکائی 2۔ مغل سلطنت کے ماخذ

(Sources of the Mughal Empire)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید
2.1 مقاصد
2.2 مغل عہد میں تاریخ نویسی کا ارتقاء
2.3 مغل عہد کی اہم تاریخی تصنیفات
2.3.1 بابر اور ہمایوں کے عہد میں
2.3.2 اکبر کے عہد میں
2.3.3 جہانگیر کے عہد میں
2.3.4 شاہجہاں کے عہد میں
2.3.5 اورنگ زیب کے عہد میں
2.4 اکتسابی نتائج
2.5 کلیدی الفاظ
2.6 نمونہ امتحانی سوالات
2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
2.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

2.0 تمہید (Introduction)

تاریخ نویسی کا باقاعدہ آغاز ہندوستان میں ترک مسلم حکمرانوں کی آمد کے بعد شروع ہوتا ہے۔اس سے پہلے بھی عرب مسلمانوں میں تاریخی شعور موجود تھا، مگر وہ علم الانساب، ایام الحرب اور مختلف قبائل کے کارناموں کے بارے میں منظوم بیانات تک ہی محدود تھا۔ان کی حیثیت اساطیری روایات سے زیادہ نہیں تھی لیکن یہ مواد بھی اپنی جگہ پر قابل قدر تسلیم کیے گئے ہیں۔ان کے ذریعہ کسی قوم کے مزاج، معیار فکر، رجحان اور رہن سہن پر روشنی پڑتی ہے۔اس بات پر سارے مورخین متفق ہیں کہ مسلم تاریخ نویسی کی ابتدا سیر ومغازی سے ہوتی ہے۔ اسلامی ریاستوں کی توسیع اور استحکام کے ساتھ ان میں تاریخ نویسی کا رجحان بھی وسیع ہوتا گیا۔ مسلم حکمرانوں نے تاریخ اور تاریخ نویسی کو بہت عزت دی اس کے لیے نہ صرف مالی مدد دی بلکہ کھلے عام اس کی سرپرستی بھی کی۔تاریخ کو اتنی اہمیت دینے کی بنیادی وجہ ذاتی عزت و وقار تھی لیکن اس میں سیاسی، سماجی معاشی، تہذیبی، ثقافتی اور حکمرانی کے عوامل بھی بڑی حد تک کارفرما تھے۔تاریخ کے ذریعہ پیغمبرِ اسلام، خلفائے راشدین، اولیائے کرام، صوفیائے عظام، مذہبی رہنماؤں، سلاطین، بادشاہوں، حکمرانوں امرا اور فوجی نمائندوں کی زندگی اور ان کے ادوار سے متعلق معلومات حاصل کی گئیں۔ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں اس تاریخ کی اہمیت اور اس کے سائنسی افادیت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔پچھلی اکائی میں آپ نے عہد سلطنت کے مورخین اور ان کی تاریخ نویسی کے بارے میں معلومات حاصل کی۔اس اکائی میں مغل عہد کی تاریخ نویسی پر گفتگو کی جائے گی۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں مغل تاریخ نویسی کے آغاز وارتقا کو سمجھ سکیں گے۔
- مغل عہد میں لکھی گئی سوانح عمریوں پر گفتگو کر سکیں گے۔
- تزک بابری (بابر نامہ) کی تاریخی اہمیت کا جائزہ لے سکیں گے۔
- تزکِ جہانگیری اور ہمایوں نامہ کی افادیت پر بحث کر سکیں گے۔
- مغل عہد کے تاریخی ماخذوں کے بارے میں جان سکیں گے۔

2.2 مغل عہد میں تاریخ نویسی کا ارتقاء

(Development of Historiography during the Mughal Period)

سابقہ اکائی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ عہد سلطنت میں تاریخ نویسی کے میدان میں کافی ترقی ہوئی تھی۔ لیکن اسے جتنا فروغ مغل عہد میں ملا اس سے قبل کبھی نہیں حاصل ہو۔سولہویں صدی اور بعد کے ادوار میں تاریخ نویسی کے میدان میں بڑا تنوع نظر آتا ہے اس تنوع کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں۔

اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اکثر مغل بادشاہ بذاتِ خود تاریخ نگاری میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور ان کا تاریخی شعور بہت عمدہ اور قابلِ ستائش تھا۔ تزک بابری، تزک جہانگیری اور ہمایوں نامہ جیسی شاہکار بہترین سوانح عمریاں مغل حکمرانوں اور ان کے خاندان کے علمی کمالات کا واضح ثبوت ہیں۔

دوسرے یہ کہ مغل بادشاہوں نے اپنی تاریخ لکھنے کے لیے اس دور کے مشہور دانشوروں اور قلمکاروں کی خدمات حاصل کیں۔ ان مورخین کو تمام سرکاری کاغذات اور اہم دستاویزات تک رسائی بہم پہنچائی اور تاریخ نویسی کے لیے تمام ضروری مواد اور ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں۔ چنانچہ آج ہم ان مورخین اور دانشوروں کی فراہم کردہ معلومات کی صداقت پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ یہ تاریخی اپنے عہد کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ ایسی تمام تصنیفات کو "سرکاری یا حکومتی تاریخ" کہا جاتا ہے۔ اس طرز کی سرکاری یا حکومتی تاریخ نویسی کی بڑی کمی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے حاکم اور حکومت کی جانب دار ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ ان مورخین کے مضامین اکثر و بیشتر دربار میں بادشاہوں اور حکمرانوں کے سامنے پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ چونکہ اس طرز کے تمام دانشور اپنے اپنے حکمرانوں کے وظیفہ خوار یا ملازم ہوتے تھے اس لیے اس عہد کے مورخین کے لیے ان کے خلاف کچھ لکھنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ اکبر نامہ، بادشاہ نامہ، عالمگیر نامہ مغل درباری تاریخ نویسی کی عمدہ مثالیں ہیں۔

تیسرے یہ کہ اس عہد کے سماج میں دیگر تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگوں نے بھی تاریخ نویسی کے میدان میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ تاریخ میں عوام کی بڑھتی ہوئی دلچسپی نے مغل عہد کی تاریخ نویسی کی ترقی کی ایک اہم وجہ بنی۔ ان غیر سرکاری مورخین نے مغل تاریخ نویسی کے فروغ اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو شاہی دربار سے ہٹ کر تاریخ لکھ رہے تھے۔ نہ اسے بادشاہ کے انعام کا لالچ تھا اور نہ سزا کا خوف۔ اس لیے وہ حکومت پر کھل کر تنقید کر سکتے تھے۔ یہ تنقید سرکاری مورخ کی غیر ضروری نرمی کو ظاہر کرتی ہے، لیکن اس کی تنقید پر مکمل اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ذاتی جذبات اور ذات پات کے اختلافات سے بھری ہوئی ہے۔ عبدالقادر بدایونی اور ابوالفضل کے درمیان اختلافات ان کی نسلی دشمنی کو پوری طرح بے نقاب کرتے ہیں۔ غیر سرکاری مورخین میں ناقدین کے علاوہ ایسے مورخ بھی تھے جن کا کام صرف تنقید نہیں بلکہ تاریخ کی خدمت کرنا تھا۔ نظام الدین احمد کی مشہور تصنیف طبقات اکبری کو اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

مغل عہد میں لکھے گئے تذکرے بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سے قبل جتنے بھی تذکرے لکھے گئے تھے وہ محض صوفیاء اور درویشوں کے حالات زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ لیکن مغل عہد میں تذکرہ نویسی کی ایک ایسی روایت کا فروغ ہوا جس میں اس عہد کے امراء کے حالات کے ساتھ اس دور کے معاشی اور سیاسی استحکام کا بھی احاطہ کیا گیا۔ شاہنواز خان کی معاصر الامراء اس سلسلہ کی ایک اہم تصنیف ہے۔

مغل عہد میں تحریروں کو محفوظ کرنے کے طریقے میں بھی کافی بہتری آئی جس کی وجہ سے تاریخی نوادرات کو محفوظ کرنے اور انہیں آنے والی نسلوں تک ان کی رسائی کو بہتر انداز میں ممکن بنایا۔ مغل عہد میں کاغذ سازی کا معیار کافی بلند ہوا ساتھ ہی جلد سازی کا طریقہ بھی بہتر ہوا۔ جو تحریری ریکارڈوں کو محفوظ رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ مغل دور کے اہم مآخذ و مصادر زیادہ تعداد میں ان کے بعد

آنے والے لوگوں تک پہنچے اور انہوں نے اس سے بھر پور استفادہ کیا۔

کچھ دانشوروں کا ماننا ہے کہ مغل عہد کی تاریخ نویسی سابقہ روایات پر ہی مبنی تھی اور اس دور کے اکثر مورخین نے تاریخ لکھنے کے فن میں کوئی منفرد ملکہ پیدا نہیں کیا۔ لیکن تاریخی حقائق اس کے برعکس ہیں۔ آج بہت سے مورخین اس بات کے قائل ہیں کہ مغل عہد کے مورخین نے تاریخ نویسی کا جو انداز اختیار وہ قدیم عہد کے دانشوروں سے مختلف ہے۔ عہد سلطنت کے مورخین ایک ہی عنوان کے تحت کئی واقعات کو ایک جگہ بیان کر دیتے تھے اور اکثر واقعات کی تاریخ نہیں دیتے تھے۔ عہد سلطنت کے نامور مورخ ضیاءالدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں نہج اختیار کیا ہے۔ لیکن مغلیہ دور کے واقعہ نگاروں نے اپنی تاریخ نویسی میں تاریخ کو ترتیب وار پیش کیا ہے۔ اکبر نامہ، بادشاہ نامہ، عالمگیر نامہ وغیرہ۔ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس طرح ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغل عہد تاریخ نویسی کے فروغ وارتقاء کا دور تھا۔ اس عہد میں انتہائی اہم تاریخی کتابیں تحریر کی گئیں۔

2.3 مغل عہد کی اہم تاریخی تصنیفات (Important Historical Works of the Mughal Period)

2.3.1 بابر اور ہمایوں کے عہد میں (During the Period of Babur and Humayun)

بابر نامہ: بابر (*Babur Nama* : Babur)

ظہیر الدین محمد بابر کو ہندوستان میں مغل بادشاہت کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ بابر نے خود نے اپنی خود نوشت سوانحِ عمری میں اپنی زندگی سے متعلق انتہائی دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ بابر کی اس سوانح عمری کا نام تزک بابری ہے۔ جو تاریخ میں بابر نامہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی گئی تھی۔ شیخ جیت الدین خواجہ نے جو بابر کے صدر صدر رتھے، اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ لیکن صرف خانوا تک لڑنے کی شرائط ہیں۔ اس کا دوبارہ ترجمہ 1589-90 میں 1583 میں اکبر کے حکم پر خانِ خان نے کیا۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ 1826 میں ہوا۔ مسز اے ایس بیورج نے اس کا دوسرا ترجمہ 1905 میں کیا جو دو حصوں میں ہے۔ بابر نامہ میں جون 1504 سے 1529 تک کے حالات موجود ہیں، یعنی اس کی موت سے ایک سال پہلے۔ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ بابر کے فرغانہ کے تخت پر بیٹھنے سے شروع ہوتا ہے اور اس وقت ختم ہوتا ہے جب وہ آخری بار سمرقند سے نکلتا ہے۔ دوسرا حصہ اس کے فرار سے شروع ہوتا ہے اور ہندوستان پر آخری حملے پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا حصہ ہندوستان کے حالات سے متعلق ہے۔

بابر نے ہندوستا ن کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سیاسی صورتحال، زمین کی تزئین، آب وہوا، فصلوں، پھولوں اور سبزیوں، بستیوں اور پیداوار وغیرہ کو یہاں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک غیر ملکی ہونے کے ناطے بابر نے اپنی ڈائری میں ان تمام چیزوں کو جگہ دی ہے جو اس کے لیے نئی تھیں لیکن ای ک ہندوستانی کے لیے عام تھیں اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان ایک عجیب ملک ہے اور ہمارے علاقوں کے پیش نظر ایک نئی دنیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ''یہاں خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ ایک بڑا ملک ہے اور یہاں سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں''۔ بابر نے اپنے بیان میں بہت ایمانداری سے کام کیا ہے۔ اپنی غلطیوں کو کھولیں لکھا ہوا لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کے لوگوں

کے ساتھ اس نے انصاف کیا ہے۔ کام نہیں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان میں کشش بہت کم ہے۔ یہاں کے لوگ خوبصورت نہیں ہیں. وہ سماجی رویے سے ناواقف ہیں۔ حکمت اور منظر نگاری یہاں نایاب ہے۔ فن اور دستکاری بھی پسماندہ ہے۔ بابر کی یہ رائے سماج کے پسماندہ طبقے کے بارے میں ہے ۔اسے پورے ہندوستانی معاشرے پر لاگو کرنا بابر کی غلطی تھی۔ ویسے بابر کے تمام الزامات کی تردید امیر خسرو کی تخلیقات سے ہوتی ہے جو ہندوستان اور ہندوستانی کی تعریفوں سے بھری پڑی ہیں۔ بابر نامہ نہ صرف بابر کے دور کی معلومات کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ ہمایوں کے ابتدائی دور کے لیے بھی بنیادی اہمیت کا ذریعہ ہے۔ اس میں ان کی پیدائش سے لے کر ہندوستان کی فتح تک کے حالات بتائے گئے ہیں۔ ہمایوں کی اچھائیوں، برائیوں اور اس کی ذاتی کمزوریوں کو جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ ان خوبیوں کے باوجود بابر نامہ میں کچھ خامیاں ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان م یں سیاسی حالات کی تفصیلات بتاتے ہوئے بابر نے خان دیش، اڑیسہ، سنگھ اور کشمیر کی حالت چھوڑ دی ہے۔ پرتگالیوں اور ان کی بستیوں کو بھی نظر انداز کیا گیا ہے۔ بابر نامہ کی دوسری خامی درمیان میں وقت کا وقفہ ہے۔ ان میں سے کچھ بڑے خلاء یہ ہیں: 1503۔1504، 15 08۔1519، 1520۔15251 اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہمیں مرزا حیدر دولت کی تاریخ رشیدی، گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ اور احمد یادگار کی تاریخ شاہی کا سہارا لینا پڑے گا۔ بیورج کی رائے ہے کہ بابر نامہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بابر کی یہ ڈائری کئی بار حادثات کا شکار رہی۔ اس کے باوجود بابر نامہ کو مغل دور کے اولین درجے کے مآخذ میں شمار کیا جاتا ہے۔

حبیب السیر: خواند میر (*Habib-al-Siyar* : Khwand Mir)

حبیب السیر غیاث الدین خواند میر کی فارسی زبان میں تحریر کردہ تاریخ کی ایک اہم کتاب ہے اور یہ اس دور کا ایک اہم ماخذ ہے۔ یہ کتاب محمد حسین کی خواہش پر شروع کی گئی۔ وہ دنیا کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کتاب شروع ہونے کے چند دن بعد ان کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد پیدا ہونے والی پریشانیوں نے ہمارے مصنف کو کام بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ملاقات اردبیل کے رہنے والے کرام الدین حبیب اللہ سے ہوئی۔ ان کے جوش وجذبے اور سرپرستی میں یہ کتاب مکمل ہوئی اور ان کے بعد اسے حبیب السیر کہا گیا۔ ممکن ہے کہ خواند میر، صاحب روضۃ الصفا سے متاثر ہو۔

اس کتاب میں ایک مقدمہ، تین بند (جلد) اور ایک اختتام ہے۔ ابتدائیہ میں زمین و آسمان کی تخلیق اور دنیا میں بسنے والوں کا ذکر ہے۔ پہلے 'بند' میں وہ انبیاء، فلسفی اور حکمراں ہیں جو اسلام کے قیام سے پہلے موجود تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ چار پاک خلفاء کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے 'بند' میں 12 ائمہ، اموی اور عباسی خلفاء، اور وہ بادشاہ ہیں جو عباسیوں کے ہم عصر تھے، جیسے غزنوی، غوری، سلجوق وغیرہ۔ تیسرا 'بند' بہت سے دوسرے قبیلوں کا ذکر کرتا ہے، جیسے چنگیز خان، اس کا جانشین، تیمور اور اس کے جانشین وغیرہ۔ 'اختتام' میں دنیا کے عجائبات، حکیموں، علماء، اولیاء اور شاعروں وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بابر کے دور کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ مصنف دنیا کی تاریخ لکھ رہا تھا اور وسطی ایشیا کے حالات سے بخوبی واقف تھا۔ شمالی ہندوستان کی فتح سے پہلے بابر کی حالت کا بیان ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ اس کتاب کا ابھی تک مکمل ترجمہ نہیں ہوا ہے۔

تاریخِ رشیدی: حیدر دوغلت (*Tarikh-i-Rashidi* : Haidar Doghalat)

تاریخِ رشیدی: مرزا حیدر دوغلت کا یہ کام وسطی ایشیا کے مغلوں اور ترکوں کی تاریخ جاننے کے لیے بہت ضروری ہے۔ مصنف بابر کے چچازاد بھائی تھے۔اس کے والد محمد حسین مرزا نے بابر کے خلاف بغاوت کی لیکن بابر نے اسے معاف کر دیا۔ بعد میں شیبانی خان کے حکم پر حسین مرزا (ہجری نمبر 1508 کو) ہرات میں قتل کر دیا گیا۔ بابر نے مرزا حیدر کی بڑی محبت سے پرورش کی۔ اپنی ذاتی قابلیت اور ذہانت سے مرزا نے ترقی کی اور اس کا نام کامیاب سپاہیوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ بابر کی موت کے بعد اس نے ہمایوں کی نوکری قبول کر لی۔ 1540 میں اس نے کشمیر پر قبضہ کر لیا اور ہمایوں کے نمائندے کے طور پر حکومت کرنے لگا۔ اسے 1551 میں قتل کر دیا گیا۔ مرزا نے بہت کچھ دیکھا اور سمجھا تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ کتاب کاشغر کے عبدالرشید خان بن ابوالفتح سلطان سعید کو وقف کی گئی تھی۔ اس کے دو حصے مغلستان اور کاشغر کے مغل خانوں کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔

تاریخِ رشیدی وسطی ایشیا کی سیاست پر گہری روشنی ڈالتے ہیں۔ مرزا نے بابر اور اس کے اسلاف کی زندگی سے متعلق واقعات کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے بابر کی تعریف کی ہے اور ان سے اظہار تشکر کیا ہے۔ انہوں نے ہمایوں کے دور کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خاص طور پر قنوج کی جنگ۔ جیسا کہ مرزا نے پیش کیا، ویسے دوسرے ہم عصر ادیبوں نے نہیں کیا۔ وہ خود شاہی فوج کے ایک دستے کا کمانڈر تھا، وہ ہمایوں کی عادات اور کردار کے بارے میں جو کچھ بھی لکھتا ہے وہ زیادہ اہم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ہمایوں کو بہت قریب سے جانتا تھا۔ ساتھ ہی ان کے ساتھ کچھ دن کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ وہ ہمیشہ بحران کے وقت ہمایوں کے وفادار رہے۔ سر ایلیٹ نے درست لکھا ہے کہ وہ اپنی خوشحالی کے دنوں میں بھی اپنے بدقسمت عزیز ہمایوں کو نہیں بھولے اور ہمیشہ انہیں کشمیر آنے پر مجبور کرتے رہے اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو واپس لینے کی کوشش کرتے رہے۔ اگرچہ انہوں نے دیگر ادیبوں کی طرح مرزا کامران پر تنقید کی ہے لیکن شہزادوں کے بارے میں کچھ خاص باتیں کہی ہیں۔ وہ قنوج کی لڑائی کے آغاز میں کامران کو موردالزام ٹھہراتا ہے۔ ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں کہ پنجاب اور قندھار میں کچھ باغی قوتوں کے بڑھنے کی وجہ سے کامران کو فوراً آگرہ چھوڑنا پڑا۔ اگرچہ قنوج کی جنگ میں وہ خود ہمایوں کا ساتھ نہ دے سکے لیکن اس نے عبداللہ مغل کے ساتھ ہمایوں کی مدد کے لیے پانچ ہزار سوار بھیجے۔ اس طرح مرزا کامران کے "غدار" پر نئی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرزا کے بیانات دلچسپ ہیں۔ وہ واقعات کو بہت کم جملوں میں بہت کھل کر بیان کرتا ہے

قانونِ ہمایوں ی: خواند میر (*Qanun-i-Humayuni* : Khwand Mir)

قانون ہمایوں ی خواند میر کا آخری کام ہے جیسا کہ اس کے بیان سے ظاہر ہے۔ اس کی ملاقات گوالیار میں ہمایوں سے ہوئی۔ اس نے یہ کتاب مارچ 1533 میں لکھی۔ مئی 1534 میں مکمل ہوئی۔ مقدمہ سمیت اس کتاب میں 9 ابواب ہیں۔ کتاب کا اختتام ایک طویل نظم پر ہوتا ہے جس میں مصنف نے اپنی ترقی کے لیے دعا کی ہے۔ یہ ہمایوں کے دور کی ایک ہم عصر تحریر ہے جسے خواند میر نے ہی تصنیف کیا تھا۔ خواند میر کے بیان کردہ واقعات اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے تھے۔ چنانچہ اسے تمام سرگرمیوں کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وجہ سے ان کا بیان قابل اعتبار ہے، اس میں عدالت کے بہت سے اصول، قوانین اور رسم و رواج کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہمایوں کے اصول، حکمرانی سے متعلق

اس کا تجربہ اور نئی عدالتی رسومات جو ہمارے مصنف نے خود دیکھا تھا، تفصیل سے بیان کیا۔ اس وقت کے قوانین اس دور کی سماجی صورت حال کو پوری طرح بے نقاب کرتے ہیں۔ خواند میر کے بیان میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو ایک حکومتی مورخ کی تخلیق میں ہونی چاہئیں۔ اس نے ہمایوں کی زبردست چاپلوسی کی ہے۔ ہمایوں کو سکندر وقت کہا ہے۔ بہر حال ہمایوں کے دور حکومت کی معلومات کے لیے خوندمیر کی یہ کتاب بہت اہم ہے۔

2.3.2 اکبر کے عہد میں (During the Period of Akbar)

ہمایوں نامہ: گلبدن بیگم (*Humayun Nama* : Gulbadan Begum)

گلبدن بیگم بابر کی بیٹی تھیں۔ وہ 1523 کے لگ بھگ پیدا ہوئیں۔ جب بابر کابل میں تھا تو اس نے اپنے والد کا دور دیکھا تھا۔ بابر کی وفات کے وقت بیگم کی عمر آٹھ سال تھی۔ ہمایوں نے اسے پیار سے رکھا جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے۔ قنوج کی شکست کے بعد وہ کابل میں ہی رہی اور 1545 میں ہمایوں کی واپسی پر بہت خوش ہوئی۔ ہمایوں اور کامران کے درمیان افغانستان میں ہونے والی لڑائیوں کا ذکر انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

ہمایوں نامہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ بابر کی تاریخ سے متعلق ہے اور دوسرا ہمایوں کے حالات کو بیان کرتا ہے۔ انہوں نے بابر کے بارے میں زیادہ تفصیل سے نہیں لکھا ہے کیونکہ 8 سال کا ہونے کی وجہ سے وہ بہت سی باتیں یاد نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے اسے دوسروں سے معلومات لینا پڑتی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے بابر کے بارے میں بہت کم لکھا ہے لیکن چونکہ یہ ان کی ذات کی معلومات پر مبنی ہے اس لیے زیادہ اہم ہے۔ بیگم نے ہمایوں کی زندگی، اس کی لڑائیاں، اس کے دکھ اور پریشانی وغیرہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ سیاسی واقعات کے علاوہ سماجی رسوم و رواج کے حوالے بھی اس کتاب میں ملتے ہیں۔ بیگم نے فصاحت کے ساتھ شادی کی رسومات اور مغل حرم کے رسم و رواج کو بیان کیا ہے۔ اپنے بھائی مرزا ہندال (جو نومبر 1551 میں کامران کے خلاف لڑتے ہوئے مر گیا) کی موت کا ذکر بہت افسوسناک ہے۔ وہ ہندال سے بہت پیار کرتی تھی، اس لیے اسے اس کی خامیاں نظر نہیں آتیں۔

کتاب کا وہ حصہ جو ہمایوں سے متعلق ہے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1. پہلے حصے میں ہمایوں کے سنگھ کو چھوڑ کر کابل پہنچنے اور نابینا کامران کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔
2. دوسرے حصے میں ہمایوں کے سندھ سے ایران تک کے سفر اور کابل کی فتح کا ذکر ہے۔ ہمایوں کی بیوی حامد بانو نے خود گلبدن کو یہ حالات بتائے تھے۔
3. تیسرے حصے میں خضر خواجہ اور دوسرے رشتہ داروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

ہمایوں کی رخصتی سے پہلے کے سیاسی واقعات اور عسکری سرگرمیوں کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ اہم لڑائیوں کو صرف چند الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ''حرم'' کی بیگم کی زندگی، ہمایوں کی اپنی ماں بہنوں سے گہری محبت، مرزا ہندل کی شادی کی رسومات جیسے واقعات کو بیگم نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ہمایوں کو سندھ میں جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ان کا حال بیان کر دیا گیا ہے۔ ہمایوں نامہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے

کہ کامران کو سمجھانے کے لیے خان زادہ بیگم کو بھیجا گیا تھا۔ لیکن کامران مرزا نے ان کا مشورہ نہیں مانا اور ان کی تمام تجاویز کو اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ یہ معلومات ہمیں صرف اور صرف ہمایوں نامہ سے ہی مل سکتی ہیں اس عہد کے کسی دوسرے ماٰخذ میں اس کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

تذکرۃ الواقعات: جوہر آفتابچی (*Tazkirat-ul-Waqiat*: Jauhar Aftabchi)

تذکرۃ الواقعات (تاریخ ہمایوں ی، تاریخ ہمایوں شاہی): جوہر آفتابچی نے، ہمایوں (وفات 964ھ/1556ء) کی زندگی کے نشیب وفراز جو اس نے (1540ء تا 12 فروری 1556ء) کے دوران گزارے اس کی سر گزشت ہے، جس کو اس نے اکبر کے حکم سے ہمایوں کی وفات کے اکتیس سال (1587ء) کے بعد مرتب کرنا شروع کیا جب ابوالفضل کی کتاب اکبر نامہ کے لیے مواد اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ جوہر آفتابچی ہمایوں کا مستقل خدمت گار تھا اور ہمایوں نے پرگنہ ہیبت پور کی آمدنی وصول کرنے کا کام اس کے سپرد کر رکھا تھا، چنانچہ اس نے ہمایوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا، وہ اپنی کتاب میں ہمایوں کی حقیقی زندگی اور ترقی کا راز پیش کرتا ہے وہ ہمہ وقت پریشان رہتا حقائق کو تلاش کرنے میں اور ہر واقعہ کو جو عینی شہادت پر ہو اور معتبر ہو اسے درج کرتا تھا کہ ہمایوں کی اہمیت میں اضافہ ہو سکے۔

جوہر آفتابچی کی تحریر مبالغہ اور قصیدہ گوئی کی روایت سے خالی نظر آتی ہے زبان سادہ اور سچائی کے ساتھ لکھی ہوئی ہے جس سے ہمایوں کی واضح اور زندہ تصویر سامنے آتی ہے جو دنیاوی معاملات میں الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ ایران میں اس کا قیام، جرأت، تحمّل، رحم دلی، انکساری، قناعت اور روزوشب کی گزران، صفوی دربار میں ناقدری اور ہزیمت وناکامی کا تفصیلی بیان کسی اور مورخ نے نہیں لکھا جتنا جوہر آفتابچی نے لکھا ہے تاہم صفوی دربار میں ہمایوں کی ہزیمت اور ان مصائب کو جو اس نے وہاں اٹھائے ظاہر نہیں ہونے دیا، اس کی یادداشت حق گوئی پر مبنی تھی حالانکہ گرتی ہوئی یادداشت کے باعث وہ سوچتا زیادہ اور لکھتا کم تھا جب کہ گمانِ غالب ہے کہ واقعات بیان کرتے وقت اس نے ضرور ان یادداشتوں سے مدد لی ہوگی جو کبھی اس نے لکھی ہوں گی۔

جوہر آفتابچی نے تذکرۃ الواقعات میں لکھا ہے جس کا وہ عینی شاہد اور گواہ ہے کہ جب ہمایوں شیر خاں (شیر شاہ) کا پیچھا کرتا ہوا گوڑ (بنگال) پہنچا تو شیر خاں نے گوڑ کو آگ لگادی اور اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا، ہمایوں نے اس شہر کو آباد کرنے میں خصوصی دلچسپی دکھائی تقریباً نو مہینے وہاں قیام کیا، غلبہ پانے کے بعد تقریباً ایک مہینہ تک وہ باہر نہیں دکھا، اور گوڑ شہر، وہاں کے جلے ہوئے مکانات دوکانیں اور سرائیں، محلّات کو از سرِ نو درست کرایا، اور اس کا نام جنت آباد (باغات و حویلیوں کا شہر) رکھا، اس نے اپنے امراء ووزراء کو بھی اس کی صفائی وستھرائی کے احکامات صادر کئے۔

تذکرۃ الواقعات (جوہر آفتابچی) بابر اور جہانگیر کی تزک کے برعکس، ہمایوں کے ذاتی اوصاف اور قصّوں پر روشنی نہیں ڈالتی جس سے عام قاری یہ اندازہ نہیں لگا پاتا کہ ہمایوں کیسا انسان تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی اور شہزادگی کی زندگی جو تقریباً 23 سالوں پر محیط ہے بالکل خاموش ہے۔ اس کتاب میں تاریخیں بہت کم ہیں، اور جو درج ہیں وہ اغلاط سے پر ہیں، دکن کے جغرافیائی حالات سے واقفیت بھی کم ہے، تاہم بعض واقعات کو جوہر نے سچائی سے پرکھا ہے جس سے وہ صحیح معنوں میں مورخ کی سطح پر آجاتا ہے۔

واقعاتِ مشتاقی: رزق اللہ مشتاقی (*Waqiat-i-Mushtaqi* : Rizqullah Mushtaqi)

اس صدی کے روحانی اور فکری محل نے مشتاقی کو بہت متاثر کیا۔ دوسری خوبیوں کی طرح اس نے سنسکرت اور ہندو مذہبی فلسفے کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس ماحول کا اثر تھا کہ انہوں نے کئی کہانیوں کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ 'عشق مجازی' بڑھ کر 'عشق حقیقی' بنتا ہے۔ سماجی اور مذہبی بندھن پیاروں کو صرف تھوڑے عرصے کے لیے الگ رکھ سکتے ہیں، موت انہیں ہمیشہ کے لیے جوڑ دیتی ہے۔ واقعات مشتاقی اپنے دور کی سیاسی، سماجی اور مذہبی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ بہلول لودی سے متعلق کہانیوں سے افغانوں کی اصل ساخت کا پتہ چلتا ہے۔ مصنف نے اکبر کے کارناموں پر سکندر لودی کے کارناموں کو ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ سکندر لودی کے زمانے میں مسلم حکمراں طبقہ چاہتا تھا کہ ہندوؤں کی عام زندگی میں ہر گز مداخلت نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت میں مسلمانوں کی بالا دستی بھی برقرار رہی۔ ایک بار شہزادہ سکندر لودی نے مسلمانوں کو امیر بنانے کے لیے کروکشیتر کے ہندو مراکز کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ تخت کے دوسرے دعویداروں کے مقابلے میں اس کی پوزیشن مضبوط ہو۔ لیکن اس وقت کے مشہور عالم میاں عبداللہ اجودھنی نے ان کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ شریعت غیر مسلموں کے پرانے مذہبی رسوم ورواج میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتی۔

ان کہانیوں کے ذریعے مشتاقی نے ملک کے نظام عدل، جاسوسی کے محکمے کی کارکردگی، فوج میں بھرتی، اقطاع نظام اور گاؤں کی سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کہانیاں لودی دور میں بڑھتے ہوئے سیاسی تناؤ اور سماجی کشمکش کو اجاگر کرتی ہیں۔ شمالی ہندوستان میں بہت سے طاقتور راجپوت مراکز قائم ہو چکے تھے جن کا وجود افغان حکمرانی کے استحکام کے لیے خطرہ تھا۔ لیکن ان کے ساتھ کوئی دیرپا معاہدہ نہ ہو سکا۔ شیر شاہ کی سخاوت، اس کے دور کی امن وامان اور طرز حکمرانی سے متعلق اصلاحات کو بیان کیا گیا ہے۔ کہیں بالکل نئی معلومات دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر 1531 تک شیر شاہ کے پاس صرف 6000 سوار تھے لیکن ہمایوں کی گجرات میں مصروفیت کے دوران اس کے سواروں کی تعداد بڑھ کر 70,000 ہو گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ بہادر شاہ کی تباہی کے بعد تمام افغانی امراء شیر شاہ کے گرد جمع ہو گئے۔

واقعات مشتاقی کا استعمال نہایت دانشمندی سے کرنا چاہیے کیونکہ مصنف نے اپنے خیالات کو قصوں اور کہانیوں کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے۔ ان بے بنیاد کہانیوں سے تاریخوں اور ان کی ترتیب پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے مشکل مزید بڑھ گئی ہے• جو اس بات کی نشاندہی کرے گا کہ مشتاقی کا تاریخی شعور پوری طرح سے تیار نہیں ہوا تھا۔ کہانیاں بے ترتیب واقعات کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں جو واقعات کی ترتیب کو بدل دیتی ہیں۔ پھر بھی مشتاق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے 16 ویں صدی کے مسلم معاشرے کی ایک دلچسپ تصویر پیش کی ہے۔ فیضی سرہندی، شیخ عبدالحدث دہلوی عباس خان سروانی جیسے مورخین نے اس سے کافی حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔

تحفہ اکبر شاہی: عباس خان سروانی (*Tohfa-i-Akbar Shahi* : Abbas Khan Sarwani)

یہ کتاب عباس خان سروانی نے اکبر کے حکم پر لکھی تھی۔ اس نے شیر شاہ سوری کے کارناموں سے پردہ اٹھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ مصنف نے ان کی یادداشت اور افغان امراء کو اپنے ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے جسے وہ خود جانتے تھے اور جن کا انتقال بہت پہلے ہو چکا

تھا۔ عباس خان کا تعلق علماء و صوفیا کے ایسے طبقے سے تھا جو آج بھی افغان بادشاہ کے سنہرے دور کی یادوں کو چھپا رہے تھے۔ اس تعلق کے باوجود ہمارے مصنف نے اپنے اندازے سے مغلوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ تحفہ اکبر شاہی، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اکبر کے لیے وقف تھا۔ اس کی تحریر کی صحیح تاریخ کا تعین کرنا مشکل ہے۔ اطہر عباس رضوی کے مطابق یہ 31ویں سن الٰہی میں لکھی گئی تھی اور اس کا مقصد تاریخ الفی کے لیے مواد جمع کرنا تھا۔

عباس خان سروانی اپنی کتاب کا آغاز سلطان بہلول لودی کا حوالہ دے کر کرتے ہیں۔ ابتدائی حصہ 1538 کے بعد کے حصے کی طرح متاثر کن نہیں ہے۔ چوسہ کی لڑائی کے مقابلے بلگرام کی جنگ کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ مغلوں کے فرار اور شیر شاہ کی طرف سے ان کے تعاقب کی تفصیلات مختصراً دی گئی ہیں۔ لیکن سندھ بھر کے علاقے میں شیر شاہ کے نظام حکومت کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ شیر شاہ کی طرف سے گکھند کی فتح، کالنجر کے محاصرے اور اس کی موت کے بارے میں عباس خان نے جو معلومات دی ہیں وہ کافی دلچسپ ہیں۔ آخر میں شیر شاہ کے نظام حکومت اور اس میں لائی گئی اصلاحات پر بحث ہے جو بہت اہم ہے۔ یہاں ہمارے مصنف نے وقائع مشتاقی سے بھرپور استفادہ کیا ہے جس سے اس ماخذ کی اہمیت معل وم ہوتی ہے۔

تاریخ شاہی: احمد یادگار (*Tarikh-i-Shahi* : Ahmad Yadgar)

احمد یادگار کتاب کے شروع میں خود کو سور بادشاہ کا پرانا خادم بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ بنگال کے داؤد شاہ نے اسے افغان سلاطین کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ کتاب بہلول لودی کے زمانے سے شروع ہوتی ہے اور ہیمو کے قتل پر ختم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کے والد مغل بادشاہ مرزا عسکر (1517-1488)، ابراہیم لودی (26-1517)، شیر شاہ سوری (45-1539)، اسلام شاہ سور (52-1545)، فیروز شاہ (1552) صرف دو مہینے، عادل شاہ (53-1552)، ابراہیم سور (54-1553 کے علاوہ) اور سکندر شاہ (1554) میں بابر، ہمایوں اور اکبر کے دور کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ لیکن مصنف کا اصل مقصد افغانوں کی تاریخ لکھنا تھا۔ دوسری بات یہ کہ افغان مورخین کی طرح احمد یادگار نے بھی کہانیوں میں بہت دلچسپی دکھائی ہے۔ تاریخوں کے معاملے میں بہت لاپرواہی برتی گئی ہے۔ ہمایوں کی موت کے بارے میں بھی غلطی ہوئی ہے۔

جیسا کہ مسز بیورج نے کہا، تاریخ شاہی کا سب سے اہم حصہ بابر کے آخری دو سالوں سے متعلق ہے۔ یہ قصہ بابر نامہ میں پائے جانے والے خلا کو پر کرتا ہے۔ اس سے بابر کی چند اور کے خلاف مہم کا ذکر ملتا ہے۔ اگر احمد کی یادگار کی تاریخ نہ ہوتی تو ہمیں معلوم نہ ہوتا کہ بابر تخت کے تیسرے سال لاہور چلا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں احمد یادگار سے بہت سی نئی معلومات ملتی ہیں۔ جہاں تک افغان حکمرانوں کا تعلق ہے تو ہمارے مصنف نے کچھ نئی باتیں بتائی ہیں۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر احمد یادگار کی تاریخ افغان اور مغل دونوں ادوار کے لیے بہت اہم ہے۔

تذکرہ ہمایوں و اکبر: بایزید بیات (*Tazkirah-i Humayun wa Akbar* : Bayazid Bayat)

بایزید بیات 1587 سے بکاول بیگی (شاہی مطبخ کے منتظم) کے طور پر کام کر رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اکبر نے تمام عقلمند اور ذہین

درباریوں کو حکم دیا تھا کہ وہ تاریخ لکھیں اور ہمایوں کے دور سے متعلق جو کچھ بھی کسی کو یاد ہو، اسے قلم بند کیا جائے۔ بایزید نے اس ترتیب کے مطابق یہ کتاب تصنیف کی، کیونکہ وہ کم راہی کی وجہ سے خود لکھنے کے قابل نہیں تھا۔ اس لیے ابوالفضل نے اس کے لیے ایک ادیب کی خدمات حاصل کیں۔ یہ کتاب ابوالفضل کے استعمال کے لیے لکھی گئی تھی۔ وہ بایزید خاندان سے ترک تھے۔ ہمایوں سے اس کی پہلی ملاقات 1544 میں ایران میں ہوئی۔ اس سال دسمبر میں ہمایوں مشہد پہنچا جہاں بایزید اپنے نوکروں سے ملا۔ 1545 میں ہمایوں نے اسے بیرم خان کے ساتھ مرزا کامران کے پاس اپنا قاصد بنا کر کابل بھیجا تھا۔

ہمایوں کے 'امراء' میں شامل رہا۔ کچھ دن حسین قلی سلطان خان 'مہردار' کے پاس رہے۔ 1550 میں قپچاک کی جنگ میں مارے جانے کے بعد بایزید، خواجہ جلال الدین احمد کے خادموں میں شامل ہو گیا۔ بعد ازاں وہ منعم خان کے دفتر میں داخل ہوئے۔ جب ہمایوں ہندوستان چلا گیا تو منعم خان کو کابل کا گورنر مقرر کیا گیا۔ بایزید بھی ان کے ساتھ کابل میں رہا۔

1563 میں جب اکبر اپنی سوتیلی ماں ماہم انگہ (ماہم کی والدہ) کو لے گیا تو منعم خان اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ابھی تک اس کے ساتھ تھا۔ کھاتہ دار کو جلال آباد کے میدان میں شکست کھا کر آگرہ واپس جانا پڑا۔ یہ وہ منظر تھا جسے ہمارے مصنف نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اکبر نے خانِ خاناں کو تسلی دی اور واپس بھیج دیا اور حاجی کو اپنی جاگیر حصار فیروزہ کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اسی دور میں ہمایوں کے قریبی دوست امیر ابوالمعالی نے حملہ کیا لیکن بایزید نے اس کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔

1567 میں ازبیک بغاوت کو دبانے کے بعد جونپور اور دیگر علاقے منعم خان کے حوالے کر دیے گئے۔ اس نے بایزید کو حصار فیروزہ سے بلایا اور بنارس کا حاکم بنایا۔ انہوں نے غازی پور اور گورکھپور میں بھی منعم خان کی حمایت کی۔ 1575 میں "خانِ خان" کی موت کے بعد، اکبر نے اسے فتح پور بلایا اور راناپرتاپ کے خلاف بھیج دیا۔ بعد میں پرگنہ دیپالپور کے محصولات کے انتظام کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال دیا گیا۔ مارچ۔ اپریل 1577 میں اسے شاہی خزانے کا انسپکٹر مقرر کیا گیا۔ 1584ء میں بایزید مکہ سے فتح پور واپس آیا۔ وہ کابل مہم میں اکبر کے ساتھ تھا۔ اگرچہ ان کے منصب کی تعداد 200 سے زیادہ نہیں تھی لیکن پھر بھی انہیں اہم عہدوں پر فائز ہونے کا موقع ملا۔

یہ تذکرہ، ہمایوں کی ایران روانگی سے شروع ہوتا ہے۔ ان 'امراء' کی فہرست بھی دی جو آپ کے ساتھی تھے۔ ہمایوں کے کابل پر قبضے کی صورت حال اہم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دلچسپ بھی ہے کیونکہ اس سے ہمایوں کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے کردار کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ ان کی سخاوت، علم نجوم اور مصوری میں ان کی دلچسپی، فنکاروں اور علماء کی سرپرستی وغیرہ۔

بایزید نے اکبر کے بارے میں بہت مفید معلومات دی ہیں۔ اس نے اپنے تجربے اور عظیم کارناموں کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ ان کو پرکھا اور پرکھا ہے۔ کابل کے گورنر اور ایک وکیل کی حیثیت سے منعم خان کی صورتحال کچھ اہم سیاسی اور انتظامی پیش رفت پر روشنی ڈالتی ہے۔ کرایہ کا نظام، جاگیروں کی حکمرانی اور "گھوڑوں کو ریت دینے" وغیرہ کی رسمیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ چونکہ بایزید کی ساری تصنیف ان کے حافظے پر مبنی ہے اس لیے واقعات کی ترتیب درست نہیں ہے اور بعض باتیں دہرائی گئی ہیں۔ ایک کٹر مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کے

بیان میں بھی تسبیح کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ہیمو کو 'حرام زادہ، کافر کہتا ہے۔

نفائس المعاصر: میر علاؤالدولہ قزوینی (*Nafais-ul-Masir* : Mir Ala-ud-Daula Qazwini)

میر علاؤالدولہ قزوینی نامی شاعر نے شاعری میں دلچسپی دیکھ کر یہ کتاب لکھی کیونکہ یہ کتاب شاعروں کی سوانح پر مبنی ہے۔ اسے 28 ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مختلف ابواب میں مختلف شعراء کا تذکرہ ان کے تخلص کے پہلے کلام کے مطابق کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں 1565۔66 سے 1574۔75 تک کے حالات موجود ہیں۔ بابر، ہمایوں اور اکبر کے زمانے سے، امراء اور بابر اور دوسرے تیموری شہزادوں کی اولاد کا تذکرہ "ابھی تک" (ابواب) میں کیا گیا ہے جن میں شاعروں کا بیان ہے۔ بابر اور ہمایوں کے لیے قزوینی نے مکمل طور پر تزک بابری اور تاریخ رشیدی پر انحصار کیا ہے اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ شاید اسے اکبر کے زمانے کے حالات کا علم اپنے بھائی میر عبداللطیف سے ہوا تھا کیونکہ وہ اکبر کے پہلے ہی سال ایران سے آکر اس کے دفتر میں داخل ہوا تھا۔

اس کتاب میں اکابر کو شریعت کا معلم اور علماء کا سرپرست بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی جیت کو اسلام پھیلانے کے جوش سے جوڑا گیا ہے۔ مصنف نے راجہ بھرمل کو مطیع الاسلام (اسلام کے وفادار) کا خطاب دیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ گجرات کی فتح کے پیچھے کوئی سیاسی وجہ نہیں تھی بلکہ اکبر کا مقصد وہاں افغان مہدیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا تھا۔

آگرہ اور فتح پور سیکری کی کئی عمارتوں کے احوال اس کتاب کی اہمیت کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔ اس میں اکبر کے درباری گلوکاروں اور شاعروں کے حوالے بھی موجود ہیں۔ امراء اور شعراء کی زندگی ایک سماجی، مذہبی اور دانشمندانہ ماحول کو ظاہر کرتی ہے۔

تاریخِ اکبری: عارف قندھاری (*Tarikh-i-Akbari* : Arif Qandhari)

یہ نفائس المعاصر کے اسلوب میں لکھی گئی ایک اور کتاب ہے جو عہد اخضر سے متعلق ہے۔ اس کے مصنف عارف قندھاری 1545 کے بعد بیرم خان کے دربار میں داخل ہوئے اور آخری وقت (جنوری 1561) تک ان کے ساتھ رہے۔ 1574ء میں وہ مکہ مدینہ سے واپس آیا اور مظفر خان (جو پہلے بیرم خان کا 'دیوانِ بیوتات' رہ چکا تھا) کے ساتھ شامل ہو گیا، نومبر دسمبر 1577ء میں دہلی آکر وہ شاہی کیمپ میں شامل ہو گیا اور مخدوم میں چلا گیا۔ لاموںک اسے عبداللہ سلطان پوری کی قیادت میں "دیوانِ سادات" کے طور پر پنجاب بھیجا گیا، ایسا لگتا ہے کہ وہ ملا کے ساتھ قائم نہ رہ سکے اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔ تاریخ اکبری جو اس نے پہلے ہی شروع کی تھی، اگست 1585 میں ختم ہوئی۔

قندھاری نے اکبر کی اصلاحات پر بحث اور تعریف کی ہے۔ مصنف نے جاگیرداروں کے تئیں پالیسی کو اکبر کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں تقریباً دو تین سو زمیندار ہیں جنہیں طاقت سے قابو کرنا ان عظمت کا قائل کرنا بھی اس کتاب کے مقاصد میں شامل ہے۔

اکبر نامہ: ابوالفضل (*Akbar Nama* : Abul Fazl)

ابوالفضل کا خیال تھا کہ بادشاہت خدا کا تحفہ ہے۔ اس لیے اس نے چنگیز خان کو ایک خاص روحانی انداز میں بیان کیا ہے۔ اکبر ابوالفضل کی نظر میں بادشاہ سے بھی بڑا تھا۔ وہ اسے انسان کامل سمجھتے تھے جو کوئی غلط کام نہیں کر سکتا تھا اور اس کے سامنے ایک مشن تھا۔ ابوالفضل نے لکھنے کے لیے پرانے مورخین کی شراکت کو منسوخ کر دیا۔ بیان بازی اور الفاظ کے گھماؤ کی بھی تردید کی گئی ہے۔ اس نے دعویٰ کیا ہے، اس کا انداز اچھوتا اور منفرد ہے۔ اس نے تاریخی تقاضوں کی تکمیل کے لیے فلسفے کو زبان اور اسلوب کی تکمیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ سات سال کی محنت کے بعد ابوالفضل نے اکبر نامہ 1597-98 میں مکمل کیا اور اکبر کو پیش کیا۔ اس لہجے کو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تیسری جلد آئین اکبری ہے۔

پہلا واقعہ اکبر کی پیدائش کے تفصیلی بیان سے شروع ہوتا ہے اور 15 ستمبر 1572 کو ختم ہوتا ہے۔ یعنی اکبر کی تیس سالہ زندگی کی تاریخ اس میں موجود ہے۔ اس حصے میں زیر بحث دیگر دلچسپ موضوعات کائنات کی تخلیق، مختلف مذاہب کے نظریات، آدم اور دیگر انبیاء کی تصریحات اور اکبر کے آباؤ اجداد کی حالت سے متعلق ہیں۔ دوسرے حصے میں اکبر کے تخت سے لے کر 46ویں سال تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ تیسرا حصہ یعنی آئین اکبری اکبر نامہ کی زندگی ہے۔ اس سے ابوالفضل کی ذہانت، تفتیش کی گہرائی اور تاریخ کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں 10، دوسرے میں 30 اور تیسرے میں 16 "ضابطے" ہیں۔ چوتھے حصے میں ہندوستان کی ذاتوں، موسموں، فصلوں اور قدرتی حسن کا ذکر ہے۔ ہندوؤں کا فلسفہ، سیاست، ادب، مذہبی زندگی اور ان کے نظام عدل وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں ہندوستانی اولیاء اور کچھ غیر ملکی صوفی سوانح عمری دی گئی ہے۔ پانچواں حصہ صرف دو ابواب پر مشتمل ہے جس میں اکبر کے اقوال اور ابوالفضل کی سوانح عمری ہے۔ آئین، اکبر کے نظام حکومت کی وضاحت کرتا ہے لیکن ابوالفضل کا فلسفیانہ انداز، جس کی مدد سے اس نے نظام میں روحانیت کا اثر دکھایا ہے، اس کتاب کو مشکل اور غیر دلچسپ بنا دیتا ہے۔

ابوالفضل سے پہلے امیر خسرو نے اپنی کتاب نہ سپہر میں اسی طرح کا موضوع پیش کیا تھا۔ آئین میں ہندوؤں اور ان کے خیالات کو نئے سرے سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ البیرونی کی کتاب عربی میں ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے کم فائدہ مند تھی۔ فارسی میں کی گئی کوششیں ابوالفضل کے کام نہ آئیں۔ گو کہ اب آپ کے جوش و خروش کا ثبوت۔ انہوں نے ہندوؤں کو مذہبی، مہمان نواز اور فیاض قرار دیا ہے۔ ان کی سنجیدگی، دیانت او رشائستگی کی مثال دی گئی ہے۔ الویرونی کی طرح ابوالفضل بھی ہندوؤں کو توحید پرست سمجھتے ہیں۔ انہوں نے مختلف مذاہب کے درمیان اخت لافات کی بہت سی وجوہات بیان کی ہیں، جیسے زبانوں کا فرق، جس کی وجہ سے ایک دوسرے کی زبانوں کو سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ دوم، م فسرین کی نااہلی، سوم، اختلاف کرنے والوں میں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے جوش و خروش کا فقدان، چہارم تنگ نظری اور تلاش کے لیے جوش کی کمی۔ پانچویں تسبیح سے دستبردار نہ ہونا، پرانے روایتی نقطہ نظر پر جنونیت کے ساتھ عمل کرنا، عقل و فہم کے آگے نہ جھکنا، چھٹا، مذہب کے نام پر حکمرانوں کو ستانا، ساتواں، ایسے لوگوں کا اقتدار میں رہنا جو ماحول کو پسند نہیں کرتے۔ تفتیش اور تفتیش کا.. ابوالفضل نے اس فرق اور بھید بھاؤ کی زیادہ تر ذمہ داری حکمرانوں پر ڈالی ہے۔ اکبر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفضل نے اکبر کو

ہیر و سمجھا ہے۔اسے 'انسان کامل' ثابت کرنے کے لیے اس نے جگہ جگہ ہندو اور مسلم روایت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر ابوالفضل نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس عقیدے سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے کہ انبیاء کی پیدائش کے وقت عجیب و غریب قصے پیش آتے ہیں اور اسی طرح کے واقعات کو اکبر کی پیدائش سے جوڑ دیا ہے۔ کسی نہ کسی طرح مصنف نے اکبر کے ہر فعل کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بچپن میں اس کی مناسب تعلیم کی کمی کا تعلق انبیاء کے عام طور پر ناخواندہ ہونے سے ہے۔اس نظریے کو تقویت دینے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اکبر کی پالیسیوں کو خدا کی مرضی اور اس کی مدد کا نتیجہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ شہنشاہ کی اطاعت کریں۔اکابر کا ہاتھیوں کی پرورش اور ان کو قابو میں رکھنا بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ اختیارات کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس 'انسان کامل' کی اطاعت و فرمانبرداری واجب اور عدل ہے۔ اس طرح ابوالفضل نے تصوف کی زبان سے استفادہ کرتے ہوئے اکبر کی شخصیت کو ایک عام آدمی سے بہت بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔

اکبر کی فتوحات کا تعلق چنگیز، ہلاکو اور تیمور سے نہیں ہے۔ اکبر کی فتح کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ سخاوت، رواداری، انصاف اور امن پر مبنی اس کے نظام حکومت سے مستفید ہو سکیں۔ابوالفضل نے حسب روایت الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔ معمولی مذہبی جنونیت کی عکاسی کرنے والے محاوروں اور الفاظ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بادشاہ کے لیے اور اتحاد لانے والی قوتیں ان قوتوں سے ٹکرا گئیں جو انہیں دینا چاہتی تھیں۔ ہمارا مصنف تعصب، مصائب اور غربت کی سختی سے تردید کرتا ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا ہندو۔ وہ راجہ توڈر مل کی ایمانداری، ہمت اور قابلیت کی تعریف کرتے ہیں، لیکن تعصب کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر وہ اپنے خیال پر قائم رہتے تو مہاتماؤں میں شامل ہوتے۔

طبقاتِ اکبری: نظام الدین احمد (*Tabqat i- Akbari* : Nizamuddin Ahmad)

اس کے مصنف نظام الدین احمد تھے۔ان کے والد کا نام محمد مقیم ہاروی تھا جو بابر کا وال بیوتا تھا۔ ہمایوں اور اکبر کے زمانے میں بھی انہوں نے عظیم الخدمت عطا کیا۔ نظام الدین ایک پڑھے لکھے اور ملنسار آدمی تھے۔ان کا تعلق ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے علماء سے تھا۔اس نے کئی حملوں میں اکبر کا ساتھ دیا۔ وہ گجرات میں بخشی کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ مالوا اور اجمیر میں بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ایسی حالت میں، اس نے صورتحال کے بارے میں ذاتی معلومات حاصل کرنے میں بہت مدد کی۔ وہ تاریخ الفی لکھنے کے بورڈ کے رکن بھی تھے۔ وہ ایک مشہور مورخ اور سمجھدار افسر تھے۔ان کا انتقال 1594ء میں ہوا۔

طبقات اکبری ہندوستان کی ایک عام تاریخ ہے۔اسے نو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سلاطین دہلوی اور مغلوں کی حالت پہلے دو حصوں میں دی گئی ہے۔ باقی میں دکن، گجرات، مالوہ، بنگال، جونپور، کشمیر، سنگھ اور ملتان کے حالات دیے گئے ہیں۔ نظام الدین نے اکبر نامہ اور آئین اکبری سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔اس کے علاوہ، انہوں نے 28 دیگر متن کا حوالہ دیا، لیکن ان میں سے بہت سے اب دستیاب نہیں ہیں.

بابر کے حالات زیادہ تر بابر نامہ سے لیے گئے ہیں۔اس نے والد کے بارے میں معلومات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ہمایوں اور اکبر کا حال کافی حد تک تاریخ الفی سے لیا گیا ہے۔ابوالفضل کی چاپلوسی اور بدایونی کی نفرت اور تعصب کے درمیان نظام الدین نے اپنے لیے ایک نئی

راہ نکالی ہے۔ وہ اکبر کے زمانے کا دانا آدمی تھا۔ اور انصاف کا انتخاب مورخ ہے۔

منتخب التواریخ: عبدالقادر بدایونی (*Muntakhab-ut-Tawarikh* : Abdul Qadir Badayuni)

منتخب التواریخ: عبدالقادر بدایونی کا منتخب التواریخ مغل دور کی ایک اور اہم تاریخ ہے۔ اکبر کے تین طبقے مورخین ہیں۔ اس سے پہلے وہ لوگ جنہوں نے اکبر کو ہیرو سمجھا ہے جیسے ابوالفضل ان کے نزدیک اکبر کا ہر عمل قابل تعریف اور ہر کام مسیت الٰہی کا معاملہ تھا۔ دوسری قسم کے لوگ جو اکبر کی مدح میں فتنہ کا شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے نظام الدین احمد کی طرح غیر ذمہ داری سے حالات کو جانچا اور پرکھا ہے۔ تیسرا حصہ پھر انتہا پسندوں کا ہے جنہوں نے ایہ ناانصافی تھی۔ تمام اعلیٰ عہدوں اور بادشاہوں کی نعمتوں کے حقدار صرف مسلمان تھے۔ ایک عام آدمی تواریخ پڑھ کر بدایونی کو نظر انداز کر سکتا ہے لیکن مورخ کے لیے اکبر کے دور کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بدایونی کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ اگر بدایونی کے خیالات ہم تک نہ پہنچتے تو ہم اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ اکبر کی مذہبی رواداری اور صلح کل کی پالیسی کا کیا اثر ہوا؟

ہم صرف بدایونی سے جانتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بدایونی نے علماء کے نقطہ نظر کو بے نقاب کیا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک غیر متزلزل حقیقت ہے کہ وہ اپنے زمانے کے علماء سے غیر مطمئن تھا۔ اسے بناوٹ سے نفرت تھی۔ اسے اپنی قابلیت، علم اور حکمت پر ناز تھا۔ اسے اس وقت سے شکایت تھی کہ وہ اس کی قدر نہیں کرتا تھا۔ عبدالقادر 1540ء میں ٹوڈا (راجستھان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ملوک شاہ تھا۔ انہوں نے شیخ حاتم سنبھلی، شیخ ابوالفتح اور شیخ مبارک (ابوالفضل کے والد) جیسے نامور علماء سے تعلیم حاصل کی۔ بدایونی پر شیخ مبارک کی تعلیم کا گہرا اثر ہوا۔ 1565-66 میں وہ پٹیالی چلا گیا اور نو سال تک حسین خان کی فوجوں کا انچارج رہا۔ حسین خان جیسے جنونی مسلمان کی صحبت نے بھی ہمارے ادیب پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ 1574 میں بدایونی آگرہ آیا اور اکبر کے دربار میں داخل ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب بادشاہ اپنے دماغی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے مردوں، کتابوں اور نظریات کی تلاش میں تھا۔ آپ کو 1575-76 میں "امام" بنایا گیا اور اسے 1000 بیگھ اراضی مدِ معاش کے طور پر ملی۔ عبادت خانہ میں بدایونی نے نامور علماء کو قائل کیا اور بادشاہ کو اپنی حکمت اور علم سے متاثر کیا۔ لیکن ابوالفضل کا بڑھتا ہوا اثر بدایونی کے دل و دماغ میں ہلچل مچاتا رہا۔ وہ ابوالفضل اور اس کے بھائی فانی کو اپنی ترقی اور اکبر کے ذہن کو اسلام سے ہٹانے کی وجہ قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو شریعت کی حمایت میں لڑنے والا سپاہی سمجھتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں اکبر اور ابوالفضل نے اسلام دشمنی پر کمر باندھ رکھی تھی۔ اس کے یہ خیالات اس کی تنگ دستی اور مذہبی جنون کا نتیجہ ہیں۔ تواریخ ان کی تعصب کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ رانا کے خلاف لڑائی میں کیوں شامل ہونا چاہتے ہیں، بدایونی نے کہا تھا کہ وہ کافروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس تعصب کے باوجود بدایونی مہدوی قوم کے ہمدرد تھے جب کہ جنونی علماء کا ایک طبقہ ان کی جڑیں کھودنے میں مصروف تھا۔ اسے شیخ مبارک کی رفاقت کا اثر کہہ سکتے ہیں۔ بدایونی ایسے حکیموں اور علماء سے نفرت کرتا تھا جو دنیا کی چمک دمک، طاقت اور مذہب کے لالچ میں تھے۔ اسی لیے انہوں نے عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی پر بھی تنقید کی ہے۔ عنبر کے کچھوہوں کے بارے میں بدایونی کا رویہ دوسرے غیر مسلموں کو دیکھتے ہوئے بہتر نظر آتا ہے۔ وہ کچھواہوں کے مذہب پر قائم رہنے اور دین الٰہی کو قبول نہ کرنے پر ان کی تعریف کرتا

ہے۔ بدایونی نے مرزا کامران کے بیٹے مرزا عبدالقاسم کے قتل (1564) کو بیان نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ وہ خون اکبر کے حکم پر کسی کچھواہ سردار نے لیا تھا اور اس لیے بھی کہ اس کے قلم سے یہ چھینٹا اس کچھواہا سردار کے ہاتھ پر پڑھا گیا، جب کہ وہ اکبر پر الزام لگانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

1575ء کا سال بدایونی جیسے مذہبی مسلمان کے لیے اچھا وقت نہیں تھا۔ اس سال نظامِ حکمرانی میں اہم اصلاحات کی گئیں، جیسے داغ کا نظام، جاگیروں کی ضبطی، کرایہ وصول کرنے کا ایک نیا طریقہ جو زمین کی پیمائش پر مبنی تھا، مددِ معاش زمینوں پر کچھ پابندیاں وغیرہ۔ ان اصلاحات نے خاص طور پر مددِ معاش سے متعلق اس طبقے پر برا اثر ڈالا جس کا براہ راست تعلق بدایونی سے تھا۔ ان کی تحریریں ان کے ردعمل کی عکاسی کرتی ہیں۔ اسے 1564 کا دور پسند ہے کیونکہ اکبر اس وقت مددِ معاش کے بارے میں بہت آزاد خیال تھا۔ ابتدا میں، عبادت خانہ بدایونی کے دھیان سے نہیں گیا۔ لیکن 1579 کے بعد جب ہر مسلک کے لوگ اس میں شامل ہونے لگے تو، وہ یہ برداشت نہ کر سکا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکبر انتظامات کے معاملے میں بہت سخت رہنے لگا۔ نئ پالیسیاں بنائی گئیں اور ان پر عمل درآمد کیا گیا جس کا اثر ملک کی معاشی، سیاسی اور مذہبی حالت پر پڑا۔ پرانے ذہن اور مذہبی لوگوں کے لیے ان حالات سے تصفیہ کرنا مشکل ہو گیا اور بدایونی نے انتظامیہ کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ دوسری طرف ابوالفضل نے نہ صرف اکبر کا ساتھ دیا بلکہ پالیسی بنانے ور نفاذ میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس کی دن رات چوگنی ترقی نے ہمارے مصنف کو حسد کی آگ میں جھونک دیا اور اکبر کے خلاف اس کا غصہ دوگنا ہو گیا۔

بدایونی نے 1590 میں اپنی رپورٹ لکھنا شروع کی۔ یہ وہ وقت تھا جب اسے یقین ہو گیا کہ اسلام کو بدنام کرنے اور اس کی جڑیں کھودنے والی ایک جماعت ہے اور بادشاہ خود اس کی قیادت کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بدایونی نے اکبر کی ایک کتاب خرد فجی کو کھو دیا تھا جس سے بادشاہ ناراض ہو گیا تھا اور اسے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ بدایونی کی کتاب کو (977تا998ء) سے ہمایوں کی وفات تک، نظام الدین احمد کی طبقات اکبری کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا حصہ مجموعی طور پر اس کے اپنے دور سے متعلق ہے، جب کہ تیسرا حصہ صوفیاء سے متعلق ہے اور اس میں شاعروں اور علماء کی سوانح حیات بھی دی گئی ہے۔

چونکہ مصنف نے اس کتاب میں اپنی لذتوں، عداوتوں اور اپنی پسند و ناپسند کو پوری جگہ دی ہے، اس لیے اس کو بہت سمجھداری سے استعمال کرنا چاہیے۔ ان کی ذہانت کی چند مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جب اس سے مہابھارت کا ترجمہ کرنے کو کہا گیا تو بدایونی نے اپنی بدقسمتی پر آنسو بہائے کیونکہ اسے اپنے ہاتھوں سے کافروں کے دیوتاؤں کے نام لکھنا پڑ رہا تھا۔ ایک دفعہ بدایونی شطاری سلسلۂ کے ایک صوفی شیخ محمد غوث سے ملنے گئے لیکن جیسے ہی اس نے دیکھا کہ شیخ کھڑے ہو کر ہندوؤں کا استقبال کر رہے ہیں تو اس نے شیخ سے ملے بغیر واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ بدایونی نے راکھی جیسے ہندوؤں کے تیوہاروں کو بھی برا کہا جسے افغان بادشاہوں نے بھی جاری رکھا۔ لیکن تواریخ میں لکھا ہے کہ یہ رسم اکبر کو خدا کا درجہ دینے کے لیے شروع کی گئی تھی۔ بدایونی نے اکبر کی حکمرانی اصلاحات کو بھی فضول قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں اکبر کی ہر پالیسی اسلام کے خلاف سازش تھی۔ اپنے مفروضے کو کامیاب بنانے کے لیے وہ چند واقعات کا انتخاب کرتا ہے اور تفصیلات کو چھوڑ دیتا ہے۔ مثال کے

طور پر، اکبر کے ایک فرمان میں گائے، بھینس، بھیڑ اور اونٹ کا گوشت کھانے سے منع کیا گیا تھا کیونکہ یہ گھریلو جانور ہیں لیکن ہمارے ایماندار مورخ جو تاریخ کو صرف مذہبی لوگوں کا حصہ سمجھتے ہیں، نے اکبر کی اسلام دشمن پالیسی اور اس پر اس کی ہندو بیویوں کے اثر کو ثابت کرنے کے لیے گائے کے علاوہ کسی جانور کا نام نہیں لیا۔

بدایونی کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتظامی اور سیاسی واقعات میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے کسی سیاسی صورت حال کی وضاحت نہیں کی۔ تاہم، کرنو گرام کی مدد سے، بہت سے مشہور لوگوں کی موت کی تاریخیں ضرور معلوم ہوتی ہیں۔ بدایونی نے بھی مستکی کی طرح عشق و محبت کی بہت سی کہانیاں بیان کی ہیں جو کتاب کو بہت دلچسپ بناتی ہیں، جیسے سید موسیٰ اور سنار کی بیٹی موہنی کی کہانی اور خود بدایونی کی محبت کی کہانیاں۔ اگر اس کہانی کو ہٹا دیا جائے تو اکبر کے دور کی تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے۔

2.3.3 جہانگیر کے عہد میں (During the Period of Jahangir)

تزکِ جہانگیری: جہانگیر (*Tuzuk-i-Jahangiri* : Jahangir)

جہانگیر کے دور کے بارے میں معلومات کے لیے جہانگیر خود ایک ممتاز مورخ ہے۔ تزک جہانگیری اس دور کا پہلا ماخذ ہے۔ اس میں لڑائیوں ک اس موقع پر جہانگیر اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور اپنے کارناموں اور ان کی مرضی پر فخر کرتا ہے۔ تزک میں حکمرانی کے قوانین مکمل طور پر درج کیے گئے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی، روزمرہ کی مصروفیات اور اپنی شخصیت کے بارے میں نہایت خلوص کے ساتھ لکھا ہے۔ پہلے 15 سال جہانگیر کی زندگی کے سال تھے۔ سولہویں سال سے اس کے لیے نحوست کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جوں جوں پریشانیاں بڑھتی گئیں، تزک کی تفصیلات بھی کم ہوتی گئیں۔ مہاوت خان کے ہاتھوں بادشاہ کے اسیر ہونے جیسا واقعہ درج کرنا انتہائی شرمناک تھا۔

تزک کی اہمیت صرف جہانگیر کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ تزک کے لیے ان کے برجوں اور افسروں کی زندگی، ان کے نظریے اور خود بادشاہ کی رائے کے بارے میں جاننا بھی بہت ضروری ہے۔ جہانگیر نے اپنے اجمیر، مالوا، گجرات، پنجاب اور کشمیر کے دوروں کا مکمل احوال دے کر تاریخ میں بہت بڑا حصہ ڈالا ہے۔ اس سے ایک طرف ملک کے مختلف حصوں کا حال معلوم ہوتا ہے تو دوسری طرف صوبوں اور دیہاتوں کی حالت گرتی ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا ذکر عام طور پر بادشاہوں کی تحریروں میں نہیں ہوتا۔ جہانگیر کا اپنا قلم سولہویں سال پر رک جاتا ہے۔ بقیہ صورت حال لکھنے کا کام معتمد خان بخشی کو جنوب سے واپسی پر سونپا گیا۔ بادشاہ کے نام سے انیسویں سال تک کے حالات لکھے۔ اس کے بعد کے واقعات مصنف نے اپنے نام سے لکھے ہیں جو ان کی کتاب اقبال نامہ جہانگیر کا حصہ ہے۔ تزک کی تکمیل مولوی محمد ہادی نے کی۔

اقبال نامہ جہانگیری: معتمد خان (*Iqbalnama-i-Jahangiri* : Mutamad Khan)

اقبال نامہ جہانگیری: جہانگیر کے سولہویں سال سے معتمد خان دربار میں مقیم تھا اور اسے بادشاہ کے ساتھ سفر کرنے کا پورا موقع ملا۔

تزک کے انیسویں سال تک کے حالات، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس نے لکھا تھا۔ اس لیے چند نئی چیزوں کے علاوہ اقبال نامہ میں انیسویں سال تک کے تمام حالات تزک ہی سے لیے گئے ہیں۔ معتمد خان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے چوتھے سال اعتماد الدولہ کو اس کے بیٹے شہزادہ خسرو کی رہائی کی سازش میں ملوث ہونے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد بھاری جرمانہ ادا کر کے جیل سے رہا کر دیا گیا۔

اقبال نامہ، جہانگیر کے زمانے کے حالات جاننے کا واحد ذریعہ تھا۔ معتمد خان، مہاوت خان کی بغاوت کے وقت شاہی کیمپ میں موجود تھا۔ اس نے بادشاہ کو مہابت خان کے چنگل سے نکالنے کی کوششوں میں بھی خاص کردار ادا کیا۔ بیگم نور جہاں کے قریب ہونے کی وجہ سے وہ ان کے رویے محمد ہادی جس نے تزک مکمل کی وہ مکمل طور پر معتمد خان پر منحصر ہے۔

2.3.4 شاہجہاں کے عہد میں (During the Period of Shahjahan)

پادشاہ نامہ: محمد امین قزوینی (*Padshah Nama* : Muhammad Amin Qazvini)

محمد امین قزوینی کی بادشاہ نامہ، شاہجہاں کے دور کی ابتدائی سرکاری تاریخ ہے۔ آٹھویں سال چچازاد بھائیوں کو یہ کتاب لکھنے کا حکم دیا گیا اور بیسویں سال انہوں نے شاہجہاں کے پہلے دس سالوں کی تاریخ لکھ کر مدح کو پیش کی۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف 20 سال سے اس کتاب کو لانا چاہتا تھا لیکن جیسا کہ محمد صالح نے کہا، ان کو محکمہ انٹیلی جنس میں اس عہدے پر تعینات کیا گیا جہاں وہ اپنی مصروفیت اور وقت کی کمی کے باعث اپنی خواہش پوری نہ کر سکے۔ اس کے باوجود، قزوینی نے شاہجہاں کے دور کی تاریخ نویسی کا معیار متعین کیا اور اس دور کی تقریباً تمام تاریخیں اسی کے طرز پر لکھی گئیں۔

پادشاہ نامہ: عبدالحمید لاہوری (*Padshah Nama* : Abdul Hamid Lahauri)

اکبر کی طرح شاہجہاں نے بھی اپنے دور کی تاریخ لکھوانے میں خصوصی دلچسپی لی اور اس مقصد کے لیے ملازمین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ لاہوری نے شاہجہاں کے دور کے آغاز سے لے کر بیس سال کی تاریخ لکھی ہے۔ شاہجہاں چاہتا تھا کہ اس کے دور کی تاریخ ابوالفضل کی طرز پر لکھی جائے۔ لاہوری جو اپنی تحریر کے لیے بہت مشہور تھے، پٹنہ سے بلوائے گئے اور یہ کام ان کے سپرد کر دیا گیا۔ بادشاہ نامہ تیمور کی حالت سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں شہزادوں، عمروں، علماء، صوفیاء، حکیموں اور شاعروں کے حالات بھی ملتے ہیں، جن کی وجہ سے شاہجہاں کا دور سماجی، اس سے معاشی اور سیاسی صورتحال کا اندازہ ہوتا ہے۔ محمد وارث کا بادشاہ نامہ لاہوری کے کام کو مکمل کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ ہے وارث لاہوری کے شاگرد اور معاون تھے۔ اس نے اپنی کتاب شاہجہاں کی اکیسویں تحریر کی۔ سال سے شروع ہوا اور تیسویں سال پر ختم ہوا۔

عمل صالح: محمد صالح کمبوہ (*Amal-i-Saleh* : Muhammad Saleh Kamboh)

اس کے مصنف محمد صالح کمبوہ تھے جو فارسی اور ہندی کے اچھے شاعر تھے۔ ان کا منصب 500 تھا۔ اس نے شاہجہاں کے دور کی مکمل تاریخ لکھی ہے۔ شاہجہاں کی گزشتہ دو سالوں کی تحریر کی اہمیت اس لیے بہت بڑھ گئی ہے کہ لاہوری اور وارث دونوں نے صرف 30

سال تک کی شرائط دی ہیں۔ لاہوری کی طرح صالح نے بھی منصب داروں کی فہرست دی ہے۔ سیاسی واقعات کے علاوہ اس میں شاہجہاں کے دور کے علماء، مشائخ، حکم اور شعراء کا بھی ذکر ہے۔

صادق خان: تاریخ شاہ جہانی (*Tarikh-i-Shahjahani* : Sadiq Khan)

شاہجہاں کے دور میں سلطنت کے حالات اور افسران سے متعلق معلومات صادق خان کی تاریخ شاہ جہانی سے ملتی ہیں۔ مصنف خود ایک بڑا منصب دار تھا، (6000/6000) اس لیے حالات سے بخوبی واقف تھا۔ شاہجہاں کے آخری مرحلے کے لیے جسے صالح نے بھی مختصراً بیان کیا۔ بادشاہ کے پچھلے آٹھ سال جو انہوں نے مرکز میں گزارے، صادق خان نے کوئی بیان نہیں دیا۔ اس میں لکھا ہے کہ ان 8 سالوں کی تفصیل بے حیائی اور بے ایمانی ہو گی۔

چندر بھان: چہار چمن (*Chahar Chaman* : Chandrabhan Brahman)

شاہجہاں کے دور کا ایک اور ہم عصر اور بہت اہم مصنف چندر بھان برہمن ہے۔ چہار چمن شاہجہاں کے نظام حکومت اور اس کے حقیقی کام پر بہترین کام ہے۔ چندر بھان چار دیوانوں کے ساتھ تھا۔ اس سنگت نے ان کی حکومت سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں بہت مدد کی، سعد اللہ خان کے دور میں وہ فرمانانوی کے فرائض انجام دیتے رہے، جس سے ان کا شاہجہاں سے براہ راست رابطہ رہا۔ اس طرح وہ مغلیہ حکومت کی اندرونی ساخت اور پیچیدگیوں کا مکمل علم رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فارسی کے بھی بڑے عالم تھے۔ انہوں نے چہار چمن میں ان تمام بزیروں کی حالت بیان کی ہے جن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

2.3.5 اورنگ زیب کے عہد میں (During the Period of Aurangzeb)

محمد کاظم: عالمگیر نامہ (*Alamgir Nama* : Muhammad Kazim)

اورنگ زیب کے دور کا سرکاری مورخ محمد کاظم شیرازی ہے۔ اس نے اورنگ زیب کے پہلے دس سالوں کی تاریخ لکھی جسے عالمگیر نامہ کہا جاتا ہے۔ اس میں مشہور لوگوں کے تمام اہم واقعات اور حالات کو نوٹ کیا گیا ہے۔ دوسرے حکومتی مورخین کی طرح شیرازی کو بھی تمام درج تک رسائی حاصل تھی جس سے اس کی معتبریت ثابت ہوتی ہے۔ انہیں ان چیزوں کی چھان بین کا خصوصی حکم دیا گیا جن کا درج میں ذکر نہیں تھا۔ اسے بادشاہ سے مشورہ لینے کی بھی آزادی دی گئی۔ شیرازی نے کھلے عام اورنگ زیب کی تعریف کی ہے اور ان کے بھائیوں کو 'بیشوقہ' (ناقابل عزت) 'ناشوجا' (بزدل)، تزیم کہہ کر طعنہ دیا ہے۔ شاہجہاں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے لیکن برا بھلا نہیں کہا گیا۔ اورنگ زیب کی مخالفت کرنے والے شرفا کو بھی اچھے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ کاظم نے بڑھتی ہوئی قیمتوں، کھیتی کے بگڑتے حالات اور سیلاب کا ذکر کیا ہے۔ اورنگ زیب کو یہ سب باتیں پسند نہیں تھیں۔ اس لیے اس نے سرکاری طور پر تاریخ لکھنے پر پابندی لگا دی۔ لیکن ہمارے پاس اورنگ زیب کے زمانے کے سب سے زیادہ ذرائع ہیں۔

واقعاتِ عالمگیری: عقیل خان رازی (*Waqiat-i-Alamgiri* : Aqil Khan Razi)

عاقل خان رازی نے واقعاتِ عالمگیری لکھی جس میں تخت نشینی کی لڑائی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کیونکہ اس نے اس جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

سجان رائے بھنڈاری: خلاصۃ التواریخ (*Khulasah-ut-Tawarikh* : Sujan Rai Bhandari)

اورنگ زیب کے ہم عصر سجان رائے بھنڈاری نے خلاصۃ التوارخ لکھی۔ یہ ہندوستان کی تاریخ ہے جو شاہجہاں کی وفات (1666) پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں اورنگ زیب کے دور کی معاشی حالت، ریاستوں کی جغرافیائی حدود اور روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ہندوستان کے دو دروازوں کے طور پر کابل اور قندھار سے گزرتا ہے۔ شاید ابوالفضل کے بعد بھنڈاری واحد مورخ تھے جنہیں تاریخی جغرافیہ کا صحیح علم تھا۔

منتخب اللباب: خافی خان (*Muntakhab-ul-Lubab* : Khafi Khan)

اورنگ زیب کے دور کا تنقیدی بیان ہے۔ انہوں نے مغلوں کے ہاتھوں کسانوں پر ظلم و ستم کی شدید مخالفت کی۔ اس میں لکھا ہے 'رعایا مغلوں کے نام سے ڈرتی تھی۔' انہوں نے دکن کے حالات پر بھی تنقید کی ہے۔ اپنے تجربات کی بنیاد پر وہ مغل سلطنت کے زوال کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔

ایشورداس ناگر: فتوحات عالمگیری (*Futuhat-i-Alamgiri* : Ishwar Das Nagar)

یہ اورنگ زیب کے 34 سال پرانی ہے۔ راجپوتوں بالخصوص راٹھوروں کے ساتھ اورنگ زیب کے تعلقات کو پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ اس موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ اس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ 1691۔92 تک اورنگ زیب کی پالیسیاں ناکام ہو چکی تھیں اور امراء اپنی آزاد مملکت کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ لکھتے کہ ایک بار ایک حجام شہاب الدین خان کے بال بنا رہا تھا۔ خان نے شیشے میں دیکھتے ہوئے حجام سے پوچھا "ہم کیسے لگ رہے ہیں؟" حجام نے جواب دیا کہ جناب ایسا مکرم چہرہ تخت پر ہونا چاہیے۔ اس کہانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حجام بھی اس صورت حال سے سمجھ سکتا تھا کہ تخت محفوظ نہیں اور کوئی بھی امیر اس پر قبضہ کر سکتا ہے۔ یہ مفروضہ اورنگ زیب کی موت کے بعد سچ ثابت ہوا اور شہاب الدین خان اور ذوالفقار خان نے اپنے آزاد حکمراں قائم کر لیے۔

نسخۂ دلکشا: بھیم سین (*Nuskha-i-Dilkusha* : Bhim Sen)

اس کے مصنف بھیم سین سکسینہ کائستھ تھے۔ مغلوں کی نوکری چھوڑنے کے بعد وہ راؤ دلپت بندیلا کا ملازم ہو گیا۔ راؤ اورنگ زیب کے منصبداروں میں سے تھے جو مراٹھوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس کے پیش کنندہ ہونے کے ناطے، بھیم سین ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے سماجی، سیاسی اور معاشی صورتحال کو تفصیل سے بیان کیا۔ انہوں نے دکنیوں کے لباس، رسم و رواج اور کھانے پینے کی عادات کو کھل کر بیان کیا ہے۔

بھیم سین نے مغل فوج کی کمزوری، افسروں کی باہمی حسد اور امراء کی بد عنوانی کو بڑی فصاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ رشوت ایک عام سی بات تھی۔اس سلسلے میں انہوں نے اپنے چچا کی مثال قائم کی ہے۔ ہمیں نسخہ دلکش سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل افواج نے فصلوں کو تباہ کیا، کسانوں کو زمین چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کیا۔ بہت سے کسان باغی مراٹھوں میں شامل ہو گئے۔ نتیجتاً زمین سے تانبے کے سکے بھی جمع نہیں ہوتے تھے جو سونا دیتی تھی۔ مصنف نے دکن میں اورنگ زیب کی سرگرمیوں کو بغیر کسی تعصب کے بیان کیا ہے۔

معاصرِ عالم گیری: حاتم خان (*Maasir-i-Alamgiri* : Hatim Khan)

حاتم خان نے کاظم شیرازی کی طرز پر معاصرِ عالم گیری لکھا جس میں پہلے دس سال کی حالت بیان کی گئی ہے اور ستنامی بغاوت کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔اس کے بعد افسران کے تبادلے، تقرری اور ترقیوں پر بھی بات ہوئی ہے۔اسی لیے سر جادو ناتھ سرکار نے اسے 'مغل ریاست کا گزٹیئر' کہا ہے۔

2.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغلوں کے عہد میں فارسی سرکاری زبان تھی اور حکومت کے تمام کام فارسی میں انجام پاتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ تمام سرکاری ملازمین فارسی جانیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ ہندو اہل کاروں نے بھی فارسی زبان سیکھی اور کئی لوگوں نے عمدہ تاریخیں تصنیف کیں۔ جن میں بھیم سین، ایشور داس ناگر اور سجان رائے بھنڈاری قابل ذکر ہیں۔اس اکائی میں ہم نے مغل عہد کے اہم فارسی نگارشات کا سرسری جائزہ لیا اور اہم فارسی تاریخی کتابوں اور ان کی طرزِ تحریر سے واقفیت حاصل کی ہے۔ان ذرائع کے علاوہ مغلیہ دور میں اور بھی کئی قسم کا مواد جمع کیا گیا تھا۔تاریخ لکھنے میں مدد کرتا ہے۔خاص طور پر حکمرانی کے نظام کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے لیے ایسے دستاویزات کی مدد لینا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ دستور العمل، وقائع، رپورٹ، مکتوبات وغیرہ اس زمرے میں اہم ہیں۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے دور میں اس طرح کے ذرائع وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔

2.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

تذکرہ : یادداشت اور ذاتی مشاہدے کے ذریعے لکھے گئے کسی شخص کے احوال

تزک : کسی کی سوانح عمری جو عام طور پر اس شخص کی خود لکھی ہوئی ہوتی تھی۔

نامہ : کسی شہنشاہ سے منسوب اس کے وقت کا تاریخی روزنامچہ

دستور العمل: قوانین وضوابط کی کتاب

وقائع : اہم واقعات کا لیکھا جوکھا

مکتوبات : خطوط

2.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. تذکرہ کسے کہتے ہیں؟
2. تزک سے کیا مراد ہے؟
3. نامہ کیوں تصنیف کیے جاتے تھے؟
4. دستور العمل کسے کہتے ہیں؟
5. وقائع سے کیا مراد ہے؟
6. ابوالفضل کی کتاب کا نام بتایئے۔
7. مکتوبات سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
8. خافی خان کی کتاب کا نام بتایئے۔
9. ہمایوں نامہ کس کی تصنیف ہے؟
10. تزک جہانگیری کس نے مکمل کی؟

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تزک بابری پر مضمون لکھیے۔
2. خافی خان پر ایک مضمون لکھیے۔
3. ہمایوں نامہ پر ایک مضمون لکھیے۔
4. تزک جہانگیری پر ایک مضمون لکھیے۔
5. معاصر عالم گیری پر ایک مضمون لکھیے۔

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ابوالفضل کی آئین اکبری پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. منتخب التواریخ پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. طبقات اکبری پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

2.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Alam, Muzaffar, and Subrahmanyam, Sanjay, *Writing the Mughal World*: *Studies on Culture and Politics*. Columbia University Press, 2012.
2. Hasan, Mohibbul (ed.), *Historians of Medieval India*. Meenakshi Prakashan, 1982.
3. Mukhia, Harbans. *Historians and Historiography during the Reign of Akbar*. Vikas Publishing House, 1976.
4. Bhattacharya, Sabyasachi, (ed.), *Approaches to History*: *Essays in Indian Historiography*. Indian Council of Historical Research, 2011.

اکائی 3۔ علاقائی سلطنتوں کے مآخذ

(Sources of Regional Sultanates)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 بہمنی سلطنت اوراس کے جانشین ریاستیں
3.3 وجے نگر سلطنت
3.4 شرقی سلطنت
3.5 بنگال سلطنت
3.6 گجرات اور مالوہ
3.7 راجستھان
3.8 سندھ وملتان
3.9 سکے
3.10 اکتسابی نتائج
3.11 کلیدی الفاظ
3.12 نمونہ امتحانی سوالات
3.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

3.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کے زوال کے ابتدائی دنوں میں ہی مختلف صوبائی طاقتوں نے خود کو مرکزی سلطنت سے الگ کر لیا اور اپنی خود مختار ریاستیں قائم کرلیں۔ یہ آزاد ریاستیں علاقائی ریاست کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ ان ریاستوں میں نہ صرف سیاسی طاقتیں پروان چڑھیں بلکہ سیاست کے ساتھ ساتھ معاشی، سماجی، ثقافتی اور ادبی میدانوں میں بھی اپنے عروج کو پہنچیں۔ ان ریاستوں میں بنیادی طور پر بہمنی، وجئے نگر، گجرات، راجستھان، خاندیش، مالوہ، جونپور، بنگال اور اڑیسہ وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ ان ریاستوں کے قیام کے بعد بے شمار ادیب، شاعر، معمار، موسیقار، فلسفی، صوفی وغیرہ دہلی سلطنت سے ہجرت کر کے ان ریاستوں میں پہنچے اور وہاں کے حکمرانوں نے انہیں پناہ دی اور فن کے مختلف شعبوں میں ان سے خدمات حاصل کیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ریاستوں میں بہت سی خوبصورت، مضبوط اور عظیم عمارتیں تعمیر ہوئیں اور ادب میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ادب نہ صرف فارسی زبان میں لکھا گیا بلکہ مقامی اور علاقائی زبانوں کا بھی بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔ ان زبانوں میں لکھنے کا کام بنیادی طور پر راجستھانی، مراٹھی، تیلگو، تامل، اودھی، میتھلی اور بنگالی زبانوں میں ہوتا تھا۔ جس کے نتیجے میں ان مقامی زبانوں کی بہت ترقی ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ صوفیوں کی ملفوظات، تذکرے اور مکتوبات کا مطالعہ بھی تاریخی اعتبار سے اپنا اہم مقام رکھتے ہیں۔ آثار قدیمہ میں مساجد، مقبروں، قلعوں، محلات، سکے اور نوشتہ جات وغیرہ کا ذکر بھی اہمیت کا حامل ہے۔ علاقائی حکمرانوں کے جاری کردہ سکے، فرمان اور تعمیر شدہ عمارتیں اس ریاست کی تاریخ جاننے کے لیے ہمارے اہم ذرائع ہیں۔ سکوں کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کیونکہ ان سکوں کی مدد سے ہمیں سلاطین کے دور حکومت کے بارے میں جاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر جونپور اور بنگال کے سلاطین کے دور حکومت کے بارے میں معلومات کے لیے ہمارے پاس یہ سکے ایک معروضی ماخذ کے طور پر موجود ہیں، جہاں تک ادب کی بات ہے تو اس سے متعلق مصنفین کی مختلف رائے ہیں۔

ان علاقائی سلطنتوں کی ابتدائی تاریخ جاننے کے لیے ہمارے پاس واحد ذریعہ فارسی ادب ہے جو بنیادی طور پر دہلی سلطنت کے عہد میں لکھا گیا تھا۔ جس میں تاج المآثر، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی، خزائن الفتوح، تاریخ مبارک شاہی وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض صوفی تذکرے اور ملفوظات بھی ان علاقائی سلطنتوں کی تاریخ جاننے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان میں سیر الاولیاء، فواد الفواد، اور خیر المجالس وغیرہ قابل تعریف ہیں۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- علاقائی سلطنتوں کے ادبی اور آثاری مآخذ کو سمجھ سکیں گے۔
- علاقائی سلطنتوں سے متعلق ان مآخذ کی سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور ثقافتی اہمیت جان سکیں گے۔
- علاقائی سلطنتوں میں تاریخ نویسی کی روایت کے ارتقا کو سمجھ سکیں گے۔

- علاقائی سلطنتوں میں ملفوظات اور مکتوبات کو بطور ماخذ استعمال کر سکیں گے۔
- علاقائی سلطنتوں کے سکوں کے مطالعہ سے تجارت اور معاشی ترقی کا پتہ لگا سکیں گے۔

3.2 بہمنی سلطنت اور اس کی جانشین ریاستیں (Bahmani Sultanate and Its Successor States)

بہمنی سلطنت کے ابتدائی دور میں جو ادب لکھا گیا اس پر شمالی ہند کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ مالوہ، گجرات اور خاندیش جیسی ریاستوں کے قیام اور دہلی سلطنت کے زوال کے بعد شمالی ہند کا جنوبی ہند سے رشتہ کچھ عرصہ کے لیے ٹوٹ گیا۔ جنوبی ہند کے حکمرانوں نے بیرونی مسلم ممالک سے اپنا رشتہ استوار کیا اور ان ممالک کے بہت سے فلسفی، صوفی، ادیب، شاعر وغیرہ نے بہمنی سلطنت کا رخ کیا اور یہیں پر آباد ہو گئے۔ نتیجتاً بہمنی سلطنت نے مختلف شعبوں میں بڑی تیزی سے ترقی کی۔

بہت سے بہمنی اور ان کی جانشین ریاستوں بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر، بیدر اور برار کے حکمراں علم و ثقافت کے عظیم سرپرست تھے۔ انہوں نے علوم وفنون کے میدان میں بہت دلچسپی دکھائی اور خود عربی، فارسی، تیلگو اور مراٹھی کے عالم تھے۔ یہاں سب کا تذکرہ ممکن نہیں، لیکن تاریخ سے متعلق چند اہم ادب کا ذکر کرنے سے یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ ان دکن کے مسلم حکمرانوں نے ادب کو فروغ دینے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے۔ بہمنی سلطنت کی ابتداء سے متعلق تاریخ پر لکھی جانے والی پہلی کتاب عصامی کی 'فتوح السلاطین' تھی۔ سلطان محمد بن تغلق (1325-1350ء) کے دور میں اسے اپنے دادا عزالدین عصامی کے ساتھ مجبوراً دہلی سے دیوگیری ہجرت کرنی پڑی۔ عصامی نے اس کتاب کی تصنیف 750 ہجری/دسمبر 1349ء میں شروع کی اور صرف 5 ماہ اور 9 دن کی قلیل مدت میں تقریباً 751 ہجری/مئی 1450ء کو مکمل کی۔ انہوں نے اس نظم میں دنیا کی مشہور کتاب شاہنامہ کے مصنف فردوسی اور نظامی گنجوی جیسے شاعروں کی نقل کی اور سلطان محمود غزنوی (997تا1030ء) سے لے کر اپنے ہم عصر سلطان علاؤالدین بہمن شاہ (1347تا1358ء) تک کی تاریخ لکھی۔ وہ اپنی زندگی کے 24 سال دولت آباد میں رہے۔ دولت آباد کے قاضی برہان الدین ان کے علم و عرفان سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں سلطان علاؤالدین کے دربار میں لے گئے۔ سلطان علاؤالدین بہمن شاہ کی سرپرستی میں عصامی نے اپنی مشہور تاریخی مثنوی تحریر کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'میں نے جو کچھ لوگوں سے سنا اور کتابوں میں پایا، اس کتاب میں لکھا۔ میں نے قدیم کہانیوں کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے بہت محنت کی۔ ہندوستان کے شہنشاہوں کے حالات عقلمند دوستوں سے حاصل کی۔ ہر ایک کے بارے میں تاریخ کا مطالعہ کیا'۔ عصامی کی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی بہت سی تحریریں جو عصامی کو دستیاب تھیں اب ناقابل رسائی ہیں، اس لیے عصامی کا کام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جب ہم محمد بن تغلق سے متعلق تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ ذہن میں رہے کہ عصامی محمد بن تغلق سے بہت بدظن تھے ظاہر ہے دہلی سے دولت آباد ہجرت کے دوران عصامی کے دادا کا انتقال ہو گیا تھا۔ عصامی کی یہ مثنوی تاریخ نگاروں کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ دکن کی تاریخ بالخصوص گلبرگہ اور بیدر کی بہمنی اور احمد نگر کی نظام شاہی کا حال جاننے کے لیے ایک اور اہم تصنیف 'برہان مآثر' ہے جو سید علی بن عزیزاللہ طباطبائی نے تحریر کی ہے۔ عزیزاللہ نے پہلے گولکنڈہ کے حکمراں محمد قلی قطب شاہ (1580تا1612)

اور پھر برہان نظام شاہ(1591-95) کی خدمت میں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے اس کتاب کی تالیف 1592ء میں مکمل کی۔ وہ سلطان محمد بن تغلق اور بہمنی سلطنت کے قیام کی تاریخ کے لیے عصامی کا مقروض ہیں۔

صوبوں کی تاریخیں لکھنے کا عمل، جو نظام الدین احمد بخشی نے 'طبقات اکبری' سے شروع کیا تھا، اسے فرشتہ نامی ایک معروف مصنف نے آگے بڑھایا، جسے بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ(1580-1627) کی سرپرستی حاصل تھی۔ محمد قاسم ہندو شاہ استر آبادی، جو فرشتہ کے نام سے مشہور ہیں، جوانی میں احمد نگر کے سلطان مرتضیٰ نظام شاہ(1565-88) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ احمد نگر میں ہی انہوں نے ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں اور صوفیاء کی تاریخ لکھنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن ضروری نصوص کی کمی کی وجہ سے انہیں بیجاپور منتقل ہونا پڑا۔ اور بیجاپور میں سلطان ابراہیم عادل شاہ سے متاثر ہو کر جو کہ خود ایک عالم تھے، فرشتہ نے گلشن ابراہیمی کی تحریر کی۔ فرشتہ نے گلشن ابراہیمی، جسے تاریخ فرشتہ بھی کہا جاتا ہے، ابراہیم عادل شاہ کو(1606-07) میں وقف کیا۔ تقریباً(1609-10) میں وہی کتاب دوبارہ عادل شاہ کو تاریخ نورس (نورس نامہ) کے نام سے وقف کی گئی۔ اس کتاب کو دیباچہ کے ساتھ 12 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مسلمانوں سے پہلے ہندو بادشاہوں کا تذکرہ دیباچہ کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہر حصے میں دیگر صوبوں کی تاریخ لکھی گئی ہے، مثلاً دکن کے چھ صوبے یعنی بہمنی، عادل شاہی، نظام شاہی، قطب شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی۔ ان کے علاوہ گجرات، مالوہ، برہان پور، بنگال، جونپور، سندھ، ٹھٹھہ، ملتان، مالا بار، کشمیر اور ہندوستان کے ممتاز صوفی بزرگوں کی تاریخ فرشتہ نے مرتب کی ہے۔

تاریخ فرشتہ کو مکمل کرنے کے لیے اس نے تقریباً 35 اہم کتابیں جمع کیں اور غالباً کچھ ایسے ذرائع استعمال کیے جو نظام الدین احمد بخشی کے پاس بھی دستیاب نہیں تھے۔ اس طرح یہ عہد وسطیٰ کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے ایک نادر نمونہ ہے، خاص طور پر دکن کی تاریخ، ان کے علاوہ کچھ اور دیگر اہم تصانیف جو ان خطوں کی تاریخ کو جاننے میں مدد کرتی ہیں ان میں قاضی نور اللہ کی 'تاریخ علی عادل شاہی'، 'فتوحاتِ عادل شاہی' مصنف فضونی استر آبادی، 'مآثر قطب شاہی' مصنف محمد بن عبداللہ نیشاپوری، 'جوامع الکلم' (خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے ملفوظات) مصنف سیّد خواجہ اکبر حسینی وغیرہ شامل ہیں۔

دکن کے سلطانوں کی طرح ان کے وزراء اور امراء نے بھی مسلم دنیا کے مختلف ممالک کے شاعروں اور ادیبوں کو دربار کی طرف راغب کیا۔ ان وزیروں میں سب سے نمایاں نام خواجہ عماد الدین محمود گاواں کا ہے۔ وہ خود فارسی زبان و ادب کے بڑے عالم سخصیت تھے۔ ان کے علمی و ظائف کی تصدیق ان کے خطوط کے مجموعہ 'ریاض الانشاء' سے ہوتی ہے۔ مولانا نور الدین عبدالرحمن جامی(1414-92) سے ان کا رابطہ تھا۔ انہوں نے بہت سے علماء، ادیبوں، شاعروں اور اولیاء کرام جیسے شرف الدین علی یزدی اور خواجہ عبید اللہ احرار، جلال الدین داوانی وغیرہ سے بھی خط و کتابت کی۔ اس مکتوبات کی تاریخی اہمیت میں اضافہ اس لیے اور ہو جاتا ہے چونکہ محمود گاواں نے دیگر مکتوب اپنے پڑوسی حکمرانوں کو بالخصوص گجرات اور مالوہ سے خوشگوار رشتۂ قائم کرنے کے لیے لکھیں۔ شیخ چاند بن حسین احمد نگري نے تفصیلی تعارف کے ساتھ اس کتاب کی تدوین کی اور اسے حیدر آباد سے 1948ء میں شائع کیا۔ محمود گاواں نے تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے بیدر میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ محمود گاواں کے قتل کے بعد جس تیز رفتاری سے بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہوا اس میں ادب کی تخلیق کے لیے کوئی جگہ نہیں بچی۔

3.3 وجے نگر سلطنت (Vijayanagara Empire)

1337ء میں ہری ہر (Harihar) اور بکا (Bukka) نامی دو بھائیوں نے وجے نگر سلطنت قائم کی تھی۔ یہ سلطنت 1337 سے 1565 تک پھلتی پھولتی رہی اور اس پر چار بڑے خاندانوں نے حکومت کی۔

1. سنگم خاندان (Sangama Dynasty)
2. سلوواخاندان (Saluva Dynasty)
3. تلوواخاندان (Tuluva Dynasty)
4. اراویدوخاندان (Aravidu Dynasty)

وہ خطہ جس پر وجے نگر کے حکمرانوں کا غلبہ تھا وہ کثیر لسانی تھا۔ تیلگو، کنڑ، تمل اور ملیالم اس خطے میں بولی جاتی تھی لیکن ساتھ ہی سنسکرت درباری زبان تھی اور چول دور سے متعدد بادشاہوں نے سنسکرت کی سرپرستی کی۔ رامائن اور مہابھارت جیسی مذہبی کتابیں جنوبی ہندوستان میں وجے نگر دور میں ہی لکھی گئیں۔ یہاں کے حکمراں خود علم دوست تھے اور بہت سے علماء، شعراء اور فلسفیوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ان بادشاہوں میں سلووانر سمہااور کرشنادیورائے قابل ذکر ہیں۔ سلووانر سمہانے راما بھیودیم(*Ramabhyudayam*) نامی ایک اساطیری کہانی لکھی، جس میں وجے نگر کے بادشاہوں کے شجرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کرشن دیورائے نے بہت سی مختلف زبانوں میں مثلاً تمل، تیلگو، سنسکرت اور کنڑا وغیرہ میں کتابیں لکھیں ، جن میں امکت مالیدا (*Amuktamalyada*)، جامبوتی کلیانم (*Jambavati Kalyanam*)، ستیہ ودوپرینائے(*Satyavadu Parinaya*)اور رسامنجری(*Rasa Manjari*) وغیرہ شامل ہیں، جو وجئے نگر کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتی ہیں۔ امکتمالیدا میں نظم کی ہیروئن گودادیوی(Goda Devi)، کلاسیکی طرز کے مطابق بھگوان ہری(Krishna) کی تصویر کو بناتے ہوئے دکھایا گیا ہے جس معلوم ہوتا ہے کہ مہذب خواتین مصوری میں بھی ماہر تھیں۔ زیورات اور ملبوسات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ شکسپتتی(*Shuka Saptati*/تیلگو ورژن) جو کدیری پتی(Kadiripati) کی تحریر کردہ ہے ایک بھکشنڈی(Bhikshuni) کو بیان کرتی ہے جس کا تعلق موچی برادری سے تھا۔ کالاپورنودیم(*Kalapurnodayam*) میں پنگلی سورنا(Pingali Surna) دلہن کے پہننے کے لیے زیورات کی ایک لمبی فہرست دی ہے۔ یہاں تک کہ سماجی اجتماعات اور تیوہاروں کو بھی بیان کیا گیا۔ خواتین ان سیاسی اور مذہبی اجلاس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں اور اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اشٹادگجا(آٹھ بہترین تیلگو شاعر) کرشنادیورائے کے دربار کی زینت بنتے تھے۔ جس میں الاسانی پیدانہ(Allasani Peddana) نامی شاعر کو بے مثال تھے، جنہیں تیلگو شاعری کا بابائے آدم یا آندھراکویتاپتامہ(‘Andhra Kavita Pitamaha’)کا خطاب دیا گیا اور انہوں نے کرشنا دیورائے کو منوچریتم (*Manucharitram*) نامی ایک نظم وقف کی تھی۔ کرشن دیورائے ان کی دانشوری سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے منوچریتم نظم کے وقف کے موقع پر نکالے گئے جلوس میں پیدانہ کی پالکی کو خود اٹھایا تھا۔ پیدانہ نے ایک اور چاٹو(Chatu) نظم لکھنے کا تیلگو انداز) نظم میں کرشنا

دیورائے کی اڑیسہ فتح کا ذکر کیا ہے۔ دیگر اس کے علاوہ، سلووانرسمہا کے درباری راجناتھ دنڈیما (Rajanatha Dindima) کی لکھی ہوئی تاریخی نظم 'سلووابھیودیم (*Saluvabhyudayam*) میں سلووانرسمہا اور وجئے نگر کے سابق بادشاہوں کی کامیابیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ مدورا (معبر) کے سلطان کے خلاف راجہ کے سپہ سالار سمبووارایا (Sambuva Raya) کے مہم کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ بکا اول کے دوسرے شہزادے کمپنا (Kampana) کی بیوی گنگا دیوی نے ایک تاریخی نظم لکھی جس کا نام 'مدوراوجیم یا کمپارایاچرتم (*Madhura Charitam/ Kamparaya Charitam*)' تھا، جس میں کمپنا کی مدورا کی فتح کا ذکر ملتا ہے۔

مقامی ادبی ذرائع کے علاوہ بہت سے غیر ملکی سیاحوں اور تاجروں نے بھی اپنے سفر ناموں میں وجئے نگر کے بادشاہوں کے انتظامی، معاشی، سماجی، مذہبی، ثقافتی، تعمیراتی اور بادشاہوں کے روزمرہ کے معمولات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان مسافروں اور تاجروں میں ڈوارٹے باربوسا (Duarte Barbosa)، ڈومنگو پایس (Domingo Paes)، فرناؤ نونیز (Fernao Nuniz)، عبد الرزاق سمرقندی، بارٹولومیوڈیاس (Bartolomeu Dias) اور نکولوڈی کونٹی (Niccola de Conti) وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو وجئے نگر کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے ایک انمول خزانہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ذریعہ جمع کردہ مواد کے استعمال میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ ان لوگوں نے وجے نگر کو اپنے ملک کے ثقافتی پس منظر کے ساتھ دیکھا جو موجودہ عصری منظر نامے سے بالکل مختلف ہے۔

شمالی ہندوستان کے برعکس، وجے نگر کے حکمرانوں نے اپنے آبائی ورثے اور کچھ مذہبی وجوہات کی بنا پر کثیر لسانی نوشتہ جات کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ان کی تحریریں مندر کی دیواروں، پتھروں، زمین کے عطیات، تانبے کی تختیوں اور سکوں کی شکل میں ہمارے پاس دستیاب ہیں۔ یہ نوشتہ جات وجے نگر سلطنت کے مختلف مقامات سے موصول ہوئے ہیں۔ یہ آثار قدیمہ کے باقیات وجے نگر کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے بہت اہم اور زیادہ قابل اعتماد ہے۔ ان ذرائع سے ہم وجئے نگر کے حکمرانوں کے مذہبی خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے دور کے انتظامی ڈھانچے، سماجی رسم ورواج، محصول، سیاسی اور معاشی زندگی کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ ان نوشتہ جات میں، دیورائے اول کے کالیشورم نوشتہ (کریم نگر ضلع میں مکتیشور مندر کے منڈپ پر کندہ) اور گجپتی شہزادوں رگھودیو اور امبری دیوا کے ورنگل (Warangal) قلعے کے نوشتہ جات وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

3.4 شرقی سلطنت (Sharqi Sultanate)

جیسا کہ اعجاز حسین صاحب (Syed Ejaz Hussain) نے اپنی تصنیف (*Shiraz-e-Hind : A History of Jaunpur Sultanate*) میں لکھا ہے، عہد وسطیٰ ہندوستان میں دہلی سلطنت اور مغل دور میں درباری اور غیر درباری تاریخیں لکھنے کی ایک مضبوط روایت رہی ہے۔ لیکن جونپور کی شرقی سلطنت کی تاریخ میں ہمیں ایسا دیکھنے کو نہیں ملتا، جب کہ شرقی سلطنت کے اہم مرکز

جونپور کو (شیر ازِ ہند) کے نام سے جانا جاتا تھااور جو دنیا کے مشہور علماء اور صوفیاء کا مرکز رہاہے۔اس کی ایک اہم وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ لودی سلطانوں کے دور میں خاص طور پر سکندر لودی کے عہد (1527-1489) میں جونپور کی بہت سی عمارتیں اور محلوں کو مسمار کر تباہ کر دیا گیا تھا۔اندازہ لگایا جاتاہے کہ ادب کے ساتھ بھی ایساہی سلوک اختیار کیا گیاہو جسکی وجہ سے ہمارے سامنے جونپور کی کوئی ترتیب وار تاریخ نہیں ملتی ہے۔

سلطنت دہلی اور شرقی سلاطین کے درمیان دشمنی کی وجہ سے دہلی سلطنت کے ممتاز مورخین نے بھی اپنی تحریروں میں شرقی سلطنت کو مناسب جگہ نہیں دی۔انہوں نے جو کچھ لکھاوہ بہت مختصر، سادہ اور افسانوی انداز سے بھرا ہے جس میں بنیادی طور پر **'تاریخ مبارک شاہی'**، **'واقعات مشتاقی'** اور محمد بہمد خانی کی **'تاریخ محمدی'** وغیرہ کا ذکر کیا جاچکاہے۔سب سے پہلے شرقی سلطنت کی ایک مختصر لیکن مستند درج نظام الدین احمد بخشی نے اپنی کتاب **'طبقات اکبری'** میں مرتب کی اور بعد کے مورخین نے جونپور پر جو کچھ بھی لکھاوہ زیادہ تر نظام الدین کی تاریخ پر مبنی تھا۔

اس کے علاوہ اکبر کے دور کے ایک امیر ملا تقی کی بیاض یاڈائری بھی شرقی سلطنت کی تاریخ پر اہم کردار ادا کرتی ہے جس کا تذکرہ بنگال کے حصے میں تفصیل سے آئے گا۔اس سب کے ساتھ ساتھ صوفی ادب بھی شرقی سلطنت کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی ورثے میں بہت اہم مقام رکھتے ہین۔ان صوفی ادب میں بنیادی طور پر مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے ملفوظات 'لطائف اشرفی' اور شیخ کے مکتوبات 'مکتوبات اشرفی'، عبدالقدوس گنگوہی جن کا تعلق چشتی صابری سلسلے سے تھا، 'انوار العیون فی اسرار المکنون' (شیخ عبدالقدوس کے روحانی پیر شیخ احمد حق رودولوی کا ملفوظات) اور 'رشد نامہ' کو مرتب کیا۔ شیخ کے مکتوبات 'مکتوبات قدوسی' اور ملفوظات 'لطائف قدوسی' جسے شیخ کے صاحبزادے اور خلیفہ شیخ رکن الدین نے مرتب کیا ہے، 'اخبار الاخیار' مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلوی، 'مرآۃ الاسرار' مصنف شیخ عبد الرحمان چشتی اور 'ماثر الکرام' مصنف میر سید غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ ہمارے شرقی خطے کے علم میں بے شمار اضافہ کرتے ہیں۔لطائف اشرفی کا مطالعہ کرنے پر ہمیں معلوم ہوتاہے کہ شیخ اشرف نے اپنے پیش رو چشتی صوفیاء کی تعلیمات اور نظریات سے کس طرح مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔خاص طور پر حکمراں طبقے کے ساتھ تعلقات کے موضوع پر۔ان کا خیال تھاکہ صوفیاں کو حکمراں اور حکمراں طبقے کے ساتھ خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے چاہئیں۔اس نقطۂ نظر کو درست ثابت کرنے کے لیے انہوں نے قرآن و حدیث سے مثالیں پیش کی ہیں۔شیخ کی طرف سے ابراہیم شاہ شرقی (40-1402) کو لکھے گئے خطوط نمبر 22، 23 اور 24 شیخ کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں۔ان صوفی تذکروں کا مطالعہ کرکے شرقی سلطنت کے لیے ہماری ایک مختلف سمجھ کا نظریہ پیدا ہوگا۔میاں محمد سعید جیسے مشہور مورخ نے جونپور کی تاریخ 'تذکرہ مشائخ شیراز ہند' اور *The Sharqi Sultanate of Jaunpur : A Political and Cultural History* کے تحریر کے لیے صوفی مواد کا بے شمار استعمال کیاہے۔فارسی ادب کے حوالے کے ساتھ ہمارے پاس کچھ غیر فارسی ذرائع بھی موجود ہیں جو شرقی سلطنت کے مطالعہ کے لیے بے مثال اہمیت رکھتے ہیں۔

اودھی، ہندوی اور برج کی کچھ دوسری قابل ذکر تحریریں جو مختصر مگر اہم معلومات فراہم کرتی ہیں، جو شرقی خطے کی تاریخ کے بارے

میں ہمارے موجودہ علم میں مختلف اضافہ کرتی ہیں۔ایسی ہی ایک اہم تصنیف 'کیرتی لتا'(*Kirtilata*)جو کہ متھلا کے اوینواڑہ بادشاہ کیرت سنگھ کے درباری شاعر ودیاپتی(Vidyapati) کی فارسی،اردو مثنوی جیسی طویل نظم ہے۔ودیاپتی، جنھوں نے ابراہیم شاہ شرقی کے دور میں جونپور کا دورہ کیا۔انہوں نے جونپور کی سماجی، معاشی اور ثقافتی زندگی کے بارے میں کیرتی لتا میں کچھ انمول معلومات پیش کی ہیں۔ جس سے بہار کے بھوجپور ضلع کے جگدیش پور اور ڈمراون راجپوت سرداروں اور جونپور کے شرقی حکمرانوں کے درمیان ان کے تعلقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جدید دانشور پرکاش جھا نے ودیاپتی پر تحقیق کی ہے اور 2019 میں *A Political History of Literature: Vidyapati and the Fifteenth Century* کے نام سے ایک کتاب شائع کی، جس کے مطالعہ سے ودیاپتی کی تحریروں کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

3.5 بنگال سلطنت (Bengal Sultanate)

1788ء سے پہلے عہدِ وسطیٰ بنگال کی کوئی مسلسل تاریخ فارسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔جب تک بنگال سلطنت دہلی کے ماتحت رہا، دہلی کے مرکزی اہم مورخین نے اپنی تحریروں میں دہلی اور بنگال سے متعلق موضوع کو جگہ دی۔ بعد میں نظام الدین احمد اور فرشتہ نے اپنی تحریروں میں بنگال کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بنگال کی ایک مسلسل تاریخ جو فارسی زبان میں 18ویں صدی کے آخر میں لکھی گئی تھی، اسے 'ریاض السلاطین' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ کتاب اودھ (موجودہ دور کے اترپردیش) میں بارہ بنکی ضلع کے زیدپور قصبہ کے رہنے والے غلام حسین سلیم جو بنگال کے مالدہ میں جاکر پوسٹل سکریٹری کے طور پر مقرر ہوا تھا، نے ایک انگریز افسر جارج اُڈنی کی درخواست پر ترتیب دی تھی۔

1787-88ء میں مرتب ہونے والی اس کتاب کو دیباچہ کے ساتھ چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دیباچے میں مصنف نے جغرافیائی تفصیلات کے ساتھ ساتھ بنگال کے قدیم بادشاہوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ پہلی جلد میں ان لوگوں کی تاریخ لکھی گئی ہے جنہیں دہلی کے سلطانوں نے بنگال پر حکومت کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ دوسری جلد میں بنگال کے آزاد بادشاہوں کی تاریخ، تیسری جلد میں تیمور کے ماتحت ناظمین کی تاریخ اور چوتھی جلد میں برطانیہ کے دور میں بنگال کی تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے زیادہ تر طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ کو اپنے ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ بہت سی اہم فارسی تصانیف کو مصنف نے نظرانداز کر دیا ہے یا وہاں تک اس کی رسائی نہ تھی۔ اس تصنیف میں تواریخ اور حقائق میں مزید کوتاہیوں کے ساتھ ساتھ تاریخ سازی کی معیاری روایات کو بھی نظرانداز کیا گیا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ کتاب بنگال کی تاریخ کے لیے ایک اہم ماخذ ہے۔

بنگال کی تاریخ جاننے کا ایک اور مگر ناقابل رسائی ماخذ میر تقی الدین کی 'ڈائری' ہے۔ یہ اکبر کا ہم عصر تھا اور عبدالرحیم خانخانہ کی خدمت میں بنگال کا سفر کیا۔ میر تقی کا تذکرہ نظام الدین احمد اور بدایونی کے ساتھ ساتھ جہانگیر (1608-28) نے بھی اپنی سوانح عمری 'تزک جہانگیری' میں کیا ہے۔ جہانگیر نے 1608ء میں میر تقی کو 'مورخ خان' کا خطاب دیا تھا۔ میر تقی نے اکبر کے دین الٰہی پر اپنا یقین ظاہر

کیا تھا۔ وہ ایک شاعر تھا اور اس نے اکبر کے لیے 'شاہ نامہ' نامی نظم بھی لکھی تھی۔ ان کی ڈائری اب ناقابل رسائی ہے لیکن اس کا ایک مختصر حصہ پٹنہ سے شائع ہونے والے اردو میگزین معاصر میں 1949ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ڈائری بنگال، تیرھوت اور جونپور کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے ایک اہم ذرائع ہے۔

ان کے علاوہ بنگال کی سماجی اور سیاسی تاریخ میں صوفی ادب کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان صوفی ادب میں اخبار الاخیار، مرآۃ الاسرار، 'معارج الولایت' مصنف شیخ غلام معین الدین عبداللہ اور شیخ مخدوم اشرف جہانگیر کے مکتوبات کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ شیخ کے مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ جب گنیش نامی ہندو بادشاہ نے بنگال پر قبضہ کیا تو اس وقت شیخ نور قطب عالم نے ابراہیم شرقی سے مدد کے لیے خط و کتابت کی تھی۔ لیکن بعد میں ہندو بادشاہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد شیخ نور قطب عالم اور ابراہیم شاہ شرقی کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایسے بہت سے واقعات کی معلومات ہمیں ان صوفی منابع سے ملتی ہیں۔ یہ صوفی ادب بنگال کی تاریخ کو جاننے میں ہماری بہت مدد کرتے ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

3.6 گجرات اور مالوہ (Gujarat and Malwa)

گجرات سلطنت کی بنیاد ظفر خان نے مظفر شاہ (11-1404) کا لقب اختیار کر 1450ء میں رکھی تھی۔ مظفری خاندان کے حکمرانوں نے علماء، شعراء اور صوفیاء وغیرہ کو بلا تفریق و ملت پناہ دی۔ اس کے نتیجے میں مسلم علماء کے ساتھ ساتھ ہندو اور جین مذہب کے دانشوروں اور شعراء نے گجرات کے سلاطین کے تعریف میں لاتعداد تحریریں لکھیں۔ مثلاً ادے راج (Udai Raaj) نے جو محمود شاہ بیگڑا (1458-1511) کے درباری تھے، نے سنسکرت زبان میں راج وِنود *Raj Vinod* نام سے ایک کتاب لکھی۔ اُدیے راج نے محمود شاہ کی تعریف کرتے ہوئے اسے ایک طاقتور، عظیم اور ہندو مت کا محافظ قرار دیا ہے، گویا وہ ایک کٹر ہندو بادشاہ ہو۔ اسی طرح کی ایک دوسری سنسکرت تصنیف گنگا داس پرتاپ ولاس (Ganga Das Pratap Vilas) مصنف گنگا دھر کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔
ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک بالخصوص فارس، یمن اور مصر کے بہت سے عالم اور مورخین نے بھی ان کی سلطنت اور دربار میں پناہ لی۔

'مراۃ سکندری' مصنف سکندر بن محمد منجھو، گجرات کی تاریخ کا ایک بہت اہم ادبی ماخذ ہے۔ سکندر منجھو نے کچھ وقت گجرات کے مغل صوبیدار مرزا عزیز کوکا کی خدمت میں گزارا اور مرزا عزیز کوکا کے ساتھ گجرات کے سلطان مظفر شاہ سوم کے خلاف جنگ بھی لڑی۔ 1617ء میں جب جہانگیر احمد آباد میں اپنا خیمہ لگایا ہوا تھا تو سکندر منجھو جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور جہانگیر اس کی حکمت اور علم سے بہت متاثر ہوا اور خود جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ سکندر منجھو کو گجرات کی تاریخ کا بہت اچھا علم ہے۔ سکندر نے تقریباً 1611ء میں اپنی تصنیف مکمل کی۔ اس کتاب میں گجرات کے سلاطین ظفر خان (مظفر شاہ اول) سے مظفر شاہ سوم (73-1561) کی وفات تک کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ یہ کتاب سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ گجرات کے فن تعمیر، سماج خصوصاً صوفی بزرگوں کی سوانح حیات اور گجرات کی ثقافتی تاریخ کے لیے ایک قابل قدر ذرائع ہے۔ مصنف نے بہت سے واقعات ذاتی معلومات کی بنیاد پر لکھے ہیں۔ اور اس وقت اس ادب کو مکمل کرنے

کے لیے سکندر منجھو نے بہت سے نا قابل حصول ادب کا سہارا لیا۔ 'ظفر الولہ بمظفر وآلہ 'مصنف حاجی الدبر بھی مراۃ سکندری سے بہت مستفید ہوئے تھے۔

گجرات اور مالوہ کی تاریخ جاننے کے لیے ایک اور اہم مقبول ذرائع 'ظفر الولہ بمظفر وآلہ' ہے جسے عبداللہ محمد بن عمر المکی المعروف حاجی اُدبیر نے 1605ء میں عربی زبان میں لکھا تھا۔ عبداللہ محمد تقریباً 1540ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ 15 سال کی عمر میں وہ اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آئے اور احمد آباد کو اپنا مسکن بنایا۔ 1559ء میں وہ ایک ابا سینیائی سردار محمد الغ خان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسی سردار کی طرف سے انہیں 'حاجی ادبیر' کا نام دیا گیا اور اسی نام سے تاریخ میں مشہور ہوئے۔ جب اکبر نے 1573ء میں گجرات کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کیا تو مصنف کے والد کو بہت سے وقفوں کا انتظام سونپا گیا۔ اور اس زمین کی آمدنی مکہ اور مدینہ بھیجی جاتی تھی جس کی ذمہ داری حاجی ادبیر کے سپرد تھی۔ جب مصنف کے والد کا انتقال ہوا تو وہ کچھ عرصے کے لیے خاندیش کے ایک سردار فولاد خان کی خدمت میں بھی خدمات انجام دیئے۔

اس کتاب کو مرتب کرنے کے لیے مصنف نے بہت سے اہم معاصر تصانیف کا استعمال کیا تھا جو موجودہ وقت میں ناپید ہیں۔ اس کتاب میں حاجی ادبیر نے سلاطینِ گجرات کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے تاریخی واقعات، سوانح عمری اور خاندانوں کی تفصیلات بھی دی ہیں۔ خصوصاً جونپور، مالوہ، خان دیش، گجرات اور دہلی کے سلطانوں کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ گجرات میں مصنف کی طویل خدمات اور ان تاریخوں کو نقل کرنے کی وجہ سے جواب نا قابل رسائی ہیں، ظفر الولہ بمظفر وآلہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مصنف نے مالوہ اور گجرات کے سلطانوں کے بارے میں جو واقعات بیان کیے ہیں اُن سے زیادہ کسی اور کتاب میں نہیں ملتے۔ اس طرح حاجی ادبیر زیادہ تر تاریخی تفصیلات کا واحد ذریعہ ہیں اور ان کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ یہ مقالہ 1910ء میں ڈینیسن راس نے حکومت برطانیہ کے لیے مرتب کیا اور لندن سے شائع کیا۔

مذکورہ ذرائع کے علاوہ کچھ پرتگالی احوال نامے بھی گجرات کی تاریخ کے اہم ماٰخذ ہیں۔ پرتگالی پندرہویں صدی کے آخر میں ہندوستان آئے تھے، اس لیے ان کے بیانات کا اپنا ایک خاص مقام ہے۔ جن میں ڈوارتے باربوسا (Duarte Barbosa) اور بارٹولومیو ڈیاس (Bartolomeu Dias) کا نام خاص طور سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں پرتگالی گورنر البوکرک کے خطوط کا ایک مجموعہ جو 'The Commentaries of the Great Afonso De Albuquerque, Second Viceroy of India' کے نام سے شائع ہوا ہے، مظفر شاہ ثانی اور پرتگالیوں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے بہت اہم مقام رکھتا ہے۔

تیمور کے حملے کے نتیجے میں تغلق سلطنت کے زوال سے شمالی ہندوستان میں ٹوٹ پھوٹ کا دور شروع ہوا۔ صوبائی گورنر، جو تغلقوں کے وفادار تھے، انہوں نے آخری تغلق سلطانوں سے بغاوت کر دی اور اپنے علاقوں میں آزاد حکمراں بن گئے۔ نتیجے کے طور پر، دلاور خان غوری (1392-1402) نامی ایک ممتاز امیر نے 1401ء میں مالوہ کی آزاد مملکت قائم کی۔ ہوشنگ شاہ (1406-35) اس گور سلطنت کا سب سے باصلاحیت، ممتاز اور مشہور حکمراں بن گیا۔ ہوشنگ شاہ کے بعد اس کے جانشین اپنی سلطنت کی حفاظت نہ کر سکے اور کچھ عرصے بعد

محمود خلجی نامی ایک رئیس نے 1436ء میں مالوہ میں خلجی خاندان کی بنیاد رکھی۔ وہ پوری مالوہ سلطنت میں سب سے طاقتور حکمراں بن گیا۔ جس نے گجرات، جونپور، میواڑ اور بہمنی سے مسلسل جنگ کی اور اپنی بہادری، فہم وفراست اور سفارت کاری سے ریاست کو محفوظ رکھا۔

اس علاقائی ریاست کے بارے میں ہمارے مشترکہ ماخذ نظام الدین اور فرشتہ کی تحریریں ہیں، اسی طرح مالوہ کی تاریخ گجرات کے اکثر منابع میں درج ہے، لیکن ان کے علاوہ مکتوبات اشرفی جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، شہاب حکیم کی 'مآثر محمود شاہی'، مراۃ سکندری، محمد بہماد خانی کی 'تاریخ محمدی'، نامعلوم مصنف کی 'تاریخ مظفر شاہی'، 'تاریخ نصیر شاہی' وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

3.7 راجستھان (Rajasthan)

راجستھان کی تاریخ کے اہم ترین ماخذ میں کھیات کا اہم کردار ہے۔ یہ مشہور تاریخی ادب ہے جس کی تحریر ہندوستان کے ان علاقوں میں رائج تھی جو اب راجستھان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کھیات تاریخی دستاویزات ہیں۔ کھیات چارن (درباری شاعر) کے ذریعے لکھا گیا دستاویز ہیں، جس میں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی جنگوں، قربانیوں اور بہادری کارناموں کی تاریخ شامل ہے۔ کھیات کو اکثر ان کے مصنفین کے ناموں سے جانا جاتا ہے، مثلاً 'Bankidas-ri-Khyat' یعنی شاعر Bankidas کی لکھی ہوئی کھیات۔ بانکی داس، مان سنگھ کے دربار کا ایک مقبول شاعر اور مورخ تھا۔ ان کے علاوہ چند مشہور درج ذیل کھیات ہیں۔ 'جیسلمیر کھیات'، 'دیال داس کھیات'، 'موہتا نینسی ری کھیات' اور 'دونگر پور کھیات' وغیرہ قابل ذکر ہے۔ نینسی کھیات کی شہرت اب تک حاصل کی گئی کھیاتوں میں سب سے اہم اور قابل اعتماد ہے۔ اس کے مصنف موہتا نینسی تھے جو جودھ پور کے مہاراجہ کے وزیر اعظم تھے۔ اس تین جلد کے کھیات میں دسویں سے سترھویں صدی تک راجستھان کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کا مفید مواد موجود ہیں۔ ابوالفضل کی طرح اس نے بھی راجستھان کے قیمتی اعداد وشمار مرتب کیے ہیں جو بہت اہم ہیں۔ اسی لیے بعض مورخین کا خیال ہے کہ نینسی کو راجستھان کی تاریخ میں وہی مقام حاصل ہے جو مغلوں کی تاریخ میں ابوالفضل کا ہے۔

'دیال داس کھیات' مصنف دیال داس 18 ویں صدی کے بیکانیر ریاستی دربار میں ایک معزز درباری، قابل اعتماد مشیر، ماہر سیاست دان، نیک مصنف اور شاعر تھے۔ اس کھیات میں مصنف نے راٹھوروں کی ابتداء سے لے کر مہاراجہ سردار سنگھ کے تخت نشین ہونے تک 1851ء تک کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ تاریخ عصری ریکارڈوں، فرمانوں، پٹوں اور کتابوں پر مبنی ہے۔ ان میں جودھ پور، بیکانیر اور جے پور کے قیام کی دلچسپ تفصیلات ملتی ہیں۔

ان کھیات کے علاوہ، دیگر ادبیات جیسے گنگا رام کا 'ہری بھوشن مہاکاوی'، نیاچند کا 'ہمیر مہاکاویا'، میروتنگ کا 'پربندھا چنتامنی'، چندر بردائی کا پرتھوی راج راسو، جیانک کا پرتھوی راج وجے، اکبر کے ہم عصر کچھ فارسی ادب اور راجستھان کے مختلف نوشتہ جات راجستھان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

3.8 سندھ وملتان (Sindh and Multan)

سندھ اور ملتان دونوں کا ذکر نظام الدین اور فرشتہ نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ لیکن مکمل سندھ کے مسلمان سلاطین کی تاریخ کا تذکرہ سب سے پہلے میر محمد معصوم جو اکبر کے درباری شاعر اور نظام الدین احمد بخشی کے دوست تھے، نے 'تاریخ سندھ یا تاریخ معصومی' کے نام سے مرتب ہے۔ اس نے سندھ پر عربوں کی فتح سے لے کر اکبر کے دور تک پورے سندھ مکمل کی تاریخ کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سندھ کی فتح، ہندوستان کے شہنشاہوں اور گورنروں کی تاریخ اور سمرا و سما خاندانوں کی تاریخ، ارگون خاندان کی تاریخ اور سندھ کی تاریخ 1574ء سے اکبر کی فتح (1599-1600) تک۔ میر محمد نے تاریخ کو بغیر کسی تعصب کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے سندھ کے چھوٹے چھوٹے تاریخی واقعات کو مرتب کر کے اپنی تاریخ تیار کی ہے۔

سندھ کی ابتدائی عرب حملے کی تاریخ کا ایک واحد معاصر ماخذ 'چچ نامہ' ہے جسے یو ایم داؤد پوتا نے ایڈٹ اور انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ کتاب دراصل فتح نامہ کے نام سے لکھی گئی تھی جسے غلطی سے چچ نامہ کہا جاتا ہے۔ قباچہ کے وقت علی بن حامد کوفی نے اس عربی کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا اور قباچہ کے وزیر عین الملک فخر الدین حسین کو وقف کیا اور موجودہ وقت میں فارسی ایڈیشن ہی دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ طاہر محمد نسیانی کی 'تاریخ بلدھ تھتہ المعروف بہ تاریخ طاہری'، مرزا محمد صالح ترخان بن سید جلال تتوی کی 'ترخان نامہ'، اور علی شیر قانع ٹھٹوی کی 'تحفۃ الکرام' وغیرہ سندھ اور ملتان کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

3.9 سکے (Coins)

سکوں کے مطالعہ کو انگریزی زبان میں Numismatics اور اردو میں علم مسکوکات کہتے ہیں۔ ہندستانی تاریخ کو نشان زد کرنے کے ثبوت کے طور پر مسکوکات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ ہو، چاہے سماجی ہو، ثقافتی ہو یا معاشی، تاریخ کا تعین ہو یا آثار قدیمہ کی سطحوں کا مطالعہ، ہر جگہ علم مسکوکات نے اپنا اہم کردار درج کیا ہے۔ سکوں پر نشان، نوشتہ، اور دھات کی جانچ نے ہندوستانی تاریخ کے تمام پیچیدہ سوالات کو حل کرنے میں مدد کی ہے۔ بعض اوقات سکے کی مدد سے نامعلوم حکمرانوں کی تاریخ کو ظاہر کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ہند و یونان کے حکمراں، کشان اور گپت حکمراں رام گپت کے بارے میں ان سکوں کے ذریعہ ہی ان کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ بنگال اور جونپور کے سلاطین کے دور حکومت کا معمہ بھی ان سکوں کی مدد سے حل ہوتا ہے۔ مسکوکات کے جدید محقق دانش معین کا خیال ہے کہ یہ عہد وسطیٰ کے سکے خصوصاً دکن کے سکے سیاسی تاریخ سے زیادہ ثقافتی، مذہبی اور فنی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے عادل شاہی اور نظام شاہی سکوں کی مثالیں دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ سکے کس طرح ان خاندانوں کے حکمرانوں کے شیعہ عقیدے کو ظاہر کرتے ہیں۔

دہلی سلطنت کے سلطانوں کی طرح مختلف علاقائی ریاستوں کے حکمرانوں نے بھی سونے، چاندی، تانبے اور کھوٹ (alloy) کے سکے جاری کیے تھے۔ بنگال میں الیاس شاہی اور حسین شاہی کے حکمرانوں نے سکے جاری کیے تھے۔ بنگال میں زیادہ تر سکے عربی میں کندہ پائے

جاتے ہیں جن میں سلطان کا نام، لقب، کلمہ اور خلیفہ کا نام کندہ ہوتا تھا۔ بنگال کے سکوں پر ایک خاص قسم کی تحریر نظر آتی ہے جس میں حروف کے اوپری حصے کو بہت لمبا لکھا جاتا تھا۔ اس طرز تحریر کو 'طغریٰ' کہا جاتا تھا۔ اور اس طرز کا استعمال جونپور کے کچھ سکوں پر بھی ملتا ہے۔ اعجاز حسین کے مطابق یہ طغریٰ طرز کے سکے بنگال کے سلطانوں کے سکوں کی طرز پر جاری کیے گئے تھے جنھوں نے سکوں کی طغریٰ طرز پر بھی مہر ثبت کی تھی۔ واضح رہے کہ سکے کا طغریٰ انداز فوج یا فوجی فتح کے مارچ کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بعض عربی حروف جیسے 'ا' اور 'ل' کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ مارچ کرنے والی فوج کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ابراہیم شرقی کا پہلا طغریٰ سکہ (823ھ/1420ء) کا ہے جو اس کی ترہوت اور بنگال میں فوجی مہم کے بعد جاری کیا گیا تھا۔ غالباً یہ طغریٰ انداز جو اس نے بنگال سے نقل کیا تھا ان جگہوں پر ان کی دو فوجی مہمات کی علامت تھی۔ جونپور کی شاہی ریاست میں پہلا سکہ ابراہیم شاہ شرقی کا ملتا ہے۔

گجرات کے سلطانوں نے کافی مقدار میں سکے جاری کیے تھے جن میں کچھ پر سلاطین کا مکمل نسب نامہ ملتا ہے جو اپنے آپ میں اہم ہے۔ امیتیشور جھا (Amiteshwar Jha) نے اپنی کتاب (*Bhartiya Sikke: Ek Aitihasik Parichay*) کے مطابق فارسی میں اشعار والا پہلا سکہ بھی گجرات سے نکلا جو سب سے پہلے محمد ثانی کے سکوں پر ملتا ہے۔ سونے کی کم تعداد اور تانبے کے سکے سب سے زیادہ جاری کیے گئے۔ مالوہ سلطنت میں ہوشنگ شاہ کے پہلے سکے ملتے ہیں۔ مالوہ سلطنت کے سکوں میں دو خاص چیزیں نظر آتی ہیں جو اسے اس وقت کے دوسرے سکوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ اول، اس کے زیادہ تر سکے مربع ہیں اور دوم، مالوہ کے سکوں پر بہت زیادہ آرائشی ڈیزائن نظر آتے ہیں۔ کشمیر کے سلطانوں میں سکندر شاہ اول (1414-1398) نے پہلی بار سکے جاری کیے لیکن اس کے تانبے کے سکوں پر کوئی نام نہیں ملتا اور ان کی شناخت سکوں پر لکھی ہوئی تاریخ سے ہوتی ہے۔ ان سکوں کے علاوہ کشمیر کے حکمرانوں نے سونے کے دینار یا مہریں، 'سسنو (Sasnu)' کے نام پر چاندی کے مربع سکے، 'پکچھی یا کسیرا (Pakshi/Kasera)' کے نام پر تانبے کے سکے جاری کیے۔ زین العابدین کے زمانے سے کشمیر کے تانبے کے سکوں کے درمیان میں رسی کی گرہ کا ڈیزائن اپنایا گیا جو کشمیر کے علاقے میں تانبے کے سکوں کی خصوصیت بن گیا۔

جہاں تک دکن کی سلطنتوں کا ذکر ہے، وجے نگر و بہمنی اور بہمنی کے زوال کے بعد آنے والی دیگر ریاستوں کا تعلق ہے، وہاں سونے، چاندی، تانبے اور ان دونوں (چاندی اور تانبے) کو ملا کر (alloy) بنائے گئے سکے جاری کیے گئے۔ وجے نگر کے سونے کے سکے کو 'پگوڈا' نام دیا گیا تھا۔ چاندی کے سکے صرف دیورائے دوم کے پائے جاتے ہیں، جسے 'تار' کہتے ہیں۔ تانبے کے سکے کو مشہور سیاح عبدالرزاق نے جیتل کہا ہے، جو شائد حقیقی نام نہ ہو چونکہ دہلی سلطنت میں تانبے کے سکے کو جیتل کہا جاتا تھا۔ ہری ہر اوّل اور بکا اول کے سکوں پر 'ہنومان (Hanuman)' اور 'گروڑ (Garuda)' کی تصویریں کندہ تھیں۔ وجے نگر کے حکمرانوں نے اپنے سکوں پر ناگری، کنڑ اور تیلگو رسم الخط کا استعمال کیا، جو ان کی سابقہ ریاست چالو کیا اور ہویسال کے حکمرانوں میں بھی نظر آتا ہے۔

اسی طرح بہمنی، نظام شاہی، اور عادل شاہی وغیرہ نے سکے جاری کیے۔ بیجاپور کے پانچویں حکمراں عادل شاہ نے سب سے پہلے اپنے سکے جاری کیے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس نے سکوں پر اپنا نام نہ کندہ کر بلکہ چوتھے خلیفہ علی کا نام کندہ کروایا تھا۔ عادل شاہی حکمرانوں نے

ایک خاص قسم کے چاندی کے سکے نکالے جو بالوں سے جڑے ہوئے تراشوں (clip) کی طرح دکھائی دیتے تھے۔اس قسم کے سکے فارس میں 'لار' نامی جگہ سے نکلتے تھے اس لیے انہیں لاری کہا جاتا تھا۔ عادل شاہی حکمرانوں نے سونے کے چند سکے بھی نکالے۔ دکن کے مسلمان حکمرانوں کے زیادہ تر سکے تانبے کے پائے گئے ہیں۔اس طرح سے مسکوکات کے ذریعہ علاقائی ریاستوں کی تاریخ کا اہم علم حاصل ہوتا ہے۔

3.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو بہت سے اہم علاقائی ادب کے بارے میں مفید معلومات ملتی ہے۔ان ذرائع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقائی ریاستوں نے اپنے علاقے میں دہلی سلطنت کے ورثے کو قائم کرنے اور اس کے تحفظ کے لیے شدید کوششیں کیں۔ علاقائی بادشاہوں اور سلاطین نے بلا تفریق اپنی استطاعت کے مطابق ہر ایک کو اپنے دربار میں پناہ دی اور وہ درباری بھی پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ مثال کے طور پر ادیبے راج اور گنگادھر وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دہلی سلطنت کے مرکزی مصنفین کے برعکس علاقائی علماء اور مورخین نے ہندوستان کے عام لوگوں کی تاریخ لکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔انہوں نے اپنی تحریروں میں سماج کے تمام طبقوں کے مسائل کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس اکائی کا مطالعہ کرنے سے علاقائی ریاستوں کے جاری کردہ سکوں سے ان کی سماجی، سیاسی اور معاشی تاریخ حالات کے بارے میں اور ان کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ صوفی ادب کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کے خانقاہی نظام، صوفیاء کی روزمرہ کا معمول اور ان کی تعلیمات پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں معلوم ہوگا کہ صوفیاء اکرام اپنی خانقاہوں کے دروازے سبھی کے لیے ہمیشہ کھلا رکھتے تھے۔اور ان کی تعلیمات اور اخلاقیات کا ہی نتیجہ تھا کی گنگا جمنی تہذیب اپنے نقطہ عروج تک پہنچی۔اس اکائی سے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ ان علاقائی حکمرانوں کے ساتھ ان صوفیوں کے تعلقات میں کیسی تبدیلیاں آرہی ہیں جو اپنے آباؤاجداد صوفیاء سے مختلف تھے۔

3.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

ملفوظات : اولیاء، صوفی اور بزرگوں کے ارشادات، اقوال، وعظ و نصیحت کا مجموعہ۔

طغریٰ : ایک قسم کی کشیدہ کاری جو سکوں پر ہوتی تھی۔

مکتوبات : خطوط کا مجموعہ، مراسلے، مکتوب کی جمع ہے۔

سسنو (Sasnu) : کشمیری حکمرانوں کے جاری کردہ چاندی کے سکے کی ایک قسم

3.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

3.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ریاض السلاطین کے مصنف کون ہیں۔
2. وجے نگر کے تلوو اخاندان کی بنیاد کس نے رکھی۔
3. 'کیرتی لتا' کے مصنف کا نام بتائیں۔
4. مدوراوِجیَم نظم میں کس کی فتوحات کا ذکر کیا گیا ہے۔
5. 'جوامع الکلِم' کس صوفی کا ملفوظات ہے۔
6. فرشتہ نے اپنی کتاب 'تاریخ فرشتہ' کس سلطان کو وقف کی ہے۔
7. راج ونود نامی کتاب میں کس بادشاہ کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔
8. *Shiraz-e-Hind: A History of Jaunpur Sultanate* کتاب کس نے لکھی۔
9. کس خاندان کے حکمرانون کے سکوں پر ہنومان کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔
10. رشد نامہ کس کی تصنیف ہے۔

3.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. طغرئی طرز کے سکوں پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. شرقی سلطنت کی تاریخ کے لیے صوفی ادب کا مختصر احوال پیش کیجیے۔
3. وجے نگر سلطنت کے لیے غیر ملکی ذرائع کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
4. راجستھان کے کھیات ذرائع کی اہمیت کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
5. وجئے نگر کی تاریخ کے لیے غیر ادبی ماخذ پر ایک مضمون لکھیے۔

3.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. علاقائی ریاستوں کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے علم مسکوکات کی اہمیت اور افادیت پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔
2. گجرات اور مالوہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے ادبی ذرائع پر ایک مضمون لکھیے۔
3. تاریخ دکن کے مطالعہ کے ذرائع پر ایک نوٹ لکھیے۔

3.13 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. G.N. Sharma and V.S. Bhatnagar eds., *The Historians and Sources of History of Rajsthan*, Centre for Rajasthan Studies, Jaipur, 1992.
2. G.N. Sharma, *A Bibliography of Medieval Rajasthan*: *Society and Culture*, Lakshmi Narayan Agrawal, 1965.
3. H.K. Sherwani ed., *History of Medieval Deccan*, Andhra Pradesh Govt. Text-book Press, Hyderabad, 1974.
4. Mohammad Habib and Khaliq Ahmad Nizami eds., *A Comprehensive History of India*, Vol. V., People's Publishing House, Delhi, 1970.
5. S. Krishnaswami Aiyangar, *Sources of Vijayanagar History*, University of Madras, Madras, 1919.
6. Saiyid Athar Abbas Rizvi, *The Wonder That Was India*, Vol. II, Sidgwick and Jackson, London, 1987.
7. Jadunath Sarkar ed., *The History of Bengal*, Vol. II, B.R. Publishing Corporation, Delhi, 2003 (first published in 1943).
8. Syed Ejaz Hussain, *Bengal Sultanate*: *Politics*, *Economy and Coins* (*1205-1576*), Manohar, New Delhi, 2003.
9. Syed Ejaz Hussain, *Shiraz-i-Hind*: *A History of Jaunpur Sultanate*, Manohar, New Delhi, 2017.
10. Upendra Nath Day, *Medieval Malwa*: *A Political and Cultural History* (*1401-1562*), Munshiram Manoharlal, Delhi, 1965.
11. Robert Sewell, *A Forgotten Empire* (*Vijayanagar*): *A Contribution to the History of India*, Swan Sonnenschein and Co., London, 1900.
12. M.S. Commissariat, *A History of Gujrat*, 2 Vols., Longmans, Green and Co., London, 1938.

اکائی 4۔ ترکوں کی فتح کے وقت کا ہندوستان

(India on the Eve of Turkish Conquest)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید
4.1 مقاصد
4.2 سیاسی حالات
4.3 ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام
4.4 مرکزیت کا فقدان
4.5 ذات پات کی تفریق پر مبنی سماج
4.5.1 برہمن
4.5.2 کشتریہ
4.5.3 ویشیہ اور شودر
4.5.4 انتیج
4.6 چھوت یا چھوت چھات کا تصور
4.7 عورتوں کی حالت
4.8 ترکوں سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودگی
4.9 اکتسابی نتائج
4.10 کلیدی الفاظ
4.11 نمونہ امتحانی سوالات
4.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
4.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
4.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

4.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

4.0 تمہید (Introduction)

عہد وسطیٰ کے ابتدائی دور (نویں صدی تا بارہویں صدی) میں ہندوستان میں راجپوت سلطنت کا عروج ہوا۔ ذات پات کے نظام میں شدت آئی۔ راجپوت حکومت نے جاگیردارانہ نظام کو فروغ دیا اور ذات پات کے نظام نے سماج کو سخت کھانچوں میں بانٹ دیا تھا اور مشترکہ شہریت کے شعور کو ختم کر دیا۔ چنانچہ ترکوں کی فتح کے موقع پر ملک کی سیاسی و سماجی زندگی میں پیدا ہونے والی صورت حال نے ہندوستان کی غوری خاندان کے ذریعے (Ghurids) فتح کی راہ ہموار کی۔ دوسری طرف ترکوں کی مداخلت نے ہندوستانی نظام کی بنیادی کمزوری کو بے نقاب کر دیا اور بڑے پیمانے پر فوجی کاروائی کی حوصلہ افزائی اور مدد کی۔ اس دور نے گنگا کے میدانوں میں ترکوں کے بڑھتی ہوئے حملے دیکھے۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ترکوں کی فتح کے وقت کے ہندوستانی سماج کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ہندوستان کے سماجی نظام میں موجود کمزوریوں کے عناصر کو جان سکیں گے۔
- ترکوں کی ہندوستان آمد سے پہلے سماج کے جاگیرارانہ نظام کا ڈھانچے کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ترکوں کی فتح کے وقت عورتوں کی حالت کا جائزہ لے سکیں گے۔
- شمالی ہندوستان میں مسلم بستیوں پر روشنی ڈال سکیں گے۔

4.2 سیاسی حالات (Political Conditions)

1000 سے 1200 تک کے زمانے میں مغرب اور وسطی ایشیا کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی کافی تیز رفتار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انہی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہی اس زمانے کے آخر میں ترکوں کے لیے ہندوستان پر حملے کا راستہ کھل گیا۔ نویں صدی کے آخر میں عباسی خلفاء کا زوال شروع ہو چکا تھا اور ان کی سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور ان ترکوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ ترک نویں صدی میں محلوں کے محافظوں اور پیشہ ور فوجیوں کی شکل میں عباسی خلافت میں داخل ہوئے تھے لیکن وہ بہت جلد اتنے طاقتور ہو گئے کہ خلیفہ کے تقرر پر بھی اثر انداز ہونے لگے۔ مرکزی حکومت کے زوال پذیر ہوتے ہی صوبائی گورنروں نے خود کو خود مختار سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو فوجی سردار کسی علاقے پر اپنا آزاد تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے، خلیفہ نے انہیں امیر الامرا کا خطاب دیکھ کر کچھ عرصہ تک مرکزی اتحاد کا بھرم بنائے رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح کے سرداروں نے پہلے تو اپنے لیے امیر کا خطاب اور پھر بعد میں سلطان کا خطاب اختیار کر لیا۔

وسطی ایشیا کی طرف سے ترکوں کے مسلسل حملوں ترک سپاہیوں کی پیشہ وارانہ نوعیت جو کہ وفاداریوں کو تبدیل کرنے اور ناکام حکمراں کا ساتھ چھوڑ جانے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے تھے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان نیز مختلف علاقوں کے درمیان ہونے والے متواتر تصادموں کی وجہ سے اس عہد میں مسلسل بدامنی کا دور دورہ رہا۔ یکے بعد دیگرے سلطنتیں قائم بھی ہوتی رہیں اور ان کا زوال بھی ہوتا رہا۔ ایسی صورت حال میں وہ شخص ہی ابھر کر سامنے آ سکتا تھا جس میں ہمت و حوصلے کے ساتھ ساتھ قائدانہ صلاحیت، جنگی مہارت اور سازشوں کو ناکام بنانے کی قابلیت ہوتی تھی

ترک فاتحین اپنے ساتھ جنگ کی نئی روایت لائے۔ تیزی سے آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا، بجلی کی سرعت سے حملہ کرنا اور سامنے آنے والے گروہوں پر چھاپہ مار حملہ کرنا، ان کے جنگی طریقہ کار کے اہم اجزا تھے۔ وہ یہ کام اس لیے آسانی سے کر سکتے تھے کیوں کہ ان کے پاس عمدہ قسم کے گھوڑے تھے اور وہ خود بھی کافی جفاکش اور حوصلہ مند تھے اور اسی وجہ سے وہ گھوڑوں پر کافی لمبے فاصلے طے کر پاتے تھے اس اثنا میں گرجر پرتی ہار سلطنت کے زوال کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں سیاسی عدم استحکام کی صورت پیدا ہو چکی تھی اور جس کی وجہ سے اقتدار کے لیے ایک نیا تصادم شروع ہو چکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر ایک جارح اور توسیع پسند ترک ریاست کے قیام کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

راجپوت نام کے ایک نئے گروہ کے پیدائش کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ اس بحث سے قطع نظر پرتہار سلطنت کے زوال کے فوراً بعد ہی شمالی ہندوستان میں کئی راجپوت ریاستیں قائم ہوئیں۔ ان میں قنوج کے گہڑوال مالوہ کے پرمار اور اجمیر کے چوہان حکمراں سب سے اہم تھے۔ ملک کے مختلف حصوں میں کچھ دوسرے شاہی خاندان بھی تھے جن میں موجودہ جبل پور کے آس پاس کے علاقوں کے کل چوری بندیل کھنڈ کے بندیلے گجرات کے چالو کیا اور دلی کہ تومر وغیرہ خاندان قابل ذکر ہیں بنگال پہلے پال حکمرانوں کے اور پھر بعد میں سین حکمرانوں کے زیر تسلط رہا۔ قنوج کے گہڑوالوں نے دھیرے دھیرے پالوں کو بہار سے بے دخل کر دیا۔ اور بنارس کو اپنی دوسری راجدھانی بنا لیا۔ اس اثنا میں چوہانوں نے اجمیر میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے اور دھیرے دھیرے اپنی سلطنت کا دائرہ گجرات، دہلی اور پنجاب تک بڑھاتے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں ان کا ٹکراؤ گہڑوالوں سے ہوا۔ اس مقابلہ آرائی کی وجہ سے ہی راجپوت حکمراں پنجاب سے غزنوی فوجوں کو باہر کرنے کے لیے باہم متحد نہیں ہو سکتے تھے۔ بلکہ در حقیقت غزنوی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ اب اتنے طاقتور ہیں کہ اجین پر حملہ کر سکتے ہیں۔

راجپوت معاشرے کی بنیاد قبیلہ تھا۔ ہر راجپوت قبیلہ اپنی ابتدا کا سرچشمہ کسی نہ کسی فرضی یا حقیقی مورث اعلی کو مانتا تھا۔ عام طور پر ان راجپوت خاندانوں کا اقتدار ایک مخصوص علاقے پر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان علاقوں کا تعین بارہ یا چوبیس یا اڑتالیس یا چوراسی گاؤوں کی اکائیوں کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ ان علاقوں کے سردار اپنے ماتحت سرداروں کو گاؤں کی زمین سونپتا تھا اور وہ اس زمین کو بعد میں مختلف راجپوت سورماؤں کو ان کے کنبے اور گھر کے اخراجات کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ زمین اپنے کنبے اور اپنی عزت سے راجپوت کا لگاؤ اس کی خصوصیت تھی۔

راجپوت ریاست پر ایسے ہی راجپوت سرداروں کی مدد سے حکومت کی جاسکتی تھی جو عام طور پر راجہ کے یک جدی بھائی ہوتے تھے۔ اگرچہ ان کی جاگیروں کا سارادارومدار راجہ کی مرضی پر ہوتا تھا۔ لیکن راجپوتوں کا زمین کے پاک ہونے کا تصور زمین واپس لے لینے میں مانع آتا تھا۔ یہ زمین غداری، بغاوت یا اولاد نہ ہونے جیسے شاذ و نادر حالات میں ہی واپس لی جاتی تھی۔

راجپوت معاشرے کی تنظیم میں اچھائیاں اور برائیاں دونوں ہی تھیں۔ اس کی پہلی اچھایہ تھی کہ اس میں بھائی چارے اور برابری کا جذبہ بہت زیادہ تھا جو کہ راجپوتوں کی خصوصیت تھی۔ لیکن خامی یہ تھی کہ اس خصوصیت کی وجہ سے ان میں نظم وضبط قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ خاندانی لڑائی کئی پشتوں تک چلتی رہتی تھی۔ اس کی بنیادی کمزوریہ تھی کہ ان میں گروہ بندی کا جذبہ بہت ہوتا تھا اور ہر گروہ خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا تھا۔ وہ غیر راجپوت لوگوں کے ساتھ بھائی برادری کا رشتہ قائم کرنے کے لیے ہر گز تیار نہیں ہوتے تھے۔ اس کی وجہ سے راجپوت حکمراں طبقے، اور اکثریت والی غیر راجپوت رعایا کے درمیان دوری کا بڑھتی گئی تھی۔ راجستھان میں آج بھی راجپوتوں کی آبادی صرف تقریباً دس فیصد ہی ہے۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں بھی راجپوتوں کے تسلّط والے علاقوں میں کل آبادی میں راجپوتوں کا فیصد یا تناسب اس سے زیادہ نہیں رہا ہوگا۔

راجپوت جنگ کو کھیل سمجھتے تھے۔ جنگ کو کھیل سمجھنے کے رجحان نیز زمین اور مویشیوں پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کی بناء پر مختلف راجپوت خاندانوں کے درمیان مسلسل ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔ وہی حکمراں مثالی مانا جاتا تھا جو دسہرے کا تہوار منانے کے بعد بعد پڑوس کی ریاستوں کے علاقوں پر حملہ کرنے کے لیے اپنی کمان میں فوج لے کر نکل پڑتا تھا۔ اس پالیسی کے نتیجے میں گاؤں اور شہروں کے عوام کو مصیبتیں جھیلیں پڑتی تھیں۔

اس وقت کے بیشتر راجپوت حکمراں ہندومت کے حامی تھے جب کہ کچھ نے جین مت کی بھی سرپرستی کی۔ یہ راجپوت حکمراں برہمنوں اور مندروں کو بھاری عطیہ اور زمین دیا کرتے تھے اور برہمنوں کی مراعات نیز ذات پات کے نظام کے زبردست محافظ تھے یہی وجہ ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں برہمنوں سے زمین کی مال گزاری بہت کم شرح پر لی جاتی تھی۔ راجپوت ریاستوں میں یہ بندوبست، اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ یہ راجپوت ریاستیں جمہوریہ ہند میں شامل نہیں ہوگئیں۔ اس رعایت اور دوسری سہولیات کے بدلے میں برہمن ان راجپوتوں کو ان پرانے سوریہ ونشی اور چندر ونشی چھتریوں کی اولاد قرار دینے کے لیے بھی تیار ہوگئے جو کافی پہلے ختم ہو چکے تھے۔

آٹھویں صدی کے بعد کا اور خاص طور پر دسویں اور بارہویں صدی کے درمیان کا زمانہ شمالی ہندوستان میں عظیم الشان مندروں کی تعمیر کے نقطہ عروج کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ موجودہ کئی عظیم الشان مندر اسی عہد کی دین ہیں۔ مندروں کے جس طرز تعمیر نے اس عہد میں زیادہ قبول عام حاصل کیا اسے ناگر طرز تعمیر کہا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ طرز تعمیر ہندوستان بھر میں پایا جاتا ہے لیکن اس طرز تعمیر کے بڑے مرکز شمالی ہندوستان اور دکن میں تھے۔ اس طرز تعمیر کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کے خصوصیت یہ تھی کہ خاص مورتی کے کمرے کے اوپر جسے گربھ گرہ یا دیول کہتے تھے۔ یہ ایک اونچی چکر دار گول چھت ہوتی تھی۔ اس کا صدر کمرہ عام طور پر چوکور ہوتا تھا تاہم اسے ہر طرف سے آگے کو نکالا

بھی جاسکتا تھا۔ مورتی گاہ کے قریب ایک کمرہ (منڈپ) اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ مندر اونچی اونچی دیواروں سے بھی گھرے ہوتے تھے جن میں اونچے اونچے دروازے ہوتے تھے۔ اس طرز تعمیر کے مندروں کی نمائندگی مدھیہ پردیش میں کھجوراہو اور اڑیسہ میں بھونیشو کے مندروں سے ہوتی ہے۔ کھجوراہو کے پارشوناتھ مندر، وشوناتھ مندر نیز کندویا مہادیو مندر اس طرز کی بہترین مثال ہیں۔ ان مندروں کی شاندار اور نفیس نقاشی اور کندہ کاری سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں مورتی سازی کا فن بام عروج پر تھا۔ ان میں سے بیشتر مندروں کی تعمیر چندیل راجاؤں نے کرائی تھی جو کہ نویں صدی کی ابتداء سے تیرہویں صدی کے آخر تک حکومت کرتے رہے تھے۔

اڑیسہ میں لنگ راج کا مندر (گیارہویں صدی) اور کونارک کا سوریہ مندر (تیرہویں صدی) فن تعمیر کا ایک عظیم الشان اور خوبصورت نمونہ ہے پوری کا مشہور جگن ناتھ مندر بھی اسی عہد میں تعمیر کرایا گیا تھا۔ ڈرامے لکھے گئے۔ گجرات میں چالوکیہ راجا بھیم کا مشہور وزیر وغیرہ جیسے متعدد مقامات پر کافی تعداد میں مندر تعمیر کرائے گئے۔ جنوبی ہند کے مندروں کی طرح ہی شمالی ہند کے مندر بھی تمام تفصیلات میں مکمل ہوتے تھے اور ان کی تعمیر میں بڑی باریک بینی سے کام لیا تھا۔ سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بھی ہوتے تھے۔ ان میں سومناتھ جیسے کچھ مندروں میں کافی دولت بھی جمع ہو گئی تھی۔ متعدد گاؤوں پر ان مندروں کی عمل داری ہوتی تھی اور یہ مندر تجارتی اور کاروباری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔

راجپوت حکمرانوں نے بھی فنون لطیفہ اور عالموں کی پوری پوری سرپرستی کی۔ اس عہد میں راجپوتوں کی سرپرستی میں سنسکرت زبان میں کئی اہم کتابیں اور ڈرامے لکھے گئے۔ چالوکیہ راجا بھیم کا مشہور وزیر وستوپال خود کو مصنف ہونے کے علاوہ عالموں کا بہت بڑا سرپرست تھا اور اس نے آبو پہاڑ میں ایک خوبصورت جین مندر بھی تعمیر کرایا تھا۔

سنسکرت زبان کے مطالعہ کے دوسرے بڑے مرکز، پرمار راجاؤں کی راجدھانیاں، اجین اور دھار تھے۔ اب بھرنش اور پراکرت زبانوں میں کئی کتابیں لکھی گئیں جو اس علاقے کی زبانوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں جین عالموں کا بھاری تعاون رہا۔ ان میں سب سے مشہور تھے ہیم چندر، جنہوں نے سنسکرت اور اپ بھرنش، دونوں ہی زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ برہمن ازم کے احیائے نو کے ساتھ ہی اعلی طبقات میں اب بھرنش اور پراکرت کی جگہ پھر سنسکرت نے لے لی۔ تاہم ایسی زبانیں بھی، جو بول چال کی زبان کے قریب تھیں، رائج رہیں اور ان میں بھی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔ ہندی، بنگالی اور مراٹھی جیسی شمالی ہند کی جدید زبانیں ان عوامی زبانوں کے بطن سے ہی اسی عہد میں پیدا ہوئیں۔

4.3 ہندوستان میں جاگیر دارانہ نظام (Feudalism in India)

نظامی کے مطابق، راجپوت جاگیر داروں کے ساتھ سماجی، سیاسی اور معاشی میدانوں پر جاگیر دارانہ نظام کا تسلط تھا۔ ترکوں کی فتح کے وقت، ذیلی بیداری کا عمل شروع ہو گیا۔ بیشتر جاگیر داروں کے سامنت، ٹھاکر، راوت، بھوگھیک وغیرہ جیسے لگان دار تھے۔ اپنی فوج کو جمع

کرنے اور برقرار رکھنے اور ٹیکس عائد کرنے اور اس کے حصول کا جاگیر داروں کو اختیار کے نتیجے میں سیاسی اقتدار مکمل طور پر تقسیم ہو گیا اور اس سے مرکزی اقتدار سے گریز کے رجحانات کو حوصلہ ملا۔ اس عمل نے احکامات اور تحدیدی تقاضوں کو جنم دیا۔ ریاست میں اعلیٰ دفاتر کو جاگیر دار اشرفیہ نے اپنی اجارہ داری قائم کر دی۔ اس طرح بادشاہ کا اقتدار کمزور ہوا۔ جاگیر داروں کے درمیان جاری کشمکش نے مزید الجھن پیدا کر دی۔

4.4 مرکزیت کا فقدان (Absence of Centralization)

گرجر پر تیہار سلطنت کے زوال کے بعد، کوئی بھی ان کے مقام پر فائز ہونے کے قابل نہیں تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب، چھوٹی خود مختار ریاستوں کا ظہور ہونے لگا جیسے قنوج کے گرہوال، مالوا کی پرمار، گجرات کی چالوکیہ، اجمیر کی چوہان، دہلی کی تومار، بندیل کھنڈ کی چنڈیل وغیرہ۔ متحد رہنے سے دور رہتے ہوئی یہ ریاستیں اپنے چھوٹے علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئیں، اور مستقل طور پر اندرونی تنازعات سے دوچار رہیں۔ مرکزی اقتدار کا فقدان مسلح افواج کی طاقت اور کارکردگی کو مجروح کرنے کا ایک اہم عنصر تھا۔ ادب الحرب والشفاء میں فخرِ مدبر لکھا ہے کہ ہندوستانی افواج' جاگیر داروں پر مشتمل تھیں۔ ہر فوجی دستہ اپنے قریب ترین جاگیر دار یا سردار کی سربراہی میں تھا نہ کہ بادشاہ کی۔ اس طرح، فوج کے پاس 'متحدہ قیادت' کا فقدان تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ، صرف کچھ ذاتوں اور قبیلوں نے فوج کے پیشہ کو اختیار کیا تھا، اس وجہ سے زیادہ تر آبادی کو فوجی تربیت سے دور رکھا گیا تھا۔ اس سے ملک کی عام عوام ملک کے دفاع سے مکمل طور پر الگ ہو گئی۔ یہی سبب ہے کہ جب ضرورت پڑی تو ہندوستانی عوام شاذ و نادر ہی بادشاہ کی مدد کو آگے آئی۔ جسمانی آلودگی (چھوٹ) کے تصور نے فوجی استعداد میں کمزوری پیدا کر دی، چونکہ اس کی وجہ سے مزدوری کی تقسیم ناممکن ہو گئی؛ فوجیوں کو لڑائی سے لے کر پانی لانے تک کے سارے کام خود کرنا پڑتے تھے۔

4.5 ذات پات کی تفریق پر مبنی سماج (Society based on Caste Discrimination)

ورنا یا ذات پات کے نظام کے اصول نے گیارہویں اور بارہویں صدی میں ہندوستانی سماجی نظام کی بنیاد رکھی۔ محمد حبیب نے البیرونی کی تصنیف 'کتاب الہند' کی روشنی میں ہندوستانی سماج کے منظر نامہ کا، منواور کاوٹالیہ کو توثیقی شہادت کے طور پر استعمال کرتے ہوئے البیرونی کے بیانات کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے ترکوں کے حملوں میں ہندوستان کی ناکامی کی بنیادی وجہ ذات پات کے نظام کو بتایا ہے۔ شمالی ہند میں ترکوں کی فتح، کو ایک واقعہ میں بیان کیا جا سکتا ہے، 'ذات پات کا نظام اور جو کچھ بھی اس میں شامل ہے؛ ظالم اور مظلوم کی پستی، پجاریوں کا اثر و رسوخ، بادشاہوں کا سلطانی انداز، بدنصیب فرقوں کے ذریعہ بت پرستی، عوام کا معاشی اور روحانی استحصال، لوگوں کی ذیلی ذات کے سخت چھوٹے گروہوں میں تقسیم جس کے نتیجے میں عام شہریت یا پورے ملک سے وفاداری کے تمام احساسات کی مکمل تباہی ہوئی ہے۔ مشترکہ شہریت کے تمام احساسات کو ختم کر کے حب الوطنی کے جذبات کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ کے۔ اے نظامی لکھتے ہیں کہ ذات پات کے نظام میں پائے جانے والی بدعنوانی فرد اور معاشرہ ان دونوں کے نقطہ نظر سے اس کے نتائج کے خوفناک تھے۔ البیرونی کے مطابق، ہندو اپنی ذات کو ورنا کہتے تھے، یعنی رنگ، اور نسبی نقطہ نظر سے وہ اسے جاتکا (Jataka) یعنی پیدائش کہتے ہیں۔ ہندوستانی سماج میں سرِ فہرست چار ذاتیں تھیں۔ برہمن، کشیتریہ، ویشیہ اور شودر۔

4.5.1 برہمن (Brahman)

سماجی نظام میں برہمن سب سے اونچے مقام پر تھے۔ انہیں 'بنی نوع انسان کا بہترین ذات سمجھی جاتی تھی'۔ مذہب پر برہمن طبقہ کی خصوصی اجارہ داری تھی۔ البیرونی کے مطابق صرف برہمن اور کشتریہ ہی ویدوں کو پڑھ سکتے تھے اور اس لیے، موکش (نجات) بھی صرف انہی دو ذاتوں کے لیے ہے۔ ترکوں کے حملے سے پہلے ہندوستان میں بادشاہ کے دربار کے اعلیٰ عہدوں پر برہمنوں کا غلبہ تھا۔ البیرونی، جو ہندوستان میں برہمنوں کے ساتھ رہے اور کام کیا، لکھتے ہیں کہ، گیارہویں صدی کے برہمنوں کو نسبتاً گرمی کے اصولوں نے پابند بنادیا تھا۔ ایک برہمن، کسی برہمن یا کشتریہ کو پڑھا کر اپنی فیس وصول کرتا تھا، یہ فیس بطور تنخواہ نہیں بلکہ بطور تحفہ ہوتی۔ برہمنوں کو آسودہ حال خاندانوں کے پروہت (پجاری) کے طور پر تقرر کیا جاتا تھا۔ اس طرح برہمنوں نے سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔

4.5.2 کشتریہ (Kshatriya)

سماجی نظام کی ترتیب میں دوسرے درجہ پر کشتریہ آتے تھے۔ انہیں بھی ویدوں کو سیکھنے کی آزادی تھی، لیکن انہیں اس کی نہ ہی تعلیم دینے کا حق تھا اور نہ ہی کسی پجاری کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا حق تھا۔ کشیتریوں کو پرانوں کی رسم ادا کرنے کی اجازت تھی۔ انہیں ملک پر حکمرانی اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کا کام سونپا گیا تھا۔

4.5.3 ویشیہ اور شودر (Vaishya, and Shudra)

ویشیوں اور شودروں کو سماجی درجہ بندی میں ایک نچلا مقام دیا گیا تھا۔ ویشیہ بنیادی طور پر زمین کی کاشت، مویشیوں کی افزائش اور یا تو اپنا ذاتی کاروبار کرتے یا کسی برہمن کی جانب سے کاروبار کرتے تھے۔ البیرونی کے مطابق شودروں کی بھی یہی حالت تھی۔ ویشیہ اور شودر، تمام مذہبی علم سے محروم کر دیے گئے تھے۔ مختصراً یہ کہ البیرونی نے، شودروں کو برہمنوں کا نوکر بتایا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں، اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ کسی شودر یا ویشیہ نے وید پڑھی ہے، اس کی زبان کاٹ دی جاتی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حبیب لکھتے ہیں: 'رگ وید کے دور میں اس طرح کی پالیسی ضروری ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ لیکن گیارہویں صدی میں البیرونی، ابوسینا اور سلطان محمود کے دور میں، یہ احمقانہ، پاگل پن اور خودکشی کی بات تھی؛ اور برہمن جو خود ایک عقلی اور انتہائی روشن خیال گروہ تھے، کو سماجی گناہوں کی انتہائی ناقابلِ معافی بدترین قیمت ادا کرنا پڑ رہا تھا۔

4.5.4 انتیج (Antyaja)

ذات کے نظام کے ان چاروں کے نیچے انسانیت کا ایک غیر معروف گروہ تھا، جسے انتیاجا کہا جاتا تھا۔ ان کا شمار کسی ذات میں نہیں کیا جاتا تھا بلکہ وہ کسی خاص ہنر یا پیشے کے فرد تھے۔ ان میں آٹھ ذاتیں یا گروہ تھے؛ کپڑوں کو کلف دینے والے، موچی، جادوگر، ٹوکری اور ڈھال بنانے والا، بادبان ماہی گیر، جنگلی جانوروں، پرندوں اور بیا کا شکار کرنے والے۔ یہ تمام، چار ذاتوں کے گاوں یا شہروں کے قریب لیکن حدود کے باہر رہتے تھے۔ البیرونی آگے لکھتے ہیں کہ انتیاجا کو اپنی ذاتوں کے فرائض تبدیل کرنے یا چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی، اس سبب سے دوسری

ذات اختیار کرنے کی جاسکتی تھی۔

ہادی، ڈوم، چنڈال اور بدھاتو سماج کی نچلی ذاتیں تھیں۔ انہیں گاؤں کی صفائی جیسے دوسرے گندے کام تفویض کیے گئے تھے۔ ان کے متعلق البیرونی لکھتے ہیں کہ انہیں ناجائز اولاد سمجھا جاتا تھا اور ذات باہر کے فرد جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ شہر کی حدود میں انہیں رہنے کی اجازت نہیں تھی، اور صرف اطلاع کے بعد مقررہ اوقات میں صفائی ستھرائی کے اس معمولی کام کو انجام دینے کے لیے، داخل ہو سکتے تھے۔

4.6 چھوت چھات کا تصور (Concept of Untouchability)

ترکوں کی فتح کے وقت ہندوستان کے سماجی ڈھانچے پر چھوت چھات یا جسمانی آلودگی (pollution) کے تصور کے سب سے زیادہ تباہ کن اثرات پڑے۔ البیرونی نے لوگوں کی سماجی زندگی میں اس تصور کو ناگواری اور حیرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو نجاست کی حالت میں آتی ہے، اس کی پاکیزگی کی حالت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن آلودگی کا برہمنی تصور فطرت کے قائم کردہ اصول کے خلاف تھا۔ اگر کوئی مسلم کسی ہندو جنگجو کو قیدی بنالیتا، تو اسے فوری رہا کر دیا جاتا، اور اسے اس کی ذات یا گروہ سے خارج کر دیا جاتا۔ اس پیچیدگی نے ہندوستانیوں کو فطری طور پر اپنے خوفناک، تنگ نظری وجود سے اوپر اٹھنے سے روک دیا، جس نے بالآخر غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف لڑنے کے لیے سماجی نظام کو مفلوج کر دیا۔

'مجھے بارہا بتایا گیا کہ جب ہندو غلام (مسلم ممالک میں) فرار ہو جاتا ہے اور اپنے ہندو ملک اور مذہب کو لوٹ آتے ہیں، تو ہندو وں حکم دیتے ہیں کہ وہ جنگ کے ذریعہ روزہ رکھیں، کس طرح کفارہ ہوگا، پھر اس کے بعد وہ انہیں گوبر میں دفن کر دیتے تھے، باسی کی طرف لوٹتے اور گائیوں کا دودھ کچھ دنوں کے لیے دیتے، جب تک وہ خمیر کی حالت میں نہیں آجاتے کوشش کرتے۔ میں نے برہمنوں سے پوچھا کیا یہ سچ ہے، تو انہوں نے اس کی تردید کی، اور یہ ثابت کیا ہے اس طرح کے فرد کے لیے کوئی کفارہ ممکن نہیں ہے، اور اسے کبھی بھی زندگی کی اس حالت میں واپس آنے کی اجازت نہیں ہے جس حالت میں وہ پہلے تھا ایک قیدی کے طور پر۔ اور یہ کس طرح ممکن ہے؟ اگر ایک برہمن کسی شودر کے گھر میں مختلف دنوں میں کھانا کھاتا ہے، تو اسے اس کی ذات سے خارج کر دیا جاتا ہے اور دوبارہ اس کی واپسی ممکن نہیں رہتی۔'
(البیرونی، **کتاب الہند**، جلد دوم، باب 71 ، صفحہ 163)

ہندوستانی سماج کے ڈھانچے میں موروثی کمزوری کے مندرجہ بالا مشاہدے نے کچھ مورخین کو اسلام کی خصوصیات کے بارے میں بات کرنے پر مجبور کیا، جس نے ترکوں کو طاقت فراہم کی۔ وہ فتح یاب ہوئے اور ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی۔ ہندوستانی مورخین نے ترکوں کی کامیابی کا سراغ اسلام کے تخلیق کردہ مخصوص سماجی ڈھانچے میں لگایا ہے۔ اس تناظر میں جدوناتھ سرکار نے تین انوکھی خصوصیات پر زور دیا ہے جو اسلام نے عربوں، بربر، پٹھانوں اور ترکوں کو دیا تھا۔ سب سے پہلے اسلام کے اصول نے قانونی اور مذہبی حیثیت کے حوالے سے مکمل مساوات اور سماجی یکجہتی کی وکالت کی ہے۔ ہندوستان کے برعکس، ترکوں کو ایسی ذات پات میں تقسیم نہیں کیا گیا تھا جو ایک دوسرے سے

مخصوص تھیں۔ دوم، خدااوراس کی مرضی پر مکمل اعتماد جس نے انہیں مہم جوئی اور احساسِ مشن عطا کیا۔ آخر کار اسلامی نظریہ نے ترک فاتحوں کو شراب نوشی سے نجات دلائی جو سرکار کے مطابق راجپوت، مراٹھااور دیگر ہندوستانی حکمرانوں کی بربادی تھی۔ اس میں جو بھی جزوی سچائی ہو سکتی ہے، اس کی وضاحت بھی تاریخ میں ناکافی بنیادوں میں نظر آتی ہے۔

4.7 عورتوں کی حالت (Conditions of Women)

ترکوں کی آمد سے پہلے ہندوستانی سماج میں عورتوں کی حالت کا مطالعہ کرنا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ حبیب کا مشاہدہ ہے کہ منوسمرتی خواتین کے بارے میں توہین آمیز باتیں کرتی ہے اور ناپاک خواہشات، برا سلوک اور بددیانتی کے تمام ذرائع کو ان سے منسوب کرتی ہے۔ شادی کو ایک ضرورت سمجھا جاتا تھااور اگر کوئی لڑکی کچھ عرصہ غیر شادی شدہ رہی تو وہ سودرا(ورستی) ہوگئی۔ عورتوں کے لیے کچھ اور سخت اصول تھے جیسے طلاق کی اجازت نہیں تھی، بیوہ کی دوبارہ شادی کی ممانعت تھی، جب کہ بیوہ رہنا ممنوع تھا۔ ذات پات کے نظام کی درجہ بندی کی بنیاد پر مرد کی کئی بیویاں ہو سکتی تھی، ایک مرد کی کئی بیویاں ہو سکتی تھی، مثال کے طور پر کسی برہمن کی چار، کشیتریہ کی تین، ویشیہ کی دو اور شودر صرف ایک بیوی رکھ سکتے تھے۔ جب تک کسی مرد نے نچلی ذات کی عورت سے شادی نہیں کی اس وقت تک بین ذات شادی کو قانونی طور پر اجازت دے گئی تھی۔

بیوہ عورتوں کے بارے میں مطالعہ بتاتا ہے کہ انہیں دوبارہ شادی کی اجازت نہیں تھی۔ ایک بیوہ عورت کے پاس صرف دو انتخاب رہ جاتے، اول یہ کہ زندگی بھر وہ بیوہ ہی رہے یا دوسرے یہ کہ خود کو جلالے۔ بیشتر بیوہ عورتیں دوسرے انتخاب یعنی ستی ہو جانے کو ترجیح دیتیں کیونکہ بیوہ ہونے کی وجہ سے زندگی بھر اس کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا تھا۔ تاہم، اعلیٰ ذات یا طبقہ کی عورتیں مثلاً، ایک انتقال کر گئے بادشاہ کی بیوہ کو ستی ہونا ہی پڑتا تھا وہ چاہے یا نہ چاہے۔ لیکن بڑی عمر کی رانیوں اور جن کے بچے ہیں انہیں ستی سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔

ہندوستان کے ہندو، پردہ سے ناواقف تھے، لیکن یہاں فرقہ در فرقہ مختلف جنسی افتراق پایا جاتا تھا۔ محمد حبیب نے مختلف ذرائع جیسے منوسمرتی، بانا کی کہانی، ہیون سانگ کا سفر نامہ، سے واقعات کو نقل کیا ہے، جو پردہ کے متعلق کچھ اہم تصورات پو پیش کرتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ پردے کا رواج ترکوں کی آمد سے پہلے رائج نہیں تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ پردے کا رواج ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد رائج ہوا۔ "چونکہ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کا غلبہ ہو چکا تھا، اس لیے وہاں پردہ اور حجاب کا رواج تیزی سے بڑھنے لگا۔ جہاں مسلمانوں کا اثر و رسوخ کم تھا، وہاں پردہ اور حجاب کا رواج نہیں تھا، حتیٰ کہ آج بھی راجپوتانہ سے دکن تک یہ اس طرح کا کوئی رواج قائم نہیں ہے، یا اگر ہے بھی تو بالکل معمولی۔"

جہاں تک وراثت کے قانون کا تعلق ہے، عورتوں کو اس سے محروم رکھا جاتا تھا، لیکن وہ اپنا حقِ وراثت دوسروں کو منتقل کر سکتی تھیں۔ بیٹی کے حق کے بارے میں منوسمرتی کا حوالہ دیا گیا ہے جس کے مطابق اسے اپنے بھائیوں میں سے ایک چوتھائی کے برابر حصہ ملتا ہے جو

اس کی دیکھ بھال اور شادی پر خرچ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی شادی کے بعد وہ اپنے باپ کی جائداد پر دعویٰ نہیں کر سکتی۔ مرد کے ورثاء میں اولاد کے بڑھتے ہوئے دعوے زیادہ تھے۔

4.8 ترکوں سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودگی

(Presence of Muslims in India before the Arrival of the Turks)

ترکوں کی آمد سے پہلے ہی مسلمان، ہندوستانی سماج کا حصہ تھے۔ مسلمان تاجر، سوداگر، سنت وصوفی پرامن طور پر ہندوستان میں داخل ہوئے اور متعدد اہم مقامات پر رہائش پذیر ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان پر غوری کی فتح سے تقریباً نصف صدی قبل، الگ تھلگ مسلم تہذیبی گروہوں نے اس ملک میں اپنے قدم مضبوط جما لیے تھے۔ ترک کالونیاں رائے کی رضامندی سے بہت سارے بڑے شہروں کے مضافاتی علاقوں میں قائم کی گئیں، رائے نے مسلمانوں کو اپنے مکانات، مساجد، گوادام، دکانوں وغیرہ کی تعمیر کی اجازات دی اور ان کے قبرستانوں کے لیے بھی جگہ دی۔ یہ مسلمان مہاجرین نچلے طبقوں کے درمیان شہر کی حصار بندی سے باہر، اول ذات کی بندش، اور دوم، ہندوستانی عوام سے روابط قائم کرنے کی سہولت کی وجہ سے رہتے تھے۔

یہ بستیاں محض آبادی کے اضافہ کی وجہ سے پھیلنے لگیں، لیکن شاید شیخ علی ہجویری نے کہا تھا کہ "وہ غیر مہذب لوگوں (شاید غز لوگ) کی وجہ سے لاہور آیا تھا، وہ ان افراد کی ایک بڑی جماعت کے لیے بات کر رہا تھا جو فارس اور وسطی ایشیاء کے متواتر سیاسی طوفانوں کی وجہ سے اس ملک کی جانب رُخ کیا تھا، جہاں وہ پرامن طریقے سے روزی کما سکتے ہیں"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دور دراز کی سرزمین سے مسلمان تارکین وطن کے ہندوستان میں بس جانے کے نتیجے میں یہاں مسلم آبادی میں اضافہ ہوا۔

ترکوں کی آمد سے پہلے ہی مسلمان بستیوں کا وجود واضح ہو جاتا ہے جب ابنِ اثیر بنارس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ۔ "محمد بن سبکتگین کے زمانے سے اس ملک میں مسلمان موجود ہیں جنہوں نے اسلامی قانون کے وفادار اور نماز اور اچھے کام میں مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا ہے۔" مزید یہ کہ، بہرائچ میں سید سالار مسعود غازی کا مقبرہ تھا جو سلطان محمود کی فوج میں ایک سپاہی تھا۔ لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ غزنوی حملوں اور شمالی ہندوستان پر غوریوں کے قبضے کے درمیان طویل عرصے تک اس کا نام اور اس کی قبر باقی رہے، اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ قبر کی دیکھ بھال کرنے اور بعد کی آنیوالی نسلوں کے لیے سالار کی شہادت کی روایت کو برقرار رکھنے کچھ مسلم آبادی تھی۔

4.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مندرجہ بالا مشاہدات کے تناظر میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ترکوں کی فتح کے موقع پر ہندو معاشرہ اپنی تاریخ کے ایک انتہائی نازک مرحلے سے گزر رہا تھا۔ ذات پات کے نظام نے اسے اس متحرک توانائی سے محروم کر دیا تھا جو بحرانوں کے وقت معاشروں کو برقرار رکھتا ہے انہیں نئے حالات اور نئے چیلنجوں کا جواب دینے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ چھوت چھات کے تصور نے اس کے سماجی تانے بانے کو مزید

کمزور بنادیا تھا۔ شہری زندگی کی تمام سہولیات سے غیر ذات کے لوگوں کو جو ہندوستان کی کثیر آبادی پر مشتمل ہیں محروم کردیا گیا تھا۔ راجپوت معاشرے کا جاگیردارانہ ڈھانچہ جنگجو طبقے کی کمزوری کی بنیادی وجہ تھا۔ قبیلوں کی دشمنیوں اور جھگڑوں نے اتحاد کے عمل کو روکا، اور ذات پات کا امتیاز راجپوتوں کے نچلے طبقے کو اشرافیہ طبقے کے میل جول سے باز رکھا۔ اس منظر نامہ میں اس جاگیردار راجپوت حکومتوں کا طویل عرصے تک چلنا ناممکن تھا۔ یہ اس کی بنیادی وجہ بن گئی کہ مسلم یلغار کے پہلے جھٹکے نے راجپوت ہندوستان کو اپنی بنیادوں پر ہلا کر رکھ دیا۔ عورتوں کی حالت بھی اطمینان بخش نہیں تھی۔ ترکوں سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودگی سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اور مذہب ہندوستان کے لیے کوئی نامانوس نہیں تھا۔

4.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

راجپوت	:	ایک جنگجو گروہ جو یا تو باہر سے آیا تھا یا مقامی سرداروں کے برہمنی نظام میں شامل ہونے سے بنا تھا۔
عباسی خلافت	:	749ء سے 1258ء تک اسلامی دنیا پر حکومت کرنے والا ایک خاندان۔
امیر الامرا	:	کسی بڑے امیر کو اس کی خدمات کے عوض دیا جانے والا لقب
چھاپہ مار حملہ	:	گوریلا طرز جنگ جس میں ضرب لگاؤ اور بھاگو کے اصول پر جنگ لڑی جاتی تھی۔
ناگر طرز تعمیر	:	شمالی ہند میں رائج ایک طرز تعمیر جس میں گربھ گرہ کے اوپر بلند مخروطی شکھر یا ومان ہوتا تھا۔
گربھ گرہ	:	مرکزی مورتی رکھنے کی جگہ

4.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. جاگیردارانہ نظام سے کیا مراد ہے؟
2. برہمن کون تھے؟
3. کشتریہ کون تھے؟
4. ویشیہ کون تھے؟
5. شودر کون تھے؟
6. انتیج کون تھے؟
7. امیر الامرا کسے کہتے ہیں؟
8. چھاپہ مار حملہ کیا ہوتا ہے؟
9. ناگر طرز تعمیر سے کیا مراد ہے؟

10. گربھ گرہ کسے کہا جاتا ہے؟

4.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ترکوں کی فتح کے وقت جاگیردارانہ نظام پر نوٹ لکھیے۔
2. ترکوں کی فتح کے وقت عورتوں کی حالت پر گفتگو کیجیے۔
3. ہندوستانی سماج میں ذات پات کی تفریق سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
4. آپ کو کیوں لگتا ہے کہ چھوت کے تصور نے ہندوستانی سماج پر تباہ کن اثر ڈالا؟
5. اسلام کی خصوصیات کے بارے میں لکھیے۔

4.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جاگیردارانہ نظام کس طرح ہندوستانی حکمرانوں کے اقتدار کا لامرکزیت کا باعث بنا۔ وضاحت کیجیے۔
2. آپ کے خیال میں ستی کا رواج ہندوستان میں کیوں رائج تھا؟ تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. ترکوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودگی پر ایک نوٹ لکھیے۔

4.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. K.M. Ashraf, *Life and Conditions of the People of Hindustan*, Munshiram Manoharlal, Delhi, 1970.
2. K.A. Nizami ed., *Politics and Society during the Early Medieval Period*, Collected Works of Professor Muhammad Habib, Vol. I, Centre of Advanced Study, Department of History, Aligarh Muslim University, People's Publishing House, 1974.
3. Eshwari Prasad, *A Short History of Muslim Rule in India from the Conquest of Islam to the Death of Aurangzeb*, The Indian Press Ltd., Allahabad (second edition).
4. Sachio, Edward C., *Alberuni's India*, Two Vols., Kegan Paul, Trench, Turner and Co. Ltd., London, 1910.

اکائی 5۔ دہلی سلطنت: ریاست کی نوعیت

(Nature of State during the Delhi Sultanate)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید
5.1 مقاصد
5.2 ریاست کی تفہیم
5.3 ریاست کی تفہیم کے اہم ماخذ
5.3.1 فخرِ مدبر کی آداب الحرب والشجاعۃ
5.3.2 ضیاالدین برنی کی فتاوائے جہانداری
5.4 ریاست کی نوعیت پر جدید مورخین کے نظریات
5.5 اکتسابی نتائج
5.6 کلیدی الفاظ
5.7 نمونہ امتحانی سوالات
5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

5.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کی تشکیل کا عمل 1206 میں قطب الدین ایبک کے اقتدار میں آنے کے ساتھ شروع ہوا۔ تاہم یہ صرف التمش کے دور میں ہی تھا کہ دہلی کی سلطنت حقیقی معنوں میں غزنی کے حکمرانوں کے کنٹرول سے آزاد ہوئی۔ اسلامی عقائد، خیالات اور روایات کا اثر دہلی سلطنت کے حکمرانوں پر پڑنا ناگزیر تھا لیکن انہوں نے ان افکار خیالات کو اپنی ذاتی دلچسپی تک محدود رکھا۔ انہوں نے حکمراں اشرافیہ کے اندر

موجود مختلف غالب گروہوں اور مقامی چیلنجوں کے درمیان توازن قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ جو بنیادی طور ریاستی امور کو چلانے کے نہ صرف ذمہ دار تھے بلکہ اہم امور پر فیصلہ کا اختیار رکھتے تھے۔ لہٰذا عہد وسطیٰ کے زیادہ تر مورخین نے دہلی سلطنت کو غیر مذہبی بتایا ہے۔

دہلی کی ریاست اپنے کردار کے لحاظ سے رسمی طور اسلامی ضرور تھی۔ لیکن اس کی بنیاد نہ تو اسلامی نظام شریعت کے سماجی مساوات پر تھی اور نہ ہی قران وحدیث اس کا ضابط حیات تھے۔ اس کے برعکس یہ ریاست سیاسی سماجی اور طبقاتی درجہ بندیوں پر قائم تھی۔ جس می شریعتِ اسلامیہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پروفیسر ستیش چندر کے مطابق "درحقیقت عملی طور پر عوام الناس کے طرز حیات اور بود و باش کے طور طریقوں میں ہندو یا مسلمان میں بہت کم فرق تھا۔ کسی تحریری قانون یا آئین کی عدم موجودگی میں سلطنت دہلی میں ریاست حکمرانوں کی حکمت اور سیاسی عملیت کے مطابق چلتی تھی۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ 13 ویں صدی کے آغاز میں جب ریاست اپنے ابتدائی مرحلے پر تھی، ریاست کے تحفظات 14 ویں صدی میں ریاست کے ان خدشات سے مختلف تھے جب یہ مستحکم ہوئی تھی۔ لہذا یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ سلطنت کے تحت ریاست کو اوپر سے مسلط کردہ یک سنگی ڈھانچے کے بجائے عملی طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم ریاست کی نوعیت کو بنیادی طور پر دو عصری مستند تحریروں آداب الحرب والشجاعۃ اور فتاویٰ جہانداری کی بنیاد پر بیان کریں گے۔ ہم نے ریاست کی نوعیت کے بارے میں جدید مورخین کے خیالات کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ ان سب سے آپ کو دہلی سلطنت کے تحت ریاست کی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت کی قیام کے محرکات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- دہلی سلطنت کے قیام استحکام اور توسیع کو جان سکیں گے۔
- دہلی سلطنت کی نوعیت کو بخوبی جان اور پہچان سکیں گے۔
- دہلی سلطنت کے بارے میں مورخین کے افکار و خیالات کو بیان کر سکیں گے۔
- اس کے بارے میں ہم عصر مورخین کے بیانات کو جان سکیں گے۔
- دہلی سلطنت کے غیر مذہبی کردار کو واضح کر سکیں گے۔
- سلاطین اور امرا کی رواداریوں کا جائزہ لے سکیں گے۔

5.2 ریاست کی تفہیم (Understanding the State)

دہلی سلطنت کے تحت ریاست کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں اس وقت اقتدار کے حصول اور اسے برقرار رکھنے کے ذرائع کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ اقتدار عام طور پر اعلیٰ فوجی مہارتوں کے ساتھ لوگوں کے ایک گروہ کے ذریعے چھینا جا سکتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ حکمرانوں کے لیے حکمرانی کے لیے یہ کافی ہو۔ حکمرانوں نے مختلف ذرائع سے اپنے اختیارات کو جائز بنانے کی ضرورت محسوس کی۔

قانونی حیثیت میں نہ صرف لوگوں کے اہم گروہوں کی سرپرستی شامل ہے جیسے کہ امرا یا مذہبی طبقے سلطنت دہلی میں علماء، یعنی ماہرینِ الہیات، تعمیراتی تعمیرات وغیرہ، بلکہ انتظامیہ اور کنٹرول کے مختلف دوسرے نظاموں کا قیام بھی شامل ہے جس سے حکمراں طبقے مثلاً مختلف ٹیکسوں کی شکلوں میں لیویز کا مطالبہ کرنے اور نکالنے کے لیے جس کے نتیجے میں وہ اپنی بالادستی برقرار رکھ سکیں گے۔ ان انتظامی ڈھانچے نے حکمرانوں کو ان علاقوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی اجازت دی جو ریاست کے مرکزی/سیاسی دارالحکومت سے بہت دور تھے۔ سیدھے الفاظ میں، یہ قانونی کارروائیاں کسی بھی ریاست کو اس کے اپنے سماج اور معاشرے میں ایک برتر مقام و مرتبہ عطا کرتی ہیں۔ اس طرح، ریاست، حقیقی معنوں میں، مرکزی سیاسی اتھارٹی کی تشکیل کرتی ہے، جس کی نمائندگی بادشاہ/سلطان، اس کے درباری اور اس کے تمام افسران کرتے ہیں جو اس میں تعینات تھے۔

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں ریاست کی تعمیر و ترقی میں اس کے نظامِ زر، اور پورا انتظامی نظام جس نے کنٹرول کا ایک بنیادی ڈھانچہ تشکیل دیا جس کے ذریعے بادشاہی کی رعایا پر نظم وضبط برقرار رکھا گیا۔ یہ ایک واحد چیز نہیں تھی جس کی شناخت کسی ایک فرد یا ادارے سے کی جائے۔ بلکہ یہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور متنوع سیاسی اداروں کا ایک زمرہ تھا جس کے ذریعے سیاسی حکمرانی کو مستحکم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

دہلی سلطنت میں، امرا اور رئیس طبقہ سلطنت کا ایک اہم حصہ تھے، سلطنت کا زیادہ تر دارومدار غلاموں پر مشتمل تھا جن کا انفرادی حکمرانوں کے ساتھ وفاداری کا بہت پیچیدہ رشتہ ہوا کرتا تھا۔ ایک بار جب ان کا آقا مر گیا، تو ان کا نئے حکمراں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور اکثر اس کے خلاف بغاوت کرتے تھے۔ اقتدار کے لیے سلطانوں اور امرا کے درمیان کشمکش سلطنت کا ایک عام رجحان تھا۔ شروع شروع میں تمام طاقتور عہدوں پر ترک امیروں نے اجارہ داری قائم کی، لیکن خلجیوں کے آنے سے شرافت کا کردار بدل گیا۔ اس کے بعد کے دور میں مسلمانوں کے مختلف طبقات بشمول ہندوستانی مسلمانوں کو شرافت میں جگہ ملی۔ حکمراں طبقہ اپنی تنگ سماجی بنیاد کے باوجود مقامی سماج کے جامع کردار کے لیے حساس تھا۔ دہلی سلطنت کے دور میں تصوف اور بھکتی تحریکوں کی ترقی ریاست کے اندر رواداری کے جذبے کی نشاندہی کرتی ہے۔

دنیا میں ہر ریاست کے کچھ بہت واضح اجزا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہر ریاست کے پاس حکومت کرنے کے لیے ایک علاقہ ہونا چاہیے، لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے، ایک فوج کا ہونا چاہیے جنگیں کرنے اور اپنے علاقوں کی حفاظت کے لیے، قوانین کا ایک بنیادی ڈھانچہ اور انتظامیہ اور افسران اپنے اپنے فرائض انجام دینے کے لیے، وغیرہ۔ ہمیں 'ریاست' کو 'حکومت' کے ساتھ الجھانا نہیں چاہیے۔ ریاست مختلف طبقات کی تنظیم ہے جس کا مقصد اپنے علاقے کو کنٹرول کرنا ہے، جب کہ حکومت وہ اقدامات ہے جو ریاست اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، حکمرانی کے ذریعے ہی ریاست اپنے لوگوں پر اپنا تسلط اور تسلط برقرار رکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

5.3 ریاست کی تفہیم کے اہم مآخذ (Important Sources to Understand the State)

دہلی سلطنت کے معاملے میں بہت کم ذرائع ہیں جو ابتدائی دور میں ریاست کے ساتھ یا ان کے آپسی تعلقات پر براہِ راست براہ راست گفتگو کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت سلطنت اپنے قیام کے ابتدائی سیاسی مرحلے میں تھی اور مستحکم اور مضبوط بننے کی جستجو میں تھی۔ اس کے استحکام کا عمل ایسا تھا جس میں دہائیاں نہیں تو کم از کم کئی سال لگ سکتے تھے۔ نیز، متون اور تواریخ کو عام طور پر عدالت کی سرپرستی کے طور پر لکھا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، ایک عالم کو سلطنت کے بارے میں لکھنے کے لیے سلطان سے منظوری لینی پڑتی تھی اور اس کے بدلے میں اسے مختلف طریقوں سے معاوضہ دیا جاتا تھا۔

قابلِ غور بات یہ کہ یہ متنی ماخذ صرف افراد کے خیالات ہیں۔ یہ اس وقت کی مروجہ حقیقتوں کو بیان کرنے میں کس حد تک تاریخ کی نمائندگی کر سکتے ہیں یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ تاہم، چونکہ ہمارے پاس ثبوت کے طور پر یہ سب کچھ موجود ہے، اس لیے یہ جاننا مفید ہے کہ وہ ریاست کے حوالے سے کیا کہتے ہیں۔ اس معاملے میں دہلی سلطنت کے حالات و واقعات سے واقفیت کے دو اہم متنی مآخذ دستیاب ہیں۔ (1) فخرِ مدبر کی تصنیف آداب الحرب والشجاعۃ (2) ضیاالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی

5.3.1 آداب الحربِ والشجاعۃ (*Adab al-Harb wal-Shaja'a*)

فخرِ مدبر کی تصنیف ''آدابُ الحربِ والشجاعۃ'' ایک عمدہ تصنیف ہے اس کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سلطان شمس الدین التتمش (1210-1236) کی تعریف و توصیف اور اس کی شان میں تحریر کی گئی ہے۔ آداب الحرب والشجاعۃ کا یہ متن 40 ابواب پر مشتمل ہے جس میں سے پہلے بارہ ابواب میں سلطان شمش الدین التتمش کے عادات واطوار، احوال واوصاف، اخلاق و کردار، افکار و خیالات اور فرائض اور ان خصوصیات کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جو اسے اپنے حکام میں تلاش کرنی چاہئیں۔ دیگر 28 ابواب جنگ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں اور یہ کہ اسے کیسے لڑا جانا چاہیے۔

فخرِ مدبر کا متن دہلی کی سلطنت کے تناظر میں واقع ہونے کی ضرورت ہے جو اس وقت اپنے بچپن میں تھی۔ اس لیے وہ اس بات کا متمنی ہے کہ اقتدار حکمراں طبقات کے ہاتھ میں رہے اور متن اسی تشویش کی عکاسی کرتا ہے۔ نیز، اس وقت وسطی ایشیا سے منگولوں کا خطرہ تھا، اور اس سب نے مل کر درباری دانشوروں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا۔ ہمارے لیے اس کے ذریعہ فراہم کردہ معلومات ریاست کے مطالعہ کے لیے کافی ہے، اور مندرجہ ذیل دو نکات ان فوری خدشات کی مثال ہیں جو اس کے متن کے مندرجات کا تعین کرتے ہیں۔

اس نے اپنی کتاب میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ دشمن کے علاقے پر حملہ کرنے یا حملہ کرنے سے پہلے، سلطان کو باضابطہ طور پر مخالفین کو دعوت دینا چاہئے۔ اور انہیں یہ اختیار دینا چاہئے کہ یا تو وہ اسلام قبول کر لیں اور اس طرح اسلام کی برتری ثابت ہو یا جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو جائیں، یہ ٹیکس غیر مسلموں کی طرف سے مسلم حکمرانوں کو ادا کیا جاتا ہے۔

اپنی کتاب میں ایک اور مقام پر فخرِ مدبر نے ذکر کیا ہے کہ اگر کسی مسلم شہر کا غیر مسلموں نے محاصرہ کر لیا ہے تو مسلمان عورتیں اور غلام اپنے آقاوؤں کی اجازت کے بغیر اس کے دفاع کے لیے کوچ کر سکتی ہیں۔ اس وقت سلطان اور امرا دونوں کی طرف سے بڑی تعداد میں ملازم رکھے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں اپنے آقاؤں کی اجازت کے بغیر وہ کوچ کر سکتے تھے۔

یہ دونوں مثالیں ظاہر کرتی ہیں کہ "ریاست" اور ریاستی نظریات کے حامل افراد اس بات پر فکر مند تھے کہ برصغیر کی ایک بڑی تعداد اور وسیع آبادی غیر مسلم رعایا پر مشتمل ہے ان پر حکومت کیسے کی جائے۔ ان پر کنٹرول قائم کرنے اور حکمرانی کی خاطر مختلف طریقے بیان کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلی مثال ایسی ہے جو پر امن مذاکرات تجویز کرتی ہے۔ جب کہ دوسری مثال زیادہ عسکری اور جارحانہ ہے۔

اس کتاب کے چند ابواب بھی اس موضوع کے لیے وقف ہیں کہ ریاست کو اپنے ماتحتوں پر حکومت کیسے کرنی چاہیے۔ ان پر حکومت کرنے کے کیا اصول و ضوابط ہونے چاہئے۔ اس شہرہ آفاق کتاب کے ابتدائی ابواب میں حکمرانوں کے عادات واطوار، اخلاق واوصاف اور انتظامی نظم ونسق کے بارے میں بہترین مشورہ دیا گیا ہے۔ لیکن اس تصنیف کے متن میں اکثر جگہوں پر جابجا عسکری اور جنگی پالیسیاں، فنونِ سپہ گری کے گن بیان کیے گئے ہیں۔ یہ بات انتہائی غور طلب ہے کہ اس کتاب کا متن ایک سلطان کو پیش کیا گیا تھا۔ اس وقت اسے جنگی چالوں اور مہارتوں کو بروئے کار لانے کی ضرورت تھی۔ جس میں جنگ کے بارے میں اس کی غالب تشویش اس وقت اس طرح کے مشورے کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

بادشاہ اور اس کے افسروں اور کرکنان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی وضاحت کرتے ہوئے، فخرِ مدبر ریاست کو یا تو 'جابر' وظالم اور لوگوں کا استحصال کرنے والی اور طاقت کے زیر تسلط رکھنے والی بتایا ہے یا 'رفاہی' کے طور پر درجہ بندی کرتا ہے جو عام فلاح وبہبود کی طرف لے جاتا ہے۔ عدل وانصاف عہدِ قدیم سے اسلامی حکمراں کے اہم ترین فرائض میں سے ایک رہا ہے اور حکومت سے متعلق تقریباً تمام متون میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس مقصد کے لیے افسران کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں سخت اخلاقی نصیحتیں کی جاتی ہیں۔ لٰہذا یہ واضح ہے کہ مصنف اس بات کا خواہاں تھا کہ ریاست کو اخلاقی اقدار اور ان کی پاسداری کی جانب مثبت روشنی میں دیکھا جائے، اور ریاست کے استحکام اور لمبی عمر کو یقینی بنانے کے لیے ریاستی افسران کو ذمہ داری اور منصفانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اس وقت 'ریاست' کہلانے والا کوئی خاص، ادارہ یا ڈھانچہ موجود نہیں تھا۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے جیسا کہ اس اور دیگر شواہد سے حاصل کیا گیا ہے وہ مناسب اور موثر کام کے ذریعے انتظامی اور سیاسی ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے کام کرنے والا عمل ہے۔ اس مقصد کی طرف، مدبر کے خدشات ان طریقوں سے ہیں جن سے یہ حاصل کیا جا سکتا ہے اور اقتدار کو حکمراں طبقات کے ہاتھ میں رکھا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازاین ہمیں ہمیشہ یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ اسلامی ریاستوں کی سیاسی تاریخ میں شاید پہلی بار ہوا تھا کہ ایک اسلامی حکمراں طبقے نے خود کو ایسی حالت میں پایا جس میں رعایا کا سب سے بڑا حصہ دیگر مذہبی روایات سے تعلق رکھتا تھا۔ برصغیر پاک وہند کی اس حقیقت کی عجیب

صورت حال تھی جس کے لیے کچھ خاص اصول وضوابط دستور اور مشورے کی ضرورت تھی۔ روایتی مذہبی مشورے پر مبنی اقدامات سے سیاسی ریاست کو دانشمندی اور سوجھ بوجھ سے چلانا انتہائی لازمی اور ضروری تھا۔ جس چیز کی ضرورت تھی وہ سیاسی مقاصد اور زمینی حقائق دونوں کو سمجھ کر سمجھداری سے بحث کرنے کی تھی۔ ان باتوں پر اس عہد کے نامور مصنف ضیا برنی نے اپنی مشہور تصنیف تاریخ فیروز شاہی توجہ دلائی ہے۔

5.3.2 فتاوائے جہانداری (*Fatawa-e-Jahandari*)

ضیاالدین برنی، سلطان محمد بن تغلق (1324۔1352) کے دربار میں مشیر تھے۔ یوں تو انہوں نے کئی معرکتہ الآرا اور اہم کتابیں تصنیف کی ہیں۔ لیکن یہاں پر ان کی سب سے قابل ذکر کتاب فتاویٰ جہانداری سے بحث مقصود ہے۔ ضیاالدین برنی کی یہ کتاب 'حکمرانی کے اصول' پر مبنی ہے۔ جو اس نے 57۔1352۔ کے دوران کسی وقت تحریر کیا تھا۔ اس متن کو 24 فتووں ('مشوروں') کی شکل میں ترتیب دیا گیا ہے اس طرح متن کی تدریسی نوعیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ حکمرانی کے صحیح طریقوں کی بات کرتا ہے، اور متن کو بہت سے جدید دانشوروں نے دہلی سلطنت میں حکمرانی کے فن پر پہلی قابل قدر تصنیف تصور کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے فن پر اس طرز کی منفرد اور جامع متن ہے۔

ریاست اور حکمرانی کے بارے میں برنی کے نظریات کا مرکزی نکتہ بھی عدل ہے۔ جس کا صحیح انتظام وہ حکمراں کا بنیادی فرض سمجھتے ہیں۔ وہ بھی حکمراں طبقات کے لیے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے فکر مند ہے۔ درحقیقت، وہ بالترتیب اعلیٰ اور ادنیٰ لوگوں کی خوبیوں اور برائیوں کے بارے میں اپنے خیالات میں مدبر سے کہیں زیادہ زوردار ہے۔ ان کی تحریروں میں بھی تضادات واضح نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک ایسے وقت میں لکھ رہے تھے جب سلطنت برصغیر میں ریاست کے طور پر اپنے کردار کی بنیاد بہت بہتر تھی۔ اس طرح ایک طرف وہ مسلمانوں کی خوبیوں اور اعلیٰ نسل کے مسلمانوں کو اہم ریاستی عہدے دینے کی اہمیت کے بارے میں طوالت سے بولتا ہے اور ہندوؤں اور ریاست کی طرف سے ادنیٰ نسل کے لوگوں کی ملازمت کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ دوسری طرف، انصاف کے بارے میں اس کا نظریہ رحم اور رحم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جیسے فصلوں کے خراب ہونے پر جزیہ کی معطلی، یا غیر مسلموں میں ضرورت مندوں میں سرکاری خیرات کی تقسیم۔ اس لیے ایک اچھی 'ریاست' کے بارے میں ان کا نظریہ ایسا ہے جو حکمراں اشرافیہ اور رعایا دونوں کے مفادات کو مد نظر رکھے۔

فخرِ مدبر کے برعکس، برنی لوگوں کی موروثی اخلاقی خوبیوں پر زیادہ اعتماد نہیں کرتے۔ وہ انہیں تسلیم کرتا ہے، لیکن سلطان پر زور دیتا ہے کہ وہ ریاست کی موجودگی کو موثر بنانے کے لیے جہاں ضروری ہو طاقت کا استعمال کرے۔ تاہم، برنی کی اہم شراکت ان کا 'ریاستی قوانین'ضوابط' کا نظریہ ہے جو ان کے لیے منفرد ہے۔ ان ضوابط کو برنی نے دہلی سلطنت کے ان حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے بیان کیا تھا جس میں ریاست کو زندہ رہنا تھا۔ اس طرح مثالی مسلمان حکمراں وہ ہوگا جو اسلام کے عقیدے کو برقرار رکھے گا اور تمام کافروں کو سزا دے گا۔ لیکن حقیقت میں یہ اس سرزمین میں ممکن نہیں تھا جہاں رعایا کی اکثریت کافر ہو۔ برنی کے مطابق، انصاف کے حصول کے ذریعے سلطان 'زمین پر خدا کا سایہ' بن کر رہ سکتا ہے، خدائی حکم کے ذریعے وقتی حکمرانی کا ادراک کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حالات کی حقیقت کا مطلب یہ

تھا کہ سلطان ہمیشہ مذہب اور اس کے ضابطہ اخلاق کے تجویز کردہ نسخوں پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ اور چونکہ بادشاہت اور سیاسی حکمرانی کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔ مختصراً، یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریاست کا تحفظ، استحکام اور توسیع سلطان کا بنیادی مقصد تھا۔ اس لیے اکثر اس کی ضرورت ہوتی تھی کہ وہ عملیت پسندی سے حکومت کرے نہ کہ اس کے مطابق جس کا مذہب اس سے سخت ترین معنوں میں مطالبہ کرتا ہے۔ اس مقصد کی طرف، برنی پہلا شخص ہے جس نے 'ریاستی قوانین' کا ایک مجموعہ بیان کیا جس سے سلطان کو زیادہ مؤثر طریقے سے حکومت کرنے میں مدد ملے گی، تاکہ اس کا اختیار اور استحقاق برقرار رہے۔ ان 'ریاستی قوانین' نے سلطان کو اجازت دی ہے۔ اس کا ماننا تھا کہ وقتِ ضرورت سلطان کو اپنے علاقے پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے شریعت کے بجائے مصلحت سے کام لینے سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ برنی اپنے خیال میں واضح تھے کہ اگر کبھی سیاسی عملیت پسندی اور مذہبی تقاضوں میں تصادم ہوا تو سیاسی عملیت پسندی ہمیشہ غالب رہے گی۔

ریاست اور حکمرانی کے بارے میں برنی کے خیالات پر گفتگو کرتے ہوئے، عرفان حبیب کہتے ہیں کہ ریاست کے بارے میں ان کے وژن میں شائستگی اور شان و شوکت کا مظاہرہ شامل تھا تاکہ لوگوں کے ذہنوں پر ریاست اور اس کی طاقت کا اثر پیدا کیا جاسکے۔ انہوں نے ضرورت سے زیادہ تشدد کے استعمال میں تحمل کی بھی وکالت کی، کیونکہ وہ اس بات سے آگاہ تھے کہ اس کی وجہ سے حکمراں طبقے کی نقل مکانی ہوئی جس کے نتیجے میں ریاست کے استحکام کو نقصان پہنچا۔

اس طرح فخرِ مدبر اور ضیاالدین برنی کے درمیان یہ بات واضح ہے کہ 'ریاست' کو ایک واحد ادارے کے طور پر نہیں دیکھا گیا جسے حکمراں اشرافیہ اپنے مفتوحہ علاقوں کی رعایا پر محض مسلط کر سکے۔ اس کے برعکس، 'ریاست' تقریباً ہمیشہ ہی ایک تعمیری تشکیل ہوتی تھی۔ جو متعدد اقدامات اور مشورے اور مشق کے ایک پیچیدہ نیٹ ورک کے ذریعے بیان کی جاتی تھی۔ جہاں سلطانوں کو کسی بھی اقدام یا پالیسی کا فیصلہ کرنے سے پہلے ہر علاقے کے زمینی حقائق کو مدنظر رکھنا پڑتا تھا۔ جو ایک علاقے میں کارآمد تھا وہ دوسرے علاقے کے لیے اچھا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ بلاشبہ، کچھ خصوصیات ایسی تھیں جو کم و بیش آفاقی تھیں، جیسا کہ ٹیکس لگانا، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان عہدیداروں کا کردار جو مملکت کے دور دراز علاقوں میں خدمات انجام دیں گے، مقامی مفادات کی نوعیت کا دھیان رکھنا ناگزیر تھا۔ مثال کے طور پر، کچھ علاقے تجارتی سرگرمیوں سے زیادہ منسلک ہو سکتے ہیں جب کہ دیگر زراعت پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی کی بے ترتیبی کو بھی دھیان میں رکھنا ہوگا جیسے سیلاب اور قحط زدہ افراد کی امداد وغیرہ۔ ہم سب اس بات کا تعین کرنے میں لگ گئے کہ 'ریاست' خود کو کیسے ظاہر کرے گی اس سب کا خلاصہ طاقت اور موثر حکمرانی کی برقراری تھی اور اس مقصد کے لیے تقریباً کوئی بھی پالیسی یا طریقہ قابل قبول تھا۔ اس میں بھی دہلی سلطنت میں 'ریاست' جدید ریاستوں سے بہت مختلف تھی جو کہ اس بنیاد پر کام کرتی ہیں۔

5.4 ریاست کی نوعیت پر جدید مورخین کے نظریات

(Modern Historians' Views on the Nature of the State)

دور حاضر کے دانشوروں اور مورخین نے دہلی سلطنت کے تحت 'ریاست' کی نوعیت کے بارے میں رائے دینے کے لیے مذکورہ

عبارتوں اور شواہد کے ساتھ دیگر ذرائع کا استعمال کیا ہے۔ دہلی سلطنت کی نوعیت، عہدِ حاضر کے مورخین اور دانشوروں میں خاص طور پر بہت زیادہ بحث کا موضوع رہی ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سلطنت دہلی نے وہ بنیاد رکھی جس پر مغل سلطنت بعد میں اپنی طاقت اور شان و شوکت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔

میکس ویبر (Max Weber) اپنی مشہور کتاب *Economy and Society* میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ دہلی سلطنت ایک فلاحی ریاست (Welfare State) تھی۔ میکس ویبر کے اس تصور کی مزید وضاحت کرتے ہوئے جیکب روزل (Jakob Rösel) کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسی ریاست ہوتی ہے جس میں حکمراں ریاست پر تسلط قائم کرنے کے لیے تربیت یافتہ وفادار ریاستی افسران کی ایک قلیل تعداد پر انحصار کرتے ہیں جو ٹیکسوں کی وصولی جیسے خصوصی انتظامی کاموں میں شامل ہوتے ہیں اور تجارتی سرگرمیوں، امن و امان وغیرہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ دیگر معاملات میں اکثر یہ طاقت مختلف صوبائی اور علاقائی سطحوں پر مقامی طاقتور گروہوں اور بچولیوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ تاہم یہ نظریہ مزید تحقیق کا متقاضی ہے جس کے لیے کافی شواہد فی الحال دستیاب نہیں ہیں اور اسی لیے یہ دہلی سلطنت کے بعد کے دور پر زیادہ مقبول نہیں رہا۔ حالانکہ اس کا اطلاق مغل سلطنت پر زیادہ کامیابی سے ہوا ہے۔

اسٹینلے لین پول، ایشوری پرساد، اے بی ایم حبیب اللہ، محمد حبیب، خلیق احمد نظامی وغیرہ جیسے مورخین اور حال ہی میں پیٹر جیکسن نے دہلی سلطنت کو ایک 'مرکزی ریاست' کے طور پر بیان کیا ہے جس کی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے۔ دہلی سلطنت 1192 عیسوی میں ترائن کی دوسری جنگ کے بعد قائم کی گئی تھی جس کی وجہ سے ترکوں کو برصغیر میں مستقل حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ پہلے لاہور اور 1206 عیسوی کے بعد دہلی، نئی سلطنت کے دار الحکومت کے طور پر کام کرتا رہا۔

سائمن ڈگبی (Simon Digby) کے مطابق 'دہلی سلطنت میں جنگی گھوڑے، ہاتھی اور فوجی ساز و سامان، اس کی اعلیٰ فوجی طاقت اور تنظیمی صلاحیتوں اس کی کامیابی کی اہم وجہ تھے'۔ دوسری طرف رومیلا تھاپر نے دلیل دی ہے کہ 'مقامی طور پر راجپوت ریاستوں کے درمیان اختلاف اور لڑائی، کمتر فوجی حکمت عملیوں کے باعث 1192 عیسوی میں پرتھوی راج چوہان کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد جو سلطنت ابھری وہ ایسی حکومت تھی جو پہلے سے زیادہ مستحکم اور اس قابل تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنی سیاسی بنیاد کو بڑے پیمانے پر وسیع اور مضبوط کر سکے۔ چونکہ وہ اپنے پاس دستیاب مختلف وسائل کو بروئے کار لانے کے قابل تھے اور یہ ایک ایسا کام تھا جو ایک مرکزی آمرانہ ریاست کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ مرکز، ریاست کے مختلف اعضاء اور وسائل کو اپنے فائدے کے لیے کنٹرول اور استعمال کر سکتا تھا۔'

ہرمن کلکے (Hermann Kulke) اس ماڈل ریاست کو دہلی سلطنت کے تحت جدید ریاست کی تشکیل کے تسلسل کے آخر میں رکھتے ہیں۔ وہ 1200 کے بعد کے عہد وسطیٰ کی ریاست کو ایک مضبوط حکمراں کی سربراہی میں ایک سیاست کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو ایک موثر اور موروثی طور پر منظم مرکزی انتظامیہ سے لیس ہے جس کی بنیاد (کم و بیش) واضح طور پر بیان کردہ علاقے میں مذہبی طور پر جائز جابرانہ اجارہ داری پر ہے۔ تاہم، حالیہ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ترکوں کی سیاسی حکمرانی برقرار رہی اور خود کو

مستقل طور پر مستحکم کرتی رہی، لیکن یہ کوئی اچھااور لائق تعریف عمل نہیں تھا جسے چیلنج نہ کیا گیا ہو۔ ریاست کس حد تک 'مرکزی' تھی، یعنی مرکزی، سیاسی طاقت کا گروہ حکمرانوں اور درباری عمائدین کا وسیع تر مملکت میں حقیقی طاقت اور کنٹرول کو کس حد تک استعمال کر سکتا ہے، اس پر کافی بحث ہوتی رہی ہے اور ابھی تک اس پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہے۔

اس طرح کے مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ریاست میں صرف تھوڑی سی نوکر شاہی تھی، اور ایک طرف سیاسی تقسیم یا تقسیم کی ڈگری کے بارے میں کوئی اتفاق نہیں ہے، اور دوسری طرف ان ریاستوں کے اندر وقتی اور مقامی طور پر اتار چڑھاؤ والے وحدتی رجحانات۔ مرکزی سیاسی طاقت کو مختلف مقامی طاقتوں کے گروہوں کی طرف سے مسلسل چیلنج کیا جارہا تھا، اور مرکز میں سلطان نے قیمتی وقت اور وسائل کو ایسی قوتوں کو زیر کرنے کی کوشش میں صرف کیا۔ مخالفت دوسرے امیروں کی طرف سے بھی ہوئی جو سلطنت کے مختلف حصوں میں تعینات تھے۔ یہ وہ افسران تھے جنہیں تنخواہ کے بدلے علاقے تفویض کیے گئے۔ انہوں نے فاضل آمدنی ریاستی خزانے میں نہ دے کر اپنے آپ اس کا لطف اٹھایا اور اپنی خود مختار ریاستیں قائم کرنے کی کوششیں کیں۔

تاہم یہ کچھ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت میں کام کرنے پر ایک خاص حد تک مرکزی اختیار موجود تھا، اور یہاں تک کہ جہاں مقامی طاقتیں غالب تھیں، ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ عدالت اور سلطان کو اپنا اعلیٰ افسر تسلیم کریں۔ یہ اس حقیقت سے عیاں ہے کہ اکثر سلطان کو باغی گروہوں کے خلاف جنگیں کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، چاہے وہ ریاستی اہلکار ہوں جو مرکز کے خلاف ہو گئے ہوں یا دیگر مقامی طاقتور سردار ہوں۔ اس کے علاوہ، مرکز مملکت کے مختلف حصوں میں اپنی سرگرمیوں جیسے ٹیکس وصولی، سڑکوں کی تعمیر، تعمیرات، مساجد، مذہبی اداروں اور افراد کو خیرات، وغیرہ کے ذریعے موجود تھا۔ ریاست کی موجودگی کی ایک اہم خصوصیت سلطنت کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں فوج کی مسلسل نقل و حرکت تھی کیونکہ اس نے اپنے دائرہ کار کو بڑھایا یا بغاوتوں کو دبانے کی کوشش کی۔ اکثر، مقامی علاقوں کو مرکزی فوجوں کے وہاں سے گزرتے وقت خوراک اور پناہ گاہ فراہم کرنے کی صورت میں مہمان نوازی کرنا پڑتی تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلطنت دہلی میں بہت سے مقامی علاقوں پر مقامی سرداروں کی حکومت تھی، اور یہاں تک کہ روزمرہ کا انتظام، مقامی رواج کے مطابق چلتا تھا۔ مقامی علاقوں میں مرکزی موجودگی ضروری نہیں کہ وہ وہاں پر موجود تمام ڈھانچے کو تبدیل کر دے۔ وہ اکثر متحد ہو کر کام کرتے تھے۔ پوری سلطنت میں یکساں انتظامیہ 200 سال سے زیادہ عرصے بعد صرف مغلوں کے تحت سیاسی اور انتظامی استحکام کے ساتھ ہی واقع ہوا۔

کچھ اور نظریات بھی ہیں جنہوں نے ریاست کو دوسرے زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر، اسٹیفن کونرمین (Stephan Conermann) نے 14ویں صدی سیاح ابن بطوطہ کے رحلہ (Rihla) کے مطالعہ کی بنیاد پر دہلی سلطنت کی زیادہ معاشی نوعیت کی تجویز پیش کی ہے۔ اس نے قوم پرستی کی خصوصیات پر بھی زور دیا۔ دیگر دانشوروں نے دوسرے طاقتور گروہوں پر توجہ مرکوز کی ہے، جیسے صوفیاء، یہ دلیل دیتے ہیں کہ ریاست کی عملداری میں اکثر صوفی یا روحانی آقا کی طاقت کی وجہ سے رکاوٹیں آتی تھیں جن کا آس پاس کے علاقوں کے لوگوں پر زبردست اثر تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس معاملے میں مقامی آبادی کا مذہب صوفیاء کے اثر و رسوخ کے راستے

میں نہیں آیا۔عام طور پر صوفی ایسے علاقوں میں آباد ہوئے جو شہری علاقوں سے تھوڑا دور تھے، لیکن شاید سب سے زیادہ ڈرامائی صورت حال سلطان علاء الدین خلجی (1295تا1316) کے دور میں پیدا ہوئی جب صوفی شیخ نظام الدین اولیاء نے دارالحکومت میں ہی اپنی خانقاہ قائم کی۔اس طرح سلطان کی سیاسی حکمرانی کی عملداری کو ایک انتہائی اہم چیلنج در پیش تھا۔ایسے موقعوں پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ 'ریاست' کی پالیسیوں کے موثر نفاذ کے لیے حکمرانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ سیاست کو مذہب اور مذہبی سرگرمیوں اور افراد سے الگ رکھیں۔اس طرح کی مثالیں، اور ہمارے پاس دستیاب مختلف متنوں میں زبان کی نوعیت بھی بعض اوقات یہ احساس کراتی ہے کہ دہلی سلطنت کے حکمراں بنیادی طور پر اسلام کی تبلیغ اور دیگر مذاہب کو زیر کرنے میں مصروف تھے۔اس طرح کے تاثر کو اس اعلیٰ اور مستند مقام سے تقویت ملتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ مذہبی علما، عدالت اور دیگر اہم عہدوں پر براجمان تھے۔ لیکن بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوگا کہ سب سے بڑے دفاتر، خاص طور پر فوجی قیادت، قابل اور وفادار جنگجوؤں کے پاس گئے جنہوں نے کبھی مذہبی کٹر پرستی پر عمل نہیں کیا۔

علماء در حقیقت بہت سے گروہوں میں سے ایک تھے جو سرکاری افسر شاہی میں رہے اور بادشاہی حکمرانی کو جائز قرار دینے کے علاوہ اپنے علم کے ذریعے جو اکثر مذہبی ہوا کرتا تھا، عدالتوں میں انصاف اور مدارس میں تعلیم کی فراہمی کرتے رہے۔یہ نظریہ کہ مذہب برصغیر میں عہد وسطیٰ کی سیاست کا بنیادی پتھر تھا اور اس کی بنیاد پر دہلی سلطنت کو ایک 'اسلامی ریاست' قرار دیا جانا چاہیے، دستیاب شواہد سے پوری طرح میل نہیں کھاتا۔ہو سکتا ہے کہ انہوں نے بعض اوقات مذہب کو لوگوں کو جوش دلانے یا بعض کاموں کی وضاحت کے لیے ایک ذریعہ کے طور پر استعمال کیا ہو، لیکن ان کے تمام اعمال اپنے در حقیقت سیاسی تھے، اور دہلی سلطنت کے تحت 'ریاست' نے کبھی مذہب کی تبلیغ کے لیے کوئی خاص اقدام نہیں کیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، 'ریاست' بھی بڑے دائرے میں متعدد دیگر اعمال کے ذریعے خود کو ظاہر کرتی ہے۔ان میں سرفہرست تعمیرات اور خیرات کے کام تھے۔ریاست کے تسلط کے ایک حصے کے طور پر، اور اس کی موجودگی کے جسمانی نشان کے طور پر، ریاست اکثر عمارتوں، مساجد، یا نہروں اور کنویں وغیرہ کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔دائرہ، اسی طرح، ریاست کی شان کا مظہر۔آخر میں، ریاست نے اپنی رعایا کی سرپرستی کے طور پر ضرورت مندوں اور دانشوروں کو خیراتی اوقافات بھی دیں۔

ابتدائی دہلی سلطنت کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔ بعض نے اسے مذہبی ریاست قرار دیا اور بعض نے فوجی ریاست۔ اس میں مورخین کی طرف سے مختلف قسم کی آراء پیش کی گئی ہیں اور اپنے خیالات کی تائید میں بہت سے دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں۔ترک ریاست ایک فوجی ریاست تھی۔یہ قول اس دلیل پر مبنی ہے کہ اس کی طاقت ہتھیاروں پر مبنی تھی۔ تقریباً ایک صدی تک، نئی سلطنت کے لیے فوج اور سلامتی کے مسائل سب سے اہم تھے۔لہٰذا یہ فطری تھا کہ ریاست کا کام بنیادی طور پر فوجی تھا۔اس کا انتظامی کام رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ترکوں کی فتح سے جو تبدیلیاں لائی گئیں وہ سیاسی تھیں، انتظامی نہیں۔

آشیر دلال سریواستو (Ashirbadi Lal Srivastava) نے سلطنت کو ایک فوجی ریاست سمجھا۔ان کے مطابق وہ

ریاست طاقت پر قائم تھی، عوام کی منظوری پر نہیں۔ اس کے ماتحت تمام علاقہ طاقتور ترک فوجیوں کے ہاتھ میں تھا۔ ملک کے اندرونی علاقوں میں جنگی اہمیت کے حامل مقامات پر چھاؤنیاں تھیں۔ اس کی سرحدوں پر فوجی چوکیوں کے طور پر کام کرنے کے لیے قلعے بنائے گئے تھے جو فوجی چھاؤنیوں سے متعلق تھے۔ حکومت نے غیر ملکی ہونے کے ناطے صرف دو فرائض کا خیال رکھا۔ ٹیکس وصول اور امن وامان کا قیام۔ اس کا تعلق عوامی مفاد سے نہیں تھا ہے۔

اس کے برعکس خلیق احمد نظامی (Khaliq Ahmad Nizami) کا خیال ہے کہ اس دور میں فوجی مہمات کی زیادتی کی بنیاد پر ریاست کی عسکری ساخت پر زور نہیں دیا جا سکتا۔ عوام کی منظوری کے بغیر کوئی سیاسی ڈھانچہ تشکیل نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی دہائیوں اور صدیوں تک حکومت کی جا سکتی ہے۔ راجپوت اعلیٰ طبقے جو کہ ملک کی سماجی اور سیاسی زندگی کی مراعات سے محروم تھے، غیر ملکی تسلط سے نالاں تھے اور جب بھی انہیں موقع ملا بغاوت کر دیتے تھے لیکن اکثریتی ہندو عوام کی بغاوت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں نے نئی ریاست کو قبول کر لیا تھا۔ حقوق سے محروم راجپوت حکمرانوں اور منگولوں سے تحفظ اور امن کے قیام کے لیے ایک موثر اور منظم فوج کا ہونا ضروری تھا لیکن اس فوج کو کبھی باغی عوام کو دبانا نہیں پڑا۔

اس سے بھی زیادہ اختلاف، ترک ریاست کی مذہبی نوعیت کو لے کر ہے۔ اس سلسلے میں مختلف مورخین نے اپنے دلائل پیش کیے ہیں۔ آئی ایچ قریشی (I.H. Qureshi) کا خیال ہے کہ 'شریعت (اسلامی قانون) کی بالادستی نے کچھ لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ ترک ریاست ایک مذہبی ریاست تھی۔' محمد حبیب (Mohammad Habib) نے یہ بتایا کہ ہندوستان میں مسلم ریاست کسی بھی لحاظ سے مذہبی ریاست نہیں تھی۔ بعض مورخین کے مطابق ترک حکمرانوں نے مذہب کی اشاعت کے لیے کبھی کام نہیں کیا اور نہ ہی ہندو مذہب کے خلاف عدم رواداری کی پالیسی اپنائی۔ ان کے مطابق ہندوؤں کے مندر اور بت صرف جنگوں کے دوران تباہ ہوئے اور ان کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا گیا، ان کی تذلیل نہیں کی گئی۔ محمد ناظم کا خیال ہے کہ ہندو مندر دولت کا ذخیرہ ہونے کے باعث اپنے لیے مصیبت کو دعوت دیتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت کے مورخین جیسے منہاج السراج، ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف، یحییٰ احمد سرہندی وغیرہ کی تحریریں مذہبی مظالم، مندروں کی تباہی اور بت شکنی کا تذکرہ کرتی ہیں، لیکن مولانا سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ ان مثالوں پر زیادہ توجہ نہیں دی جانی چاہیے کیونکہ ان کا مقصد ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں کو سمجھانا تھا۔

خلیق احمد نظامی کی رائے ہے کہ 'سلطنت میں مذہبی ریاست کے ضروری عناصر نہیں تھے۔ سلطنت کو شریعت سے بھی کوئی امید نہیں تھی، کیونکہ یہ شرعی نقطہ نظر سے ایک غیر قانونی ادارہ تھا۔ اس کے قوانین حکومت نے بنائے تھے۔ حکمرانوں اور حکمراں طبقے کا انتظام غیر مذہبی قوتوں کے ہاتھ میں تھا۔ اعلیٰ افسران اور حکام نے سلطنت کی پالیسی کو متاثر کیا۔ مذہبی رہنما ان کے بعد آتے تھے۔ بلاشبہ مذہب کا احترام کیا گیا لیکن اسے سیاسی نظام کی بنیاد کبھی نہیں بنایا گیا۔ سلطنت نے کوئی مذہبی مقصد حاصل کرنے کی کوشش تک نہیں کی۔ ڈاکٹر نظامی کے خیال میں ہندوستان کی ترک سلطنت اپنے سیاسی نقطہ نظر میں ایک ہم جنس (homogeneous) ریاست تھی، ترک جنگجو، اسلام کے سیاسی نظریات کے فروغ کے بجائے اپنی طاقت اور تنظیم کی حفاظت کے لیے زیادہ مستعد تھے۔ ان کی جنگیں مذہب کی جنگیں نہیں تھیں،

نہ ہی ان کے نظریات اسلام نے طے کیے تھے۔ وہ مسلمان تھے لیکن اسلام کے نمائندے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کے منصوبے سیکولر بنیادوں پر رکھے تھے لیکن ذات پات کی تفریق اور دولت واقتدار کی ہوس ان کی زندگی کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ ابتدائی مسلم مآخذ اوران کے مصنفین جیسے حسن نظامی اور فخر مدبر، یہ تاثر دیتے ہیں کہ شمالی ہندوستان پر ترک قبضہ ایک مذہبی معاملہ تھااور جنگجو مذہبی رہنما تھے جواپنے مذہب کے لیے جینے اور مرنے کے لیے تیار تھے۔اس کے برعکس ڈاکٹر نظامی کی رائے ہے کہ تاریخی نقطہ نظر سے شمالی ہند پر ترک تسلط کی وجہ منگولیااور وسطی ایشیا کے قبائل کی زمینوں کے لیے نہ کہ مذہبی جنگوں کے لیے نقل مکانی تھی۔ جن مورخین نے ترکوں کی حکومت کو مذہبی ریاست قرار دیا ہے ان میں جاو ناتھ سرکار، اے ایل سریواستو وغیرہ شامل ہیں۔

5.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

الغرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ دہلی سلطنت کے تحت ریاست کوئی جامد وجود نہیں تھی جو شروع سے آخر تک ایک واحد زمرے کے طور پر موجود تھی۔ بلکہ، یہ حکمراں طبقوں کے مختلف اقدامات اوران کے موثر طرز حکمرانی کے قوانین کا مجموعہ تھا۔اس کے کچھ اجزاء عالمگیر تھے، جیسے ٹیکس اور امن ومان کا قیام وغیرہ۔ دوسرے متغیر تھےاور کچھ اور بھی تھے جو وقت گزرنے کے ساتھ اور ضرورت کے مطابق بڑھتے گئے۔ ظاہر ہے، تیرہویں صدی کے آغاز میں ایک نئی ابھرتی ہوئی 'ریاست' کے فوری مسائل 14ویں صدی کے آخر میں زیادہ پختہ اور پراعتماد سیاسی 'ریاست' کے خدشات سے مختلف تھے۔ لہٰذا، جب کہ 'ریاست' کا زمرہ اب بھی دہلی سلطنت کے تحت سیاسی نظم ونسق کے مطالعہ کے حصے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے، اسے ایک جامع بلاک کے طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے جو کہ لوگوں پر مسلط تھا۔ 'ریاست' ایک نامیاتی ادارہ تھا جس کی بنیادی مشق سیاسی غلبہ اور موثر حکمرانی کو یقینی بنانا تھا، اور یہ صرف حکمراں طبقات کے عزائم اور حکمرانوں کی ضروریات اور مطالبات کو پورا کرنے سے ہی ممکن تھا۔ اس مقصد کی طرف، اپنے بہت سے کاموں اور دفاتر کے ذریعے اس کا مقصد مملکت کے متنوع اجزاء کو ایک متحد، مکمل حکومت میں ضم کرنا تھا۔ کوئی بھی عمل اس وقت تک اچھا تھا جب تک اس نے یہ مطلوبہ انجام حاصل کر لیا۔ لہٰذا اسے حکمرانی کے ایک جاری عمل کے طور پر دیکھا جانا چاہیے جس کی، وقت کے مخصوص نقطوں پر، 'ریاست' کے طور پر شناخت کی جاسکتی ہے، لیکن جب ایک بڑے عرصے میں دیکھا جائے تو، کام پر ایک عمل کے طور پر سامنے آئے گا۔ یہ حکومتی سہاریں بلاشبہ، حکمراں کے مرکزی فرد کے گرد منظم تھی جس کی اپنی اتھارٹی کو موثر حکمرانی، علماء کی مذہبی منظوری سے مکمل کرشماتی اتھارٹی اوراس کے بنیادی ساختی اظہار کے طور پر افسر شاہی کے ایک ہنر مند امتزاج نے بڑھایا تھا۔ اس طرح، جتنا 'ریاست' حکمراں طبقوں کے ذاتی مفادات کا اظہار تھا، یہ ایک عوامی سیاسی ادارہ تھا جس کا بنیادی کام اپنی رعایا کی آبادی کو ایک عالمی نظم وضبط والے اجتماع میں باندھنا تھا۔ طاقت کے ڈھانچے تک۔ جس پر سیاسی اختیار اور طاقت مسلط کی جاسکتی ہے۔ 'انصاف'، جس طرح بھی مختلف گروہوں کی طرف سے سمجھا اور بیان کیا گیا، ریاست کا مرکزی محور تھا، اور اس کی کامیابی کا انحصار اس مہارت پر ہے جس کے ساتھ حکمراں بنیادی طور پر معاشی وسائل کو اپنے اختیار میں جمع کرنے میں کامیاب رہے، جیسا کہ مختلف دیگر اندرونی اور بیرونی عوامل جو ان کی تاثیر کا تعین کرتے ہیں۔

5.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

فتاویٰ	:	واحد فتویٰ دستور، قانون، مذہبی اصطلاح میں شرعی قوانین و دستور
جہانداری	:	دنیاوی
آداب الحرب والشجاعۃ	:	جنگی و عسکری اصول وضوابط
جزیہ	:	غیر مسلموں سے ان کی جان مال عزت وآبرو کی حفاظت کی خاطر لیا جانے والا ٹیکس
عدل	:	انصاف
برِ صغیر	:	ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا مشترکہ علاقہ
معطلی	:	برخاستگی
اشرافیہ	:	عہد وسطیٰ کے سماج کا اعلیٰ طبقہ
ضوابط	:	اصول و قوانین
استحقاق	:	جائز حق

5.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت کا کوئی ایک اہم ماخذ بتائیں؟
2. آداب الحرب والشجاعۃ کس نے لکھا تھا؟
3. فتاوئے جہانداری کا مصنف کون ہے؟
4. آداب الحرب والشجاعۃ میں کتنے ابواب ہیں؟
5. اکانومی انڈ سوسائٹی نامی کتاب کس نے لکھی ہے؟
6. فتاوئے جہانداری کتنے فتاووں پر مشتمل ہے؟
7. پیٹر جیکسن دہلی سلطنت کو کس طرز کی حکومت کہتے ہیں؟
8. غیر مسلموں سے لیا جانے والا ٹیکس کیا کہلاتا ہے؟
9. کس مورخ نے ہندوستان کو ایک مذہبی ریاست کہا ہے؟
10. میکس ویبر دہلی سلطنت کو کس طرز کی حکومت کہتے ہیں؟

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. فخر مدبر نے دہلی سلطنت کے بارے میں کیا لکھا ہے بیان کیجیے۔
2. ضیاالدین برنی نے بادشاہت کے لیے کیا اصول بتائے ہیں؟
3. دہلی کو ایک فلاحی ریاست کس نے کہا تھا؟ وضاحت کیجیے۔
4. دہلی کی ریاست ایک فوجی حکومت کیسے تھی؟ بیان کریں
5. رومیلا تھاپر نے دہلی کی ریاست کو کس طرز کی ریاست کہا ہے۔ وضاحت کریں؟

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. فخر مدبر اور ضیاالدین برنی نے ریاست کے کیا اصول بیان کیے ہیں؟ تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. وہ کون سے مورخین ہیں جو دہلی سلطنت کو ایک مرکزی ریاست قرار دیتے ہیں اور کیوں؟
3. مورخین دہلی ریاست کو ایک مذہبی ریاست کیوں کہتے ہیں؟ کیا ان کا کہنا درست ہے؟ وضاحت کیجیے۔

5.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. محمد حبیب، خلیق احمد نظامی، جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔
2. ستیش چندر، قرون وسطیٰ کا ہندوستان: سلطنت سے مغلوں تک، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1999۔
3. عزیز احمد، عہد وسطیٰ کے سیاسی فکر میں رجحانات، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔
4. رومیلا تھاپر: ابتدائی ہندوستان: ابتداء سے 1300 عیسوی تک۔
5. نظامی، کے، اے، سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات۔

اکائی 6۔ دہلی سلطنت: نظم ونسق

(Administration under the Delhi Sultanate)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 مرکزی نظم ونسق

6.3 سلطان کا مرتبہ اور اختیارات

6.4 وزرا، محکمہ جات اور ان کے فرائض

6.4.1 وزیر

6.4.2 دیوان وزارت

6.4.3 دیوان رسالت

6.4.4 دیوان عرض

6.4.5 دیوان انشا

6.4.6 دربار اور شاہی حرم کے امور

6.4.7 عدل وانصاف

6.4.8 امیر داد

6.4.9 ڈاک، پولیس اور خفیہ نظام

6.4.10 نظام مال گزاری

6.5 اقطاع داری نظام

6.6 صوبائی ومقامی حکومت

6.6.1 صوبیدار یا والی

6.6.2 برید

6.6.3 دیوان
6.6.4 شق
6.6.5 پرگنہ
6.6.6 مقامی عہدیدار
6.7 ذرائع آمدورفت
6.8 امن وامان
6.9 اکتسابی نتائج
6.10 کلیدی الفاظ
6.11 نمونہ امتحانی سوالات
6.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.11.2 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.12 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

6.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کا قیام قطب الدین ایبک کے ہاتھوں 1206ء میں ہوا۔ 1206 سے 1526 کا زمانہ دہلی سلطنت کا دور کہلاتا ہے جو کہ تاریخ ہند کا اہم دور ہے۔ اس دور میں نہ صرف سیاسی و معاشی سطح پر بھی بہت سی تبدیلیاں آئیں بلکہ نظم ونسق پر توجہ دی گئی۔ یہاں ہم صرف دلی سلطنت کے مرکزی ڈھانچے اور اس کے نظم ونسق سے متعلق بات کریں گے لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ بھی جان لیں کہ دہلی سلطنت کی نوعیت اور ماہیت کیا تھی۔ قانوناً دہلی سلطنت خلافت کا ایک حصہ تھی، بغداد کے نام نہاد خلفا کا سلسلہ ختم ہونے پر بھی خلیفہ کی اطاعت کے مفروضے کو جاری رکھا گیا تھا، سوائے علاالدین خلجی اور اس مختصر زمانے کے جب کہ قطب الدین مبارک شاہ نے خلیفہ کا منصب خود اختیار کر لیا۔ محمد بن تغلق نے مصری عباسیوں کی بالادستی کو قبول کیا۔ پہلا سید حکمراں، خضر خان تیمور اور شاہ رخ کی سیادت تسلیم کرتا تھا۔ بعد کے سلاطین نے ایک گم نام خلیفہ کی اطاعت کے اقرار کی روایت قائم رکھی۔ عملاً سلطنت مستقل بالذات تھی اور ایک مقتدر مملکت کے تمام اختیارات رکھتی تھی۔ اس کا طرز حکومت مطلق العنان تھا۔ سلطان مملکت کا سربراہ اور اس کی افواج کا سپہ سالار اعظم ہوتا تھا۔ شاہی خانوادہ مسلم شریعت کا پابند ہوتا تھا جس کی حفاظت اور نفاذ اس کا فرض تھا۔ جو ترک ہندوستان آئے ان کے ذہنوں پر بھلے ہی ریاست

یا سلطنت کے سلسلے میں اسلامی تصور یا عمل کا بڑا گہرا اثر تھا لیکن وہ اپنے قبائلی اور خاندانی رسم و رواج کو بھی پوری طرح فراموش یا مسترد نہیں کر پائے تھے۔ انہوں نے سیاسی معاملات اور ان کے حل کرنے کے سلسلے میں عملی پختگی کا بھی اظہار کیا اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی قوانین کے نفاذ کی بھی کوشش کی۔ شریعت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ضوابط ("secular" laws) بھی بنائے تاکہ وہ اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بھی انصاف کر سکیں۔ برنی انہیں ضوابط کو جہانداری کا نام دیتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ضیاء الدین برنی، علاالدین خلجی کے عہد کے ایک قاضی مغیث الدین کی سلطان سے بات چیت کا ذکر کرتا ہے۔ یہ بات چیت مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ہے۔ قاضی مغیث نے کہا کہ شریعت (اسلامی قانون) کے مطابق مال غنیمت کا زیادہ حصہ سلطان اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ جواب میں سلطان نے یہ کہا کہ وہ ریاست کی ضرورتوں کے مطابق ہی کام کرے گا چاہے شریعت میں اس کی اجازت ہو یا نہ ہو۔ وہ ریاست کی فلاح و بہبود کو ترجیح دے گا۔ سلطان کے اس ایک جملے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت عملاً مذہبی ریاست نہیں تھی حالانکہ سلاطین، مذہب اسلام کے پیرو تھے پھر بھی ریاست کے اصول و ضوابط کا تعین خاص ضرورتوں اور حالات کے مد نظر ہی ہوتا تھا۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت اپنی ان کے معتدبہ حصے میں قانوناً مشرقی خلافت کا ایک حصہ رہی مگر تمام عملی اعتبارات سے وہ ایک آزاد مملکت تھی۔

عہد سلطنت میں صوبائی اور علاقائی حکومتوں کے ڈھانچے اور طریقہ کار کے متعلق بہت کم معلومات موجود ہیں۔ ابتدا میں سلطنت خود ایک لچک دار ڈھانچے کی شکل میں تھی جو متعدد فوجی کمانوں (علاقوں) پر مشتمل تھی۔ کمان دار اپنے اپنے علاقوں میں ہندو سرداروں کو زیر نگیں کرنے اور ان سے اپنی فوج کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقمیں حاصل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ایسے حالات میں پوری قلمرو میں شہری انتظامیہ کا تصور بڑا مشکل تھا۔ خلجی عہد میں ہمیں والی اور مقطی کے نام نظر آتے ہیں جو ان ٹکڑوں کے کمانڈر اور منتظم ہوتے تھے جنہیں اقطاع یا ولایت کہا جاتا تھا۔ ان الفاظ کے لیے جو اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے وہ صوبہ ہے اور ان کا سربراہ گورنر کہلاتا تھا۔ گورنر اور مقطی کے اختیارات حالات کی مناسبت سے مختلف ہوتے تھے۔ دہلی کی وسیع سلطنت انتظامی سہولتوں کے لحاظ سے متعدد ولایتوں، اقلیموں اور اقطاع میں تقسیم کی گئی تھی۔ یہاں کے حاکموں کو والی یا مقطی کہا جاتا تھا، صوبہ کی اصطلاح کا رواج بعد میں ہوا۔ آسانی کے لحاظ سے مورخین نے ولایتوں، اقلیموں اور اقطاع کے لیے (province) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہم بھی جب اس اصطلاح کو استعمال کریں گے تو اس سے مراد وہی حصے ہونگے جن کا ذکر فارسی ماخذ میں اقلیم، ولایت یا اقطاع کے تحت کیا گیا ہے۔ صوبوں کی تعداد سلطنت کی وسعت کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ گورنر (والی یا مقطی) اپنے صوبہ میں فوجی اور انتظامی معاملات کا مکمل اختیار رکھتا تھا۔ صوبہ کا انتظام قریب قریب اسی طریقہ اور طرز پر ہوتا تھا جو مرکز میں تھا۔ اس دور میں گورنر کے اختیارات بہت وسیع تھے، رسل و رسائل کے ذرائع اس قدر کم اور کم رفتار تھے کے دور دراز کے علاقوں میں بڑے گورنر جن کے وسائل زیادہ ہوتے تھے کم و بیش نیم خود مختار حکمراں بن جاتے تھے۔ لکھنوتی یعنی بنگال کے گورنر کی مثال اس سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ دہلی سے دور بھی ہوتا تھا اور اس کی ولایت بھی وسیع تھی چنانچہ اس کو مرکز کے خلاف بغاوت میں سہولت تھی، یہی سبب تھا کہ علاء الدین خلجی نے ابتدا میں دکن کی ریاستوں کو ان کے قدیم حکمرانوں کے ہی سپرد کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حکمرانوں کے اختیارات بہت وسیع تھے، گورنروں کے جملہ اختیارات سے متعلق تاج المآثر کا مصنف حسن نظامی لکھتا ہے کہ وہ ایک اعلی عہدیدار ہوتا

تھا جس سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ حکومت کے جملہ ملازمین کی نگرانی کرے گا جن میں فوجی بھی شامل ہیں۔اس کام میں اس کو بہت احتیاط سے کام لیناپڑتا تھاتا کہ وہ شجاعت وسخاوت کی ان روایات کو قائم رکھ سکے جن کے ذریعہ ابدی نیک نامی حاصل ہوتی ہے۔ گورنر کے فرائض سلطان کی مخصوص پالیسیوں کے پیش نظر کم زیادہ ہوتے رہتے تھے، لیکن اس کا اہم ترین فرض یہ تھا کہ مرکز کی پالیسی کو عملی شکل دینے کی ہر کوشش کرے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دلی سلطنت کے مرکزی، صوبائی اور مقامی ونسق کو سمجھ سکیں گے۔
- سلطان کے مرتبے اور اختیارات کو جان سکیں گے۔
- وزرا، محکمہ جات اور ان کے فرائض کی جانکاری حاصل کر سکیں گے۔
- عدالتی اور قانونی نظام کو سمجھ سکیں گے۔
- دہلی سلطنت میں اقطاع نظام کے بارے میں جان سکیں گے۔
- افسران جیسے والی، برید، دیوان اور انتظامی تقسیم جیسے، اقطاع، شق، پرگنہ وغیرہ کے بارے میں جان سکیں گے

6.2 مرکزی نظم ونسق (Central Administration)

دہلی سلطنت کے مرکزی نظم نسق کے امور سلطان کی موجودگی میں مختلف وزیروں یا امیروں کی دیکھ ریکھ میں انجام پذیر ہوتے تھے۔ سلاطین ریاست کی فلاح وبہبود کو مد نظر رکھتے ہوئے ضابطے اور توانین بناتے تھے، خطبہ اور سکے اقتدار کا مظہر سمجھے جاتے تھے۔ خطبہ جو ایک مذہبی پیغام ہوا کرتا تھا اور خصوصا جمعہ کی نماز سے پہلے دیا جاتا تھا اس میں سلطان کا نام خاص طور سے لیا جاتا تھا۔ سکوں کو جاری کرنا بھی اقتدار اعلیٰ کا مظہر تھا اور سکوں پر سلطان کا نام کندہ ہوا کرتا تھا۔ پوری سلطنت میں نظم ونسق کو قائم رکھنے امن وامان بنائے رکھنے کے لیے بہت سے انتظامی شعبے قائم کیے گئے تھے۔ ان انتظامی شعبہ جات کا مطالعہ کرنے سے سلطان کا مرتبہ اور اختیارات کے بارے میں معلومات فراہم کر لیں۔

6.3 سلطان کا مرتبہ اور اختیارات (Position and Powers of the Sultan)

دہلی سلطنت میں انتظامیہ کی جو ساخت ابھری وہ بنیادی طور پر عباسی طرز حکومت اور اس کے بعد غزنوی اور سلجوقی نظام حکومت پر مبنی تھی۔ اس پر قدیم ہندوستانی انتظامیہ اور کسی قدر ہندوستان کے حالات اور یہاں کی روایات کا بھی اثر تھا۔ سلاطین دہلی نے سلطنت کو بحسن و خوبی چلانے کے لیے ایک مستحکم نظام حکومت قائم کیا جس کی پیروی شیر شاہ سوری اور اس کے بعد مغل حکمرانوں نے بھی کی۔ سلطان مملکت کا

سر براہ اور اس کی افواج کا سپہ سالار اعظم ہوتا تھا۔ قانوناً وہ شریعت کا پابند ہوتا تھا۔ وہ نظم حکومت کا محور ہوتا تھا۔ اس کا دربار ہی سلطنت کی سیاسی اور معاشی زندگی کا مرکز ہوتا تھا۔ سلطان علوم وفنون کا سب بڑا سرپرست تھا۔ سلطان کو شریعت کے لازمی اجزا میں ردوبدل کا کوئی اختیار نہیں تھا مگر وہ قانون کی تفسیر وتشریح کا محدود حق رکھتا تھا۔

دہلی سلطنت میں سلطان کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی، وہ انتظامیہ کا محور، فوج کا سپہ سالار اعظم اور تمام عدالتی معاملات میں منصف اعلیٰ ہوتا تھا، وہ عزت واقتدار کا منبع اور سرچشمہ تھا، ضیاالدین برنی کے مطابق ''بادشاہ کا قلب خدا کا آئینہ تھا یعنی وہ اللہ کی منشا کا مظہر تھا جس کا مطلب یہ بھی تھا کہ بادشاہ کے افعال پر نکتہ چینی نہیں کی جاسکتی تھی، پورے سلطنت عہد میں سلطان ہی حکمرانی اور حکومت کا محور ومرکز ہوتا تھا، طاقتور سلاطین جیسے بلبن اور علاالدین خلجی آمرانہ انداز میں کام کرتے تھے، اس عہد میں تخت نشینی کا کوئی باضابطہ قانون نہیں تھا حصول اقتدار کے لیے بھائیوں کے مابین جنگ ہوا کرتی تھی، سلاطین کا دربار سیاسی ہوا کرتا تھا، سلطان عام طور پر مملکت کے اہم ترین امور کو اپنی مجلس (جسے مجلس خلوت بھی کہتے تھے) میں بحث کے لیے رکھتا تھا، اس مجلس میں وزرا کے علاوہ معتمد عہدہ دار بھی حاضر رہتے تھے لیکن اس مجلس کی کوئی دستوری حیثیت نہیں تھی بلکہ یہ ایک مشاورتی مجلس ہوتی تھی، اس کے فیصلے سلطان پر لاگو نہیں ہوا کرتے تھے۔

حکمرانی کے عمل میں سلطان کو بہت سے وزیر مدد دیتے تھے۔ ہر ایک وزیر کو سلطان منتخب کرتا تھا اور وہ سلطان کی مرضی تک اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ سلطان کا مشیر خاص وزیر ہوتا تھا اور وہی عام طور پر حکومت کے پورے تنظیم کا نگراں بھی مانا جاتا تھا۔ اس کے کاموں میں اہم ترین کام شعبہ مالیات کا انتظام ہوتا تھا۔ ہر کام بحسن وخوبی انجام پائے اس کے لیے عہدیداروں، نقیبوں اور چوبداروں کے ایک بڑے عملے کی ضرورت ہوتی تھی۔ سلطان کا حفاظتی دستہ، اس کے ذاتی خدام، محل کا محافظ دستہ، شاہی محل میں رہنے والوں کی خدمت کے لیے عملہ اور بہت سے دوسرے کارکنوں کی ایک بڑی فوج ہوتی تھی۔ مملکت کے نظم ونسق میں شاہی محل کا بھی حصہ ہوتا تھا جس میں وکیل در، امیر حاجب، نقیب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مرکزی حکومت کو چلانے کے لیے مختلف وزارتوں کے تحت بہت سے محکمے بھی قائم تھے۔

6.4 وزرا، محکمہ جات اور ان کے فرائض (Ministers, Departments, and Their Duties)

وزرا اور مختلف قسم کے عہدیداران سلطان کی مدد کیا کرتے تھے، وزیروں کی تعداد متعین نہیں تھی، وہ وزرا جو سلطان کی مدد کیا کرتے تھے، ان میں وزیر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، وزیروں کی کوئی کونسل تشکیل نہیں دی جاتی تھی، کیونکہ مشترکہ ذمہ داری کا تصور ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

6.4.1 وزیر (Minister)

وزیر کی صلاحیت، لیاقت، حکومت میں اس کے کردار اور اختیارات وغیرہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، سلجوقیوں کے وزیر نظام الملک (جن کی کتاب سیاست نامہ ہے) کے مطابق وزیر کو اہل کتاب ہونا چاہیے یعنی جنگجو کے مقابلے میں صاحب علم وفضل ہونا چاہیے، اسے وسیع

تجربہ کار، فہیم وذکی اور ہوشمند ہونا چاہیے تاکہ سلطان اس سے کسی مسئلے میں مشورہ کر سکے، اسے موقع شناس بھی ہونا چاہیے، مسلم سیاسی مفکرین کے مطابق دو قسم کے وزیر ہوتے تھے:

1. وزیر تفویض: وہ وزیر جسے اپنا جانشین مقرر کرنے کے علاوہ ہر طرح کے لامحدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔
2. وزیر تنفیذ: وہ وزیر جو صرف حکمراں کے احکامات کی تعمیل کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

دہلی سلطنت میں مذکورہ دونوں طرح کے وزرا ہوا کرتے تھے۔

مسلم سیاسی مفکر وزیر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ الفخری کہتا ہے کہ ''وزیر فرماں روا اور رعایا کے بیچ میں ہوتا ہے'' فخر مدبر لکھتا ہے کہ ''کوئی سلطنت وزیر کے بغیر پائیدار یا خوش حال نہیں ہو سکتی''، وزارت قانوناً سلطان یا خلیفہ کی نیابت ہے۔ اکثر وزیر مخصوص اور محدود اختیارات رکھتے تھے۔ جن وزرا کو غیر محدود اختیار حاصل تھا، وہ سلاطین کے نام سے سلطنت پر حکومت کرتے تھے۔ سلاطین دہلی کے ماتحت وزیر مہذب اور تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ خان جہاں مقبول جو قابل ترین وزرا میں سے تھا باوجود ناقص تعلیم کے سب سے زیادہ دانش مند تھا۔ سلطنت دہلی کی تاریخ میں وہی ایک ایسا وزیر تھا جو کم پڑھا لکھا تھا۔ سلاطین اکثر دربار عام میں وزیر کی معرفت تمام سوالات کرتے تھے۔ وزیر کے فرائض منصبی میں فوجی مہمات کی رہنمائی کرنا، ممالک کو فتح کرنا، انعامات دینا اور بزم ورزم میں آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہونا، خزانے میں دولت جمع کرنا، عہدیداروں کا تقرر کرنا وغیرہ، غرض کہ وزیر پورے نظام حکومت کا سر براہ ہوتا تھا، مرکزی دیوان مالیات سے اس کا براہ راست تعلق ہوتا تھا، وزیر مختلف اقسام کے مصارف کی نگرانی بھی کرتا تھا، وزیر کا فرض ہوتا تھا کہ وہ فرماں روا کو بہت سے مختلف النوع مسائل پر مشورہ دیتا رہے۔

6.4.2 دیوان وزارت (Ministry of Finance)

وزیر کا محکمہ دیوان وزارت کہلاتا تھا، مالیات سے اس کا تعلق ہوتا تھا، اس کی مدد ایک نائب وزیر کرتا تھا، اس کے بعد مشرف ممالک ہوتا تھا جو پوری سلطنت کا محاسب اعلیٰ (اکاونٹنٹ جنرل) ہوتا تھا، مستوفی ممالک حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا (یہ آڈیٹر جنرل کے مشابہ ہوتا تھا) مشرف کا فرض ہوتا تھا کہ صوبوں اور مختلف محکموں سے جو حسابات موصول ہوں انہیں درج کرلے اور مستوفی ان کی جانچ پڑتال کرتا تھا، حسابات کے گوشواروں کی الگ الگ نقلیں مشرف اور مستوفی کو بھیجی جاتی تھیں، فیروز شاہ کے زمانے میں مشرف آمدنی سے واسطہ رکھنے لگا اور مستوفی کا تعلق خرچ سے ہو گیا، مشرف کی مدد کے لیے ایک ناظر ہوتا تھا جو مال گزاری کی وصولیابی کا نگراں ہوتا تھا، وہ مقامی حسابات کی جانچ پڑتال بھی کرتا تھا، مشرف ممالک اور مستوفی ممالک دونوں وزارتی درجے کے عہدے دار ہوتے تھے اور سلطان کی خدمت میں براہ راست رسوخ رکھتے تھے، وزیر کو عموماً ''صدر عالی'' کہا جاتا تھا اور خواجہ جہاں بھی کہا جاتا تھا یہی زیادہ مستعمل تھا، اسی طرح دیوان وقوف (خرچ کے کاغذات کو تیار کرنے والا شعبہ) دیوان مستخرج (وصول کیے گئے ایڈیشنل محصول کی دیکھ بھال کرنے والا شعبہ) اور دیوان امیر کوہی (نظام مال گزاری اور زراعت کی ترقی کے لیے شعبہ) دیوان وزارت سے متعلق ہوتا تھا، اس کے علاوہ تین اور بڑی وزارتیں تھیں، جن میں دیوان رسالت، دیوان عرض یا عارض ممالک اور دیوان انشا قابل ذکر ہیں۔

6.4.3 دیوان رسالت (Ministry of Ecclesiastical Affairs)

دیوان رسالت ان چار خاص وزارتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر ضیاءالدین برنی نے کیا ہے، دیوان رسالت کے ذریعہ مذہبی اور دینی امور انجام پاتے تھے۔ مستحق علما و صلحا کو وظائف بھی دیوان رسالت ہی سے ملتے تھے، اس کا صدر صدر الصدور کہلاتا تھا جو عموماً قاضی ممالک بھی ہوتا تھا اور اس حیثیت سے محکمہ عدل کی نگرانی بھی کرتا تھا، وظائف اور بے محصول زمینیں عطا کرنے کے علاوہ صدر کے محکمے کا ایک کام عوامی اخلاق کے نگراں محتسبوں کا تقرر بھی کرنا تھا۔ محتسب کا کام تھا کہ لوگ شراب نوشی سے باز رہیں، نماز روزہ کے پابند ہیں اور شرع کی پابندی کریں، ساتھ ہی ناپ تول کی جانچ پڑتال بھی محتسب کے ذمہ ہوتی تھی اور یہ سب کام دیوان رسالت کے دائرۂ اختیار میں آتے تھے، فیروز شاہ تغلق نے عوام کی شکایات سننے والا ایک محکمہ بھی قائم کیا اور اسے دیوان رسالت کا نام دیا، اس کا سربراہ کوئی ممتاز امیر غالباً وکیل در ہوتا تھا، اسی طرح علاالدین خلجی نے بازاروں پر نگاہ رکھنے کے لیے شحنہ مقرر کیا اور ان کے کام کی نگرانی کے لیے ایک بڑے امیر کو مقرر کیا، مں دیوان رسالت کہلاتا تھا، اس طرح دیوان رسالت کی شکل مختلف حکمرانوں کے عہد میں مختلف رہی لیکن ضرورت مندوں میں وظائف اور بے محصول زمینوں کی تقسیم کے کام غالباً تمام عرصے میں دیوان رسالت کے پاس ہی رہا۔

6.4.4 دیوان عرض (Ministry of Defence)

ایک وزارت جنگ کے لیے ہوتی تھی جسے دیوان عرض کہتے تھے، عارض ممالک اس کا سربراہ ہوتا تھا، یہ فوجی معاملات کے پورے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا تھا، وہ فوجی بھرتی کے لیے صدر عہدے دار کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور فوجیوں کی تنخواہ مقرر کرتا تھا، ہر چھ سال میں کم سے کم ایک مرتبہ سوار سپاہیوں کا معائنہ کرتا تھا اور ہر سوار کے ساز و سامان اور سواری کے گھوڑے کی حالت جانچتا تھا، سپاہیوں کی ترقی اور تنزل کا انحصار عارض پر ہوتا تھا، جب بھی کوئی مہم شروع کی جاتی تو اس کی تیاریاں عارض کے ذمہ ہوتیں، فوج کی تنخواہوں کی ادائیگی کا ذمہ دار بھی عارض ہوتا تھا، تمام اہم جنگوں میں عارض خود فوج کے ساتھ ہوتا تھا، رسد اور حمل و نقل کے معاملات کی نگرانی بھی عارض کرتا تھا، عارض کی مدد کے لیے محرروں کا ایک بڑا عملہ ہوتا تھا اور مرکز و صوبوں میں اس کے نائبین ہوتے تھے، عارض ممالک گھوڑوں اور آدمیوں کے حلیوں کی فہرست رکھتا تھا اور وہ خود افواج کا نگران اعلی ہوتا تھا، عارض کا عہدہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا تھا اور یہ وزیر کے اختیارات کو بھی کسی قدر محدود کرتا تھا۔

6.4.5 دیوانِ انشاء (Ministry of Correspondence)

دیوان انشا، یہ خط و کتابت کا شعبہ تھا، اس کا افسر دبیر خاص یا امیر منشی کہلاتا تھا، شاہی اعلانات اور فرامین کا مسودہ تیار کرنا اور انہیں متعلقہ افسران تک بھیجناری کا کام تھا، دبیر خاص کی مدد کے لیے بہت سے دبیر (منشی) ہوا کرتے تھے، دیوان انشا سے ہی سے سلطان کے فرمان جاری ہوتے تھے، دیوان انشا کے فرائض میں یہ بات شامل تھی کہ وہ پڑوسی ملک کے حالات پر متواتر نگاہ رکھے اور ان سے حکمراں کو مطلع کرتا رہے، کبھی کبھی پڑوسی حکمراں اور شہزادوں کو باقاعدہ شاہی تحریریں بھیجی جاتی تھیں جن کے ذریعہ کی نئی تخت نشینی، کسی اہم واقعے بات کی

اطلاع دی جاتی تھی، اہم اقطاع داروں اور آس پاس کے راجاؤں کو بھی دبیر ہی مختلف قسم کے خطوط اور پیغامات بھیجنے کا ذمہ دار ہوتا تھا، یہ بڑی اہمیت اور ذمہ داری کا عہدہ تھا۔

6.4.6 دربار اور شاہی حرم کے امور (Affairs of the Court, and the Royal Harem)

شاہی حرم کے امور کا سب سے اہم افسر وکیل در ہوتا تھا۔ یہ شاہی حرم کے تمام کاموں کا نگراں ہوتا تھا جس میں شاہی مطبخ اور شاہی اصطبل شامل تھا۔ شہزادوں کی تعلیم کی ذمہ داری بھی اسی کی ہوتی تھی، یہ عہدہ بہت اعلی رتبے کے امیر کو سونپا جاتا تھا۔ ایک عہدہ امیر حاجب کا ہوتا تھا جسے باربک بھی کہتے تھے۔ یہ درباری تقریبات کا منتظم ہوتا تھا۔ سلطان کے سامنے پیش کی جانے والی تمام درخواستیں اور استغاثے اسی کے توسط سے آگے بڑھتے تھے۔ ایک شعبہ برید خاص کا تھا۔ یہ جاسوسی یا خبر رسانی شعبے کا سربراہ ہوتا تھا۔ جاسوس یا برید سلطنت کے مختلف حصوں میں مقرر کیے جاتے تھے اور سلطان کو تمام معاملات سے مطلع کرنا انہیں کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ ایک محکمہ کارخانہ یا شاہی اسٹور اور دوسرا امور عامہ (پبلکس ورکس) کا شعبہ تھا جس کا کوئی امیر نگراں ہوتا تھا۔ کارخانہ شاہی ضرورتوں اور شاہی حرم کے لیے تمام ضروری اشیا کی پیداوار اور فراہمی کا ذمہ دار تھا۔

6.4.7 عدل وانصاف (Justice)

عدل وانصاف کے لیے دیوان قضا قائم تھا جس کا سربراہ قاضی ممالک ہوتا تھا۔ اسے قاضی القضاہ بھی کہا جاتا تھا اور اس کا دفتر دارالحکومت میں ہی ہوتا تھا۔ سلطنت کے تمام مقدمات اسی کی نگرانی میں فیصل ہوتے تھے۔ حالانکہ آخری اپیل سلطان کے حضور کی جاسکتی تھی جس کا فیصلہ حتمی تھا۔ اس کے علاوہ تمام شرعی اور مذہبی امور کی دیکھ بھال قاضی القضاۃ کی ذمے داری تھی۔ وہ ماتحت عدالتوں کے فیصلے کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرتا تھا اور مقامی قاضی مقرر کرتا تھا۔ دارالحکومت کے علاوہ ہر شہر میں ایک قاضی ہوتا تھا۔

6.4.8 امیر داد (Amirdad)

انصاف سے متعلق ایک اور عہدے دار بھی ہوتا تھا جسے امیر داد کہتے تھے۔ دارالحکومت میں امیر داد کا عہدہ اہمیت رکھتا تھا۔ سلطان کی غیر حاضری میں امیر داد ہی عدالت کا مسند نشین ہوتا تھا اور سلطان کی موجودگی میں وہ عدالت کے انتظام وانصرام اور اس کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ امیر داد مسجدوں اور عمارت عامہ کی دیکھ بھال کے علاوہ کوتوال، پولیس اور محتسب کا نگراں ہوتا تھا۔

6.4.9 ڈاک، پولیس اور خفیہ نظام (Postal, Police, and Espionage Systems)

سلطنت کے تمام حصوں سے اطلاعات فراہم کرنے، امن وامان قائم رکھنے اور امرا پر کنٹرول بنائے رکھنے کے لیے ڈاک، پولیس اور جاسوسی کا سہارا لیا جاتا تھا۔ پولیس کے محکمے کے روز مرہ کے فرائض کوتوال انجام دیتا تھا۔ اس کا دائرہ اختیارات دیہاتی علاقوں پر بھی محیط ہوتا تھا۔ مقدمات کی تفتیش کے علاوہ امن وامان بنائے رکھنے کی ذمہ داری کوتوال کی ہوتی تھی۔ بلبن اور علاء الدین خلجی نے ایک جاسوسی کا شعبہ بھی

قائم کیا تھا جہاں سے سلطان کو ہر اہم واقعہ کی خبر مل جایا کرتی تھی۔

6.4.10 نظام مال گزاری (Revenue System)

عہد وسطی میں دہلی سلطنت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زمین کا محصول تھا۔ زیر کاشت زمین دو قسموں میں منقسم تھی:

عشری: عشری زمین وہ ہوتی تھی جس پر مسلمان کاشت کرتے تھے۔ عشری زمین خراجی کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔

خراجی: خراج کا لفظ آرامی زبان میں پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے موجود تھا۔ وہ تمام زمینیں جو طاقت کے زور پر فتح کرنے کے بعد مسلم سپاہیوں میں نہ تقسیم کر کے غیر مسلم حکمرانوں یا غیر مسلم کسانوں کو دے دی گئی ہوں، خراجی زمینیں کہلاتی تھیں۔

ان زمینوں پر حکومت کے حصے کی رقم یا محصول کتنا مقرر کیا جائے اس کا فیصلہ تجربہ کار اور مہارت رکھنے والے لوگ کھڑی فصل کی قیمت کے اندازہ سے کرتے تھے اور اسی بنیاد پر حکومت اور محصول دینے والے کے درمیان معاملہ طے پا جاتا۔ ایک دوسرا طریقہ یہ تھا کہ گزشتہ برسوں کی پیداوار کی بنیاد پر قیمت کا اندازہ لگا لیا جاتا تھا اور اسی حساب سے حکومت کے حصے کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے زمین کی پیمائش ضروری تھی جسے مساحت کہا جاتا تھا۔ یہی طریقہ تھا جن کا سلطنت کے مختلف علاقوں میں رواج تھا اور ان ہی کے ذریعے حکومت / سلطنت کے حصے کی رقم یا قیمت مقرر کی جاتی تھی۔

سلطان علاءالدین خلجی کے عہد تک بٹائی کا رواج عام تھا کیونکہ برنی کے بیان کے مطابق اس نے پیمائش کا طریقہ اختیار کیا۔ غیاث الدین تغلق نے اس کو بدل کر بٹائی کو ترجیح دی لیکن کہیں کہیں پیمائش کا طریقہ بھی جاری رہا۔ پیداوار پر محصول کی شرح کیا تھی اس سے متعلق دستیاب شہادتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قطب الدین ایبک نے پیداوار کا پانچواں حصہ مقرر کیا تھا۔ علاءالدین خلجی کے عہد میں اس میں اضافہ کیا گیا۔ دوآب میں اس نے بعض انتظامی اور زرعی ضرورتوں کے تحت شرح محصول بڑھا کر پیداوار کا نصف کر دی تھی، جب کہ دوسری جگہوں پر پیداوار کا 1/3 لیا جاتا رہا۔ حکومت کے واجبات نقد اور جنس دونوں شکلوں میں لیے جاتے تھے۔ علاءالدین خلجی نے جب اشیا کے نرخ مقرر کیے اور سرکاری گودام اور ذخیرے قائم ہوئے تو اس نے دوآبہ کے علاقہ میں حکومت کا محصول جنس کی شکل میں وصول کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ محمد بن تغلق نے اپنے پیشرو کی مقرر کی ہوئی شرح کو جاری رکھا لیکن دوآبہ کے علاقہ میں جہاں کے لوگوں کو وہ آئے دن کی بغاوتوں کی سزا دینا چاہتا تھا اس نے اضافہ کیا جو کہیں پانچ اور کہیں دس فیصد تھا۔ سلطنت دہلی نے فصلوں کی مکمل یا جزوی خرابی کے لیے مراعات دی تھیں۔ برنی نے بٹائی کے طریقے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی وجہ سے آفات ارضی وسماوی کا لحاظ رکھنا یا ان زمینوں میں جن سے پیداوار ہوتی ہے اور جن سے پیداوار نہیں ہوتی امتیاز کرنا ضروری نہیں رہا۔

محصولات

دہلی سلطنت میں زکوٰۃ، جزیہ، خراج، جزاری، گھرائی، چرائی وغیرہ جیسے محصول لیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مال غنیمت میں سے بھی حکومت کو ایک مخصوص حصہ ملتا تھا۔

زکوۃ: زکوٰۃ یہ مال پر ڈھائی فیصد تھی۔ زکوۃ سونے چاندی اور دوسرے مال پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب اس کی مقررہ مقدار (نصاب) ایک شخص کی ملکیت میں سال بھر سے زیادہ رہے اور نصاب سے اوپر رہے تو اس پر ڈھائی فیصد زکوٰۃ واجب ہے۔ میر شاہ نے زکوٰۃ کو حکومت کے باضابطہ محاصل میں شامل کیا ہے جب کہ فقہ فیروز شاہی میں زکوۃ کے لیے ایک علاحدہ خزانے کا تذکرہ ہے۔

جزیہ: یہ ان غیر مسلموں پر لگایا جاتا ہے جو اسلامی ریاست کے شہری ہوں ان کو ذمی کہتے ہیں۔ ذمی اسلامی ریاست میں فوجی خدمات سے بری تھے اس لیے ان کو ایک مقررہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ جزیہ عورتوں بچوں اور ضعیفوں سے نہیں لیا جاتا تھا بلکہ غربا بھی اس سے مستثنیٰ تھے۔ برہمنوں اور پنڈتوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا، جزیہ کی رقم زیادہ نہ تھی اور سلطنت میں سب سے کم استطاعت رکھنے والا طبقہ دس تنکہ، متوسط طبقہ بیس تنکہ، اور مالدار طبقہ چالیس تنکہ ادا کرتا تھا۔ چونکہ دہلی سلطنت اسلامی ریاست نہیں تھی، اس لیے اس کو جزیہ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

خراج: خراج کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- **خراج وظیفہ:** خراج وظیفہ جو نقد اور جنس کی شکل میں رقبے کی وحدت پر پیداشدہ فصلوں کی اقسام کے مطابق مقرر کی جاتی ہیں۔
- **خراج مقاسمہ:** پیداوار کے ایک خاص حصے کو لینے کے طریقہ کو خراج مقاسم کہتے ہیں۔

ان ٹیکسوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے محصول بھی بعض سلاطین کے زمانہ میں وصول کیے جاتے تھے مثلاً جزاری (ذبح کیے جانے والے جانوروں پر) چرائی وغیرہ (مویشیوں کی چرائی پر)۔ ان میں سے بہت سے محصول ہندوستان میں پہلے سے رائج تھے مسلمانوں نے ان کو جاری رکھا لیکن فیروز شاہ کے عہد میں شرعی قوانین سے جواز نہ ملنے کی وجہ سے انہیں بند کر دیا گیا۔

مال غنیمت: جنگ میں جو مال ہاتھ لگے اسے ''غنیمت'' کہتے ہیں۔ قانوناً ایسے تمام مال کو جمع کرنا چاہیے اور اس کا پانچواں حصہ (خمس) مملکت کے لیے علیحدہ کر دینا چاہیے۔ باقی کو تمام سپاہوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ سلطان یا سپہ سالار کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی پسند کا کوئی جانور یا تلوار یا کوئی اور چیز اپنے استعمال کے لیے غنیمت کی تقسیم سے قبل الگ کر لے۔ اسے ''صفیہ'' کہتے ہیں اور تقسیم کے وقت اسے شمار نہیں کیا جاتا۔ جو حصہ بیت المال میں داخل ہوتا ہے وہ قانوناً ''خمس'' کہلاتا ہے۔ سلطنت دہلی میں بتدریج یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ سپاہیوں میں پانچواں حصہ تقسیم کیا جاتا اور 4/5 حصہ بیت المال میں رکھ لیا جاتا۔ فیروز شاہ کے علما نے اسے خلاف شرع قرار دیا اور اس نے پرانے طریقے کو پھر قائم کر دیا۔ جب غنیمت تقسیم ہوتی تھی تو ایک سوار سپاہی کو پیادے کے مقابلے میں دوگنا اور بعض اوقات تین گنا مال دیا جاتا تھا۔

6.5 اقطاع داری نظام (*Iqta* System)

التتمش نے سلطنت دہلی کے حکومتی ڈھانچے کو ایک شکل دی، اس نے اقطاع، فوج اور سکوں کا انتظام کیا۔ التتمش نے نظام حکومت میں جو اصلاحات کیں ان میں اقطاع داری نظام کی حیثیت ایک محور کی تھی۔ اقطاع کے لفظی معنی ایک ٹکڑے کے ہوتے ہیں۔ اسلامی فقہ کی اصطلاح میں قابل منتقلی زمینی محصول کا عطیہ (transferrable land revenue assignments) اقطاع کہلاتا تھا۔ اس کا

مطلب حکمراں کی جانب سے کسی فرد کو زمین کا محصول عطا کرنا ہے جو کبھی بھی واپس لیا جاسکتا ہے۔ ماوردی دو قسم کے اقطاع کا حوالہ دیتا ہے:

- اقطاع تملیک، جو کھیتی باڑی والی یا بنا کھیتی باڑی والی یا پھر کانوں والی زمین پر مشتمل تھی۔
- اقطاع استغلال کا تعلق وظائف یا بھتوں سے ہوتا تھا۔

سیاسی اور معاشی اداروں کی ترقی میں اقطاع کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے۔ اس کا وجود اسلام کے ابتدائی زمانہ سے ہی ہے۔ دہلی کے ابتدائی ترک سلاطین نے اس ادارے کا استعمال خصوصاً ہندوستانی سماج سے جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ کے لیے اور سلطنت کے دور دور تک پھیلے ہوئے حصوں کو ایک ہی مرکز سے جوڑ دینے کے لیے کیا۔ اس کے ذریعہ رسل ورسائل کے سلسلے کی مشکلات پر قابو پایا جاسکا اور نئے نئے مفتوحہ علاقوں سے مال گزاری اکٹھا کرنا ممکن ہوا۔ اس سے سلطنت کے تمام حصوں میں نظم وضبط کا قیام بھی ممکن ہو سکا۔ اقطاع داری نظام کے تحت جو اقطاع دیے جاتے تھے وہ دو قسم کے ہوتے تھے۔

- چھوٹے اقطاع جن کے ساتھ کسی طرح کی انتظامی ذمہ داری متعلق نہ تھی اور نہ ہی مرکزی خزانہ کو جواب دہی کرنا پڑتی تھی۔ چھوٹے اقطاع داروں کو صرف عسکری خدمات کے عوض زمین کے کسی حصہ کی مال گزاری کی وصولی کی اجازت تھی۔
- بڑے اقطاع (صوبے) جو باحیثیت لوگوں کی نگرانی میں دیے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ انتظامی ذمہ داری بھی متعلق تھی اور اقطاع دار سے یہ توقع رکھی جاتی کہ وہ اپنے علاقہ میں نظم وضبط بنائے رکھے اور ہنگامی حالات میں مرکز کو فوجی دستے بھیجے۔

التتمش نے ترکوں کو بڑے پیمانے پر اقطاع دیے۔ اس کا مقصد مقبوضہ علاقوں پر سخت کنٹرول رکھنا اور ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کا استیصال کرنا تھا۔ اقطاع داری نظام میں ایسے عناصر موجود تھے جو جاگیردارانہ خصوصیات اختیار کر سکتے تھے، اس لیے التتمش نے سختی سے اقطاع داروں کے اپنی جڑیں جما لینے کی روک تھام کی اور جاگیردارانہ موروثی نظام کو رد کر دیا۔ جاگیرداری کے برخلاف اقطاع کو نہ تو باپ دادا کی جائیداد سمجھا جاسکتا تھا نہ ہی مقطی ایک اقطاع سے دوسرے اقطاع میں منتقلی سے انکار کر سکتا تھا۔

اقطاع کی بناء اس اصول پر تھی کہ جو زمین بیکار پڑی ہے اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ زراعت کو ترقی ہو اور پیداوار بڑھے۔ لیکن اقطاع کا تعلق محض زمین کی آبادکاری سے نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق نظم ونسق، عمل داری اور سیاسی ضروریات سے بھی تھا۔ اگرچہ فتوحات اور انتظامی وفوجی ضروریات کی وجہ سے اقطاع کے اصول پر مختلف طریقے سے عمل کیا جاتا تھا، لیکن اس کا حتمی مقصد بہرحال یہ تھا کہ زمین غیر آباد نہ پڑی رہے اور اس کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہو۔

اقطاع کو زیادہ تر عسکری وں ہی کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا۔ جب تک اقطاع دار مملکت کی خدمت انجام دیتے، اقطاع کی آمدنی انہیں کو ملتی تھی۔ ان کی موت پر اقطاع پھر مملکت کو منتقل ہو جاتی تھی۔ رہے ان کے ورثاء تو انہیں دوسرے ذرائع سے کچھ وظیفہ دے دیا جاتا تھا۔ اقطاع دار کے بیمار پڑنے پر اور کام کے لائق نہ ہونے پر کچھ گذارا بھتہ مقرر کر دیا جاتا البتہ اقطاع دار کو نہ زمین کی ملکیت کا حق پہنچتا تھا اور نہ ہی وہ اسے وارثوں کو منتقل کر سکتا تھا۔

6.6 صوبائی اور مقامی حکومت (Provincial and Local Government)

ضیاءالدین برنی کے مطابق جب تک دہلی سلطنت میں جنوبی علاقہ شامل نہیں تھا، سلطنت میں کل بیس صوبے تھے۔ حالانکہ مغل سلطنت کے صوبوں کے مقابلے میں یہ چھوٹے تھے۔ محمد بن تغلق کے عہد میں شہاب الدین عمری کے مطابق صوبوں کی کل تعداد 24 تھی، جس میں مالا بار تک پورا ملک تقسیم تھا۔ صوبے کے علاوہ ضلع یا تعلقہ وغیرہ جیسی چھوٹی اکائیوں سے متعلق کوئی مستند معلومات دستیاب نہیں ہیں، البتہ پرگنہ صدی اور چوراسی کا ذکر ملتا ہے۔ صدی سو گاؤں کے مجموعے کو کہتے تھے جہاں چودھری، عامل یا محصول وصول کرنے والے مقرر کیے جاتے تھے۔ خوط اور مقدم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مقامی انتظامیہ بھی موجود تھی۔

نظم ونسق کی سہولت کے لیے سلطنت کو کئی اکائیوں میں تقسیم کیا گیا تھا، سب سے بڑی اکائی صوبہ یا اقطاع تھی۔ ان کی تعداد متعین نہیں تھی بلکہ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ سبھی اقطاع میں ایک جیسی انتظامی ساخت بھی نہیں تھی۔ ابتدا میں فاتح، فوجی سپہ سالار کو مفتوحہ علاقوں کا نظم ونسق سونپ کر اس علاقہ کو اقطاع کی شکل دے دیا کرتے تھے۔ سلطنت کی توسیع کے ساتھ ہی اقطاع کے علاوہ صوبے بھی بنائے گئے جیسے بنگال، گجرات، جونپور، مالوہ اور کچھ دکن کی ریاستیں وغیرہ۔ اس وجہ سے اقطاع اور مقطی سے زیادہ اہم صوبیدار، والی، ناظم یا نائب سلطان ہو گئے اور یہی پورے صوبے کے مالک ہوا کرتے تھے۔

6.6.1 صوبےدار یا والی (Governer or *Wali*)

صوبیدار یا والی پوری ریاست کے ناظم ہوا کرتے تھے۔ مرکز کا کنٹرول ان پر ہوتا تھا لیکن اندرونی معاملات میں انہیں پوری خود مختاری حاصل تھی۔ یہ اپنی فوج رکھتے تھے اور محصول کی وصولی کرتے تھے۔ صوبے میں نظم وضبط اور امن وامان بنائے رکھنا ان کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ یہ سلطان کو معاشی اور فوجی مدد بھی فراہم کرتے تھے۔ سلطان کی اجازت سے نئے علاقوں پر حملہ کر کے اسے فتح بھی کر سکتے تھے۔ طاقتور سلطان تو ہمیشہ ان صوبے داروں کو اپنے کنٹرول میں رکھتے تھے لیکن مرکزی طاقت کے کمزور پڑتے ہی اکثر یہ صوبے دار بغاوت کر دیا کرتے تھے۔ والی کا درجہ مقطی سے زیادہ بلند ہوتا تھا، کیوں کہ مقطی ہر صوبے دار کے لیے استعمال ہوتا تھا جب کہ والی کی اصطلاح صرف ان صوبے داروں کے لیے مخصوص تھی جو غیر معمولی اختیارات رکھتے تھے۔ صوبے دار کی ذمہ داریوں کا اندازہ ہم فیروز شاہ کی درج ذیل ہدایات سے لگا سکتے ہیں جو اس نے سندھ کے صوبے دار فتح خاں کو دی تھیں:

- انتظامیہ کے اعلی عہدیدار کی حیثیت سے کام کرنا۔
- رعایا کی حفاظت کرنا اور ان کے مفادات کی پاسبانی کرنا۔
- علما اور مذہبی لوگوں کی مدد کرنا۔
- فوج کو خوش اور مطمئن رکھنا۔
- صوبائی دیوان (شعبہ مالیات) کے کام کی نگرانی کرنا۔

- کسانوں کو استحصال اور ظلم سے محفوظ رکھنا۔
- سرکاری عہدیداروں کے کام کی نگرانی کرنا۔

فیروز شاہ نے یہ بھی ہدایات دی تھیں کہ صوبوں کے حکام تجارت کی ہمت افزائی کریں اور عام فلاح و بہبود کو ترقی دیں۔ والی ایسے عہدیدار ہوتے تھے جنہیں سلطان ان کے صوبوں میں متعین کرتا تھا اور ان کا تبادلہ، برخاستگی یا سزا اس کی مرضی پر موقوف ہوتی تھی۔ وہ اپنے صوبوں کا انتظام سلطان کے زیر احکام کرتے تھے اور وزارت مالیات کا ان پر سخت مالی انضباط ہوتا تھا۔ مور لینڈ کا یہ استدلال صحیح ہے کہ اس قسم کے عہدیدار کسی طرح جاگیردارانہ نوعیت کے نہیں ہوتے تھے بلکہ خالصتاً نوکر شاہی کے سیدھے سادھے رکن ہوتے تھے۔

6.6.2 برید (*Barid*)

ایک برید یا جاسوس افسر بھی صوبے میں متعین ہوتا تھا کہ وہ سلطان کو حالات سے باخبر رکھے۔ سلطان کے برید جو تمام سلطنت میں مختلف مقامات پر تعینات ہوتے تھے، اسے خبریں بھیجا کرتے تھے۔ سلطنت میں غیر ملکیوں کی آمد، خاص دلچسپی کے امور، مختلف عہدیداروں کے اعمال، بازاری گپ شپ سے متعلق خبریں برید دیتے تھے۔ برید سے قریبی تعلق رکھنے والا طریقہ گماشتوں اور جاسوسوں کا تھا جو مرکزی حکومت کو تمام واقعات سے باخبر رکھتا تھا۔ جہاں تک خبر رسائی کا تعلق ہے غیر ملکی سیاح سلاطین دہلی کے انتظامات خبر رسانی کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ شاہی ڈاک کے ذریعے پانچ دن میں سندھ کے خطوط دہلی پہنچ جاتے تھے، حالانکہ عام مسافر اس کو پچاس دن میں طے کرتے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ خبریں دو طریقوں سے پہنچائی جاتی تھیں، ایک گھڑسواروں کے ذریعہ اور دوسرے ہرکاروں کے ذریعہ۔ پہلے طریقے کے لیے ہر چار کروہ (کوس) پر گھوڑے بدلے جاتے تھے۔ ہرکاروں کو لیے ہر چوتھائی کروہ پر ایک اڈہ ہوتا تھا۔ ہر اڈے پر تین چھپرے ہوتے تھے جن میں پہلے سے آدمی تیار بیٹھے رہتے تھے کہ خط آئے اور اسے لے کر دوسری چوکی تک تیزی سے دوڑ جائیں۔ دوڑنے والا ہرکارہ ایک لاٹھی لیکر چلتا تھا جس کے دوسرے سرے پر گھنگرو بندھے ہوتے تھے۔ ان گھنگروؤں کی آواز سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہرکارہ پہنچ رہا ہے۔ ایسے دس دوڑنے والے جنہیں "دھاوے" کہتے تھے ہر چوکی پر رکھے جاتے تھے۔ دھاووں کی یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے زیادہ تیز ہوتی تھی، اسے الاغ کہتے تھے۔

محمد بن تغلق نے ہرکاروں کی ڈاک کے علاوہ ایک اور طریقہ کار بھی منظم کیا جس سے علامتی اشاروں کو بڑی سرعت کے ساتھ منتقل کیا جا سکتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں کے درمیان نقار خانوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا تھا جس کے ذریعے خطرے کا ڈنکا اگر کسی دور دراز سرحد پر بجتا تھا تو بڑی تیزی سے سلطان تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ ڈاک سے نجی خطوط بھی جاتے تھے مگر یہ امر یقینی ہے کہ جو سپاہی فوجی مہمات پر جاتے تھے وہ اپنے خاندانوں کے ساتھ خط و کتابت کر سکتے تھے۔ ڈاک سے قریبی تعلق رکھنے والا ایک طریقہ گماشتوں اور جاسوسوں کا تھا جو مرکزی حکومت کو تمام واقعات سے باخبر رکھتا تھا اس کا اثر مقامی عہدیداروں پر بہت اچھا ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے اعمال سلطان اور اس کے وزرا سے پوشیدہ نہیں رہیں گے۔

6.6.3 دیوان (*Diwan*)

ہر صوبے میں ایک دیوان ہوا تھا جسے آسانی کے لیے خواجہ کہتے تھے اور جس کا تقرر سلطان، وزیر کی سفارش پر کرتا تھا وہ عموماً ایک ماہر محاسب ہوتا تھا اس کا فرض یہ ہوتا تھا کہ حسابات رکھے اور راجدھانی کو مکمل گوشوارے بھیجتا رہے۔ وزیر کا محکمہ ان ہی گوشواروں کی بنا پر مقطی سے تمام حساب کتاب طے کرتا تھا۔ سرکاری طور پر دیوان (خواجہ) حاکم صوبہ کے ماتحت ہوتا تھا مگر براہ راست سلطان کی طرف سے اس کے تقرر اور وزیر کے ساتھ اس کے روابط کے باعث وہ بڑا ذی اقتدار ہوتا تھا اور اس کی موجودگی حاکم صوبہ کے اختیارات پر ایک بندش کا کام دیتی تھی۔ ابن بطوطہ نے ایک صوبے میں کسی امیر کے ساتھ ایک والی الخراج کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اول الذکر حاکم صوبہ ہے اور موخر الذکر خواجہ۔ ابن بطوطہ نے دیوان کے لیے والی کا لفظ استعمال کیا ہے اس بات کا مظہر ہے کہ اس کے اختیارات وسیع تھے، بعض اوقات حاکم صوبہ کا ایک نائب بھی ہوتا تھا جسے سلطان مقرر کرتا تھا۔

6.6.4 شق (*Shiq*)

مور لینڈ لکھتا ہے کہ چودھویں صدی کے دوران (شق) کا لفظ ان اصطلاحات کے لیے استعمال ہونے لگا تھا جن کا ترجمہ میں نے ''صوبہ'' کے لفظ سے کیا ہے مگر قرین قیاس یہ ہے کہ ہندو سرداروں کا اقتدار ختم ہونے اور براہ راست انتظام کے نشو و نما پانے پر اصلی صوبے بہت زیادہ بڑے ثابت ہوئے۔ اور ان میں سے بعض صوبوں کو چھوٹے چھوٹے انتظامی علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا مثلاً محمد بن تغلق نے دکن کی ولایت کو چار شقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسی سلطان نے دوآب کے صوبے میں بغاوت کو جس طرح فرو کیا تھا اس پر برنی کہتا ہے کہ شق داروں اور فوج داروں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ باغیوں کو لوٹ لیں اور گرفتار کر لیں۔'' اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس صوبے میں متعدد شق دار تھے اور اگر وہ انتظامی عہدے دار تھے تو لازماً ان کی متعدد شقیں ہونگی۔ دوآب براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت تھا اس لیے شق دار غالباً سب سے بڑے عہدیدار تھے جنہیں بغاوت کو ختم کرنے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔

برنی نے شق کے لفظ کو انتظامی وحدت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ قطب الدین ایبک کے زمانے سے بڑی ولایتیں چھوٹی چھوٹی وحدتوں میں منقسم چلی آتی تھیں جنہیں، ''طرف'' کہتے تھے۔ صوبوں کی پرانی اور نئی تقسیم چودھویں صدی کے دوران شقیں کہلائی جانے لگیں۔ جب بہلول لودھی نے کمپل، پٹیالی، شمس آباد، سکیٹ، کوئل، مارہرہ اور جلالی کے پرگنے سلطان حسین شرقی سے فتح کیے تو اس نے ان میں سے ہر پرگنے میں ایک شق دار مقرر کیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ شق کا ادارہ کبھی عام طور پر چلن میں نہیں تھا اور صرف حد سے زیادہ بڑے صوبے ہی اس قسم کی اکائیوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ چھوٹے صوبے اور بڑی بڑی ولایتوں کی شقیں، سرکاروں کے نام سے موسوم کی جانے لگیں۔ شق دار ایک صوبے کے حصے کا ناظم ہونے کے باعث نئی انتظامیہ میں پرگنے کا سربراہ ہو گیا۔ والی اور مقطی قدرتاً غائب ہو گئے۔

6.6.5 پرگنہ (*Pargana*)

صوبے سے چھوٹی وحدت شق اور سرکار کے بعد پرگنہ تھی جسے مور لینڈ نے قصبے کے مترادف بتایا ہے۔ جو پرانے معنٰی کے حساب

سے دیہات کا مجموعہ ہوتا تھا۔اس کے بعد کی تقسیم میں جو آخری اکائی ہوتی تھی وہ دیہات تھی۔ابن بطوطہ کے مطابق پرگنہ تقریباً سو دیہاتوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پرگنے میں ایک چودھری ہوتا تھا جو ہندوؤں کا سربراہ ہوتا تھا اور ایک متصرف ہوتا تھا جو محصول وصول کرتا تھا۔ برنی نے متصرف کو عامل کہا ہے اور اسی کے ساتھ مشرف، محاصل، گماشتوں، سرہنگوں اور دفاتر کے عملے کا بھی ذکر کیا ہے۔ مشرف معائنہ کرنے والا عہدے دار ہوتا تھا جو فیصلوں کو دیکھتا تھا اور حکومت کا حصہ متعین کرتا تھا۔ کسانوں سے محصول جنس اور نقد کی صورت میں بھی وصول کرتا تھا۔ گماشتہ جو کسی کی طرف سے کسی کے کام کے لیے متعین ہوتا تھا اور سرہنگ موجودہ دور کے چپراسیوں کی طرح کسانوں یا مقدموں پر سرکاری احکام یا سمن تعمیل کراتے تھے۔ برنی کارکنان کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے جو پرگنہ سطح پر کام کرتے تھے۔ کارکن وہ محرر ہوتے تھے جو حسابات رکھتے تھے۔

6.6.6 مقامی عہدیدار (Local Officers)

جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تو شہریوں اور دیہاتیوں کو اس کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ محصول وصول کرنے والوں کو خود مہیا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے علاقوں اور محاصل کا انتظام ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ قطب الدین ایبک نے اسی روایت کو جاری رکھا اور تمام سلاطین دہلی اسے قائم رکھتے رہے۔

حکومت کا معاملہ کسان سے دیہات (گاؤں) کے سربراہ کی معرفت ہوتا تھا جسے 'مقدم' یا 'مکھیا' کہتے تھے۔ مقدم کی اصطلاح مشہور اشخاص اور دیہات کے سربراہ دونوں کے لیے ہوتی تھی۔ 'مکھیا' ایک ہندو خطاب ہے اور اس کا ذکر فارسی کی تاریخوں میں کہیں نہیں ہے مگر یہ اب بھی اتر پردیش میں استعمال ہوتا ہے اور مسلمانوں کے عہد سے پہلے سے جاری ہے۔

محاسب یا پٹواری اراضی کے محصول کے کاغذات رکھتا تھا۔ ارتھ شاستر میں اسے 'گوپ' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ خوط اور بلاہر دیہاتی سماج کے دو انتہائی جز و ہوتے تھے۔ خوط کی اصطلاح برنی نے استعمال کی ہے۔ بلاخ میں نے بلاہر کے لیے یہ لکھا ہے وہ ادنی ذات کے لوگ ہوتے تھے۔ مورلینڈ کے مطابق خوط اس ہندو سردار کو کہتے ہیں جو سلطان کی رعیت ہوتا تھا۔ اسی طرح رائے اور رانا باج گزار ہوتے تھے جو خود مختار علاقوں پر حکومت کرتے تھے اور سلطان کو مقررہ باج ادا کرتے تھے، مگر خوط محض کارندے ہوتے تھے جو حکومت کے زیر انتظام علاقوں کے محاصل کے تعین اور وصول یابی میں مدد دیتے تھے۔

مسلم حکومت کے آغاز سے ہی مقدموں اور خوطوں کو بڑی مراعات حاصل تھیں اور وہ بڑے آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن علاءالدین خلجی نے ان مراعات کو واپس لے لیا کیونکہ یہ لوگ بغاوت کے وسائل جمع کرنے میں اپنی دولت کا استعمال کرتے تھے۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے عہدیداروں کو ہدایت کی کہ وہ خود خوطوں اور مقدموں کی زبردست ذمے داری کے پیش نظر ان سے چرائی یا خراج کا مطالبہ نہ کریں۔

خوط ایک یا ایک سے زیادہ گاؤں کا زمیندار ہوتا تھا اور مقدم گاؤں کا مکھیا ہوتا تھا۔ پٹواری بھی ایک دیہی افسر تھا کیونکہ علاء الدین خلجی نے عاملوں اور متصرفوں کی دھوکا دھڑی کی تحقیق کے لیے پٹواریوں کے حساب کتاب کے کھاتوں کی چھان بین کی تھی اور انہیں سخت سزائیں دی تھیں۔ اس طرح ایک بنیادی یا ابتدائی قسم کا نظام گاؤں کی حد تک موجود تھا۔ عدل وانصاف سے متعلق صوبوں میں سرگرمیاں مرکزی حکومت کے ڈھانچے کے مطابق تھیں۔ صوبوں میں قاضی اور صدر کی عدالتیں تھیں۔ کوتوال کا کام حالات اور نظم ونسق بنائے رکھنا تھا۔ دیہی سطح پر یعنی گاؤں میں دیوانی اور افراد سے متعلق معاملات کی سنوائی گرام سبھا کرتی تھی۔

6.7 ذرائع آمدورفت (Transport and Communication)

سلاطین دہلی کو یہ احساس تھا کہ بغیر اچھے راستوں اور سڑکوں کے ملک پر اچھی طرح سے کنٹرول ممکن نہیں ہو سکتا اس لیے قطب الدین ایبک نے جن مقطیوں کا تقرر کیا تھا ان کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ سڑکوں کی حفاظت کریں۔ التتمش اور بلبن نے جنگلوں کو کاٹ کر سڑکیں بنائیں تاکہ اندرون ملک میں آمدورفت آسان ہو اور سرداروں کے لیے بغاوت کرنا مشکل ہو جائے۔ علاؤالدین خلجی نے سڑکوں کی حفاظت کے لیے پرزور تدابیر اختیار کی تھیں۔ غیاث الدین تغلق نے اسی حکمت عملی پر عمل کیا اور محمد بن تغلق کے عہد میں ابن بطوطہ کو ملک میں طویل سڑکوں کا جال بچھا ہوا ملا۔ دھار اور دہلی کے درمیان شاہراہ کا فاصلہ 24 دن کی مسافت تھا اور تمام راستے میں 'کروہ مینار' بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے دریا آمدورفت کا ایک اہم ذریعہ تھے۔ دریائی آمدورفت اور نقل وحمل کی حفاظت ایک دریائی پولیس کرتی تھی جو میر بحر کے ماتحت تھی۔

مسلمانوں کے آنے سے قبل شمال اور جنوب کے علاقے علاحدہ علاحدہ تھے۔ ان کے درمیان آمدورفت اور تجارت وغیرہ کا سلسلہ بہت کم تھا۔ بہت سے علاقوں میں علاء الدین خلجی کی فوجوں نے اکثر راستے پہلی مرتبہ طے کیے تھے لیکن اس کے بعد آمدورفت کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا۔ محمد بن تغلق کے عہد میں اس نے بہت ترقی کی۔

6.8 امن وامان (Peace and Prosperity)

آمدورفت کے راستوں اور مواصلات کو ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ ہندو سردار مسافروں اور تاجروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ صوبوں کے حکام امن وامان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ فن حرب کے اعتبار سے اہم مقامات پر قلعے تعمیر کیے جاتے تھے اور وہاں کوتوالوں کو تعینات کیا جاتا تھا کہ وہ راستوں کی حفاظت کریں اور چوروں کو سزا دیں۔ بعد میں یہ کوتوال فوج دار کہے جانے لگے۔ دوسرے مقامات پر تھانے قائم کیے گئے جن میں فوجی سپاہیوں کی ٹکڑیاں ہوتی تھیں۔ امن قائم رکھنے کے لیے باغی قبائل کے درمیان جنگجو مسلمانوں کو بسایا جاتا تھا۔ مثلاً بلبن نے مسلمانوں کے لیے ایسی بستیاں ہندوؤں کے مستحکم علاقے کمپیل، پٹیالی اور بھوج پور میں بسائیں اور یہاں پر قلعے اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔ اس کی وجہ سے مشرقی ہندوستان کو جانے والی سڑک فیروز شاہ کے عہد تک آمدورفت کے لیے محفوظ رہی۔ خسرو علاء الدین کے عہد کے متعلق خزائن الفتوح میں لکھتا ہے کہ "وہی چور جو اس سے قبل دیہات کو آگ لگاتے تھے اب چراغ جلا کر شاہراہوں کی

حفاظت کرتے ہیں۔ اگر کسی مسافر کا کوئی دھاگے کا ٹکڑا کھو جاتا ہے تو اس نواح کے باشندے یا تو اسے تلاش کر کے دیتے ہیں یا اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔"

خسرو کے الفاظ میں "دریائے سندھ کے منبع سے لیکر ساحل بحر تک کوئی شخص چور، ٹھگ یا ڈاکو کا نام بھی نہیں سنتا تھا۔" امن وامان کی یہ کیفیت قطب الدین مبارک شاہ کے ماتحت بھی بغیر کسی کوشش کے جاری رہی۔ محمد بن تغلق کے عہد میں امن وامان ضرور ختم ہو گیا تھا لیکن فیروز شاہ نے ایک بار پھر امن بحال کیا لیکن زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ بعد کے ادوار میں شرقی سلطانوں اور سید اور لودھی حکمرانوں نے امن وامان قائم کرنے کی کافی حد تک کامیاب کوششیں کیں تھیں، لیکن پورے شمالی ہند میں مکمل امن وامان شیر شاہ کے عہد میں جا کر ہی قائم ہوا۔

6.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مرکزی نظام حکومت میں سب سے اہم سلطان ہوا کرتا تھا۔ وہ انتظامیہ کا محور، فوج کا سپہ سالار اور عدالتی معاملات میں منصف اعلیٰ ہوتا تھا۔ نظام حکومت کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے سلطان کو بہت سے افسران مدد دیتے تھے، جن کو سلطان منتخب کرتا تھا۔ افسران جو سلطان کی مدد کیا کرتے تھے ان میں وزیر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

دہلی سلطنت کے نظم ونسق کو چلانے کے لیے دیوان وزارت، دیوان رسالت، دیوان عرض اور دیوان انشاء جیسے اہم محکمے قائم تھے۔ وزیر کا محکمہ دیوان وزارت کہلاتا تھا اس کا تعلق مالیات سے ہوتا تھا۔ محکمہ مالیات یا نظام مالگزاری کے تحت عشری اور خراجی زمینوں سے حکومتی آمدنی کا تعین، تشخیص اور اور وصولیابی کو انجام دیا جاتا تھا۔ دیوان رسالت کے ذریعہ مذہبی اور دینی امور انجام پاتے تھے۔ اس کا صدر صدر الصدور کہلاتا تھا۔ دیوان عرض کا سربراہ عارض ممالک ہوتا تھا۔ یہ فوجی معاملات کے نظم ونسق کا ذمہ دار تھا۔ دیوان انشاء خط وکتابت کا شعبہ تھا۔ خطوط اور پیغامات بھیجنے کا کام اسی کے تحت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سلطنت کے نظم ونسق کے لیے وکیل در، امر حاجب، برید خاص، برید ممالک، قاضی ممالک اور امیر داد نام کے عہدے یا شعبے بھی تھے۔ ڈاک، پولیس اور خفیہ نظام بھی تھا جس کی مدد سے حکومتی کام کاج کو بہتر طریقے سے انجام دیا جاتا تھا۔

اس اکائی کے مطالعے سے طلبا کو یہ معلوم ہوا کہ صوبائی حکومت، مرکزی حکومت کا حصہ ہوتی تھی۔ صوبے کا حاکم یا مقطی سلطان کا نمائندہ اور صوبائی حکومت کا سربراہ ہوتا تھا۔ صوبائی شعبہ جات، مرکزی شعبوں یا محکموں کی نقل ہوتے تھے۔ صوبائی محکموں کی نگرانی عموماً دارالحکومت سے کی جاتی تھی، مگر دور دراز کے صوبے یا وہ صوبے جہاں مشکلات پیش آتی تھیں وہ اپنے محکموں کا انتظام خود کرتے تھے۔ مقامی حکومت کی اکائی دیہات یا گاؤں ہوتا تھا جس میں ایک مکھیا (مقدم) اور ایک جمع خرچ لکھنے والا (پٹواری) ہوتا تھا۔ دیہات کو ملا کر پرگنے بنتے تھے اور پرگنوں کو ملا کر شقیں بنتی تھیں۔ مقامی نظم ونسق زیادہ تر مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ فوجی اہمیت کے مراکز پر محافظ فوجیں متعین کر کے اور جنگجو مسلم سپاہیوں کی نوآبادیاں بسا کر امن وامان قائم رکھا جاتا تھا۔

6.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

وزیر تفویض	:	ایسا وزیر جسے اپنا جانشین مقرر کرنے کے علاوہ لا محدود اختیارات حاصل ہوں۔
وزیر تنفیذ	:	ایسا وزیر جو صرف سلطان کے احکام کی تعمیل کا ذمہ دار ہے۔
مشرف ممالک	:	پوری سلطنت کا محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل)
مستوفی ممالک	:	حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والا افسر (آڈیٹر جنرل)
دیوان وقوف	:	خرچ کے کاغذات کو تیار کرنے والا شعبہ
دیوان مستخرج	:	وصول کیے گئے اضافی محصول کی دیکھ بھال کرنے والا شعبہ
دیوان امیر کوہی	:	نظام مال گزاری اور زراعت کی ترقی سے متعلق شعبہ
عارض ممالک	:	فوج کی بھرتی، سپاہیوں کے معائنے، تنخواہ کی ادائیگی اور محکمہ رسد کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
مال غنیمت	:	جنگ میں حاصل ہونے والا مال
دبیر	:	منشی
مساحت	:	زمین کی پیمائش
والی/مقطی	:	صوبے دار یا گورنر، صوبے کے فوجی اور انتظامی معاملات ان کے اختیارات میں ہوتے تھے۔
اقطاع	:	قابل منتقلی زمینی مالگذاری کا عطیہ جو موروثی یا مستقل نہیں ہوتا تھا۔
اقطاع تملیک	:	مزروعہ یا غیر مزروعہ یا پھر کانوں والی زمین
اقطاع استغلال	:	وظیفوں یا بھتوں سے متعلق زمین جس کی آمدنی ان کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔
متصرف	:	محاصل وصول کرنے والا۔ برنی نے متصرف کو عامل کہا ہے۔
مشرف	:	فصلوں کا معائنہ کرنے والا عہدیدار
برید	:	اطلاع و خبر دینے والا
پٹواری	:	قدیم ہندوستان میں اسے گوپ کہا جاتا تھا۔ گاؤں کی زمین کا حساب کتاب رکھنے والا۔
الاغ	:	تیز رفتار دوڑنے والے ہرکاروں یا دھاووں کی ڈاک
بلاہر	:	چھوٹے اور نچلے درجے کے کسان
چودھری	:	100 گاؤں یا پرگنے کا پرمکھ
خوط	:	گاؤں کا مقامی افسر۔ مال گزاری وصول کرنے والا
مقدم	:	مکھیا، گاؤں کا پردھان

6.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت کا عہد حکومت بیان کیجیے۔
2. قانوناً دہلی سلطنت کس کا ایک حصہ تھی۔
3. کس دہلی سلطان نے خلیفہ کا منصب خود اختیار کر لیا۔
4. خطبہ اور سکے کس چیز کا مظہر سمجھے جاتے تھے۔
5. مملکت کا سربراہ اور اس کی افواج کا سپہ سالار اعظم کون تھا۔
6. مسلم سیاسی مفکرین کے مطابق کتنے قسم کے وزیر ہوتے تھے۔
7. سلطنت دہلی کی تاریخ میں اچھا منتظم لیکن سب سے کم پڑھا لکھا وزیر کون تھا۔
8. دیوان رسالت کے ذریعہ کون سے امور انجام پاتے تھے۔
9. محتسب کا کام کیا تھا۔
10. علاالدین خلجی نے بازاروں پر نگاہ رکھنے کے لیے کسے مقرر کیا۔

6.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سلطان کے مرتبہ اور اختیارات کو متعین کیجیے۔
2. دیوان رسالت پر ایک مختصراً نوٹ لکھیں۔
3. دیران عرض سے کیا مراد ہے؟ اس کے دائرہ کار متعین کیجیے۔
4. مال غنیمت پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔
5. صوبائی حکومت کا سربراہ کون ہوتا تھا۔
6. اقطاع کسے کہتے ہیں مختصر نوٹ لکھیں۔

6.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. وزیروں کے محکموں پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. سلطان کے مرتبے اور اس کے اختیارات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
3. محکمہ مال گذاری کے کام کاج کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

6.12 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Tripathi, R.P., *Some Aspect of Muslim Administration*, Central Book Depot, Allahabad, 1936.
2. Qureshi, Ishtiaq Husain, *The Administration of the Sultanate of Delhi*, Munshiram Manoharlal, New Delhi, 1971.
3. ستیش چندرا، عہد وسطیٰ کا ہندوستان (سلطنت سے مغل عہد تک) حصہ اول: دہلی سلطنت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

اکائی 7۔ دہلی سلطنت: سماجی گروہ

(Social Groups during the Delhi Sultanate)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید

7.1 مقاصد

7.2 حکمراں طبقہ

7.3 حکمراں طبقہ کی نوعیت

7.3.1 البازی دور

7.3.2 خلجی عہد

7.3.3 تغلق عہد

7.4 علماء

7.5 اقطاع نظام اور حکمراں طبقہ

7.6 مقامی سرداران

7.7 کم درجے کے افسران

7.8 تجارتی طبقہ

7.9 کاریگر اور غلام طبقہ

7.10 اکتسابی نتائج

7.11 کلیدی الفاظ

7.12 نمونہ امتحانی سوالات

7.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.12.2 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

7.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

7.0 تمہید (Introduction)

ابتدائی دور سے ہی دہلی سلطنت کے سامنے سب سے اہم مسئلہ مفتوحہ علاقوں میں اپنے اقتدار کا استحکام کرنا تھا۔اس مسئلہ کو حل کرنے میں نئے حکمراں طبقہ نے ایک اہم رول ادا کیا اور سلطان کے ساتھ ہندوستان کے وسائل میں حصّہ داری پائی۔ ترک اپنے ساتھ اقطاع کا نظام لائے جس نے ہندوستان کے نظام کو مرکزیت و یکجہتی بخشی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اقطاع کے نظام میں تبدیلیاں بھی آئیں اور حکمراں طبقہ کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی رہی۔ غوریوں کے حملے کے وقت شمالی ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن کے حکمراں رائے و رانا تھے (مقامی حاکم یا سربراہ)۔ گاؤں کی سطح پر خوط و مقدم (گاؤں کا مکھیا) ہوتے تھے جو کہ دیہی امراء طبقہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان دونوں کے بیچ میں چودھری ہوتا تھا جو کہ سو گاؤں کا مکھیا ہوتا تھا۔ غوریوں کے حملے سے پہلے کا حکمراں طبقہ کسانوں سے ان کی فاضل پیداوار زمین پر اعلیٰ یا برتر حقوق استعمال کرتے ہوئے ہتھیا لیتا تھا۔ دہلی سلطنت کے حکمراں طبقہ کا تجزیہ کرتے وقت کچھ سوال ذہن میں رکھنے ہوں گے۔ پہلا نئے حکمراں طبقے نے کس طرح پرانے طبقہ کو بے دخل کر کے اس کی جگہ لی؟ کاشتکاروں کی فاضل پیداوار (یا لگان) کو ہتھیانے کے لیے کیا اقدامات کیے؟ نیا حکمراں طبقہ کس طرح پرانے حکمراں طبقہ سے الگ تھا؟

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سلطنت دور کے ہندوستان میں سماجی طبقات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ان طبقوں میں سب سے اہم طبقہ حکمراں طبقہ کے اہم اوصاف کو سمجھ سکیں گے۔
- حکمراں طبقہ کی نوعیت، تشکیل اور ارتقا کے بارے میں جانیں گے۔
- دوسرے طبقے جیسے علماء و تاجر اور کاروباری لوگ کے متعلق بھی معلومات حاصل کریں گے۔

7.2 حکمراں طبقہ (The Ruling Class)

تیرھویں و چودھویں صدی شمالی ہندوستان کے سماج میں سب سے زیادہ طاقت ور حکمراں طبقہ تھا۔ عام طور پر اس طبقہ کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ خان، ملک و امیر جس میں خاں سب سے اونچے درجہ کا مانا جاتا تھا لیکن یہ درجہ بندی کبھی بھی صاف طور پر عیاں نہیں ہوئی۔ ابتدائی دور میں جو لوگ کم مرتبہ والے عہدے پر فائز ہوتے جیسے سرجان دار، ساقیٔ خاص، سپہ سالار، سرخیل وغیرہ امیر کہلاتے تھے۔ بعد میں لفظ امیر اُن سب اشخاص کے لیے استعمال ہونے لگا جو دولت و اقتدار میں رسوخ رکھتے تھے۔ سب سے اہم ملک اور خان ہوتے تھے۔ اقتدار میں سارے اونچے عہدے ان ہی کو سونپے جاتے تھے۔ منہاج السراج و ضیاء برنی نے امراء کی فہرست میں صرف خاں ہی

کو شامل کیا ہے۔ خان لفظ منگولوں کے اثر کا نتیجہ تھا جن کے یہاں قآن (خان) دس ہزار فوجی دستے کا آفسر ہوتا تھا۔ دہلی سلطنت میں لفظ خاں ایک خاص درجہ یا حیثیت دینے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر بلبن کو اُلغ خان کا لقب ملا۔ امراء کو دوسرے القاب دے کر بھی عزّت افزائی کی جاتی تھی جیسے خواجہ جہاں، عمادالملک، نظام الملک وغیرہ۔ امراء کو مراتب سے بھی نوازا جاتا تھا جیسے طرح طرح کے رسمی پوشاک، تلوار، خنجر، جھنڈے وغیرہ۔ یہ چیزیں بہت اہمیت کی حامل ہوتی تھیں۔ یہ چیزیں اکثر رتبہ اور سلطان سے قربت ظاہر کرتی تھیں۔ امراء کو خاص موقعوں پر گھوڑے اور ہاتھی قیمتی ساز و سامان کے ساتھ بھی عنایت کیئے جاتے تھے۔ یہ اندازہ لگانا خاصہ مشکل ہے کہ ایک وقت میں امراء کی کیا تعداد تھی۔ منہاج السراج التتمش کے زمانے میں 32 ملک کی فہرست دیتا ہے جن میں آٹھ شہزادے تھے جو کہ وسطیٰ ایشیا سے ملک بدر ہوئے تھے۔ ضیاء برنی نے جو ترکان چہل گانی کی اصطلاح (یا لفظ) استعمال کیا ہے شاید وہ امراء کی تعداد کی عکاسی کرتی ہے۔ بلبن کے عہد کے لیے برنی نے 36 ملک کی فہرست دی ہے جس میں قاضی شامل نہیں ہیں۔

علاء الدین خلجی کے عہد میں اعلیٰ درجے کے امراء کی گنتی 48 تک پہنچ گئی تھی۔ جس میں سات سلطان کے رشتے دار و فرزند تھے۔ اس گنتی سے پتا چلتا ہے کہ سلطنت کی توسیع (یا وسعت) سے پہلے امراء کی تعداد کافی کم تھی۔ مگر اس چھوٹے سے امراء کے گروہ میں تلخ فرقہ وارانہ جنگ جاری رہی۔ اس کشمکش میں آپسی رشتے داریاں و نسلی روایات اہم رول ادا کرتی تھیں۔ ترک اپنے آپکو تاجک، خلجی، افغان و ہندوستانیوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ التتمش کے انتقال کے بعد ترکوں نے تاجکوں کو بے دخل کر کے سبھی اہم عہدوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرلی تھی۔ یہ اجارہ داری خلجی حکمرانوں کے آنے سے ختم ہوئی۔ خلجی و تغلق حکمرانوں کے عہد میں ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی ذاتی صلاحیت کی بنا پر کافی پیش رفت کی لیکن پھر بھی بیرونی خاندانوں و اعلیٰ نسل کے خاندان کے لوگوں کو سماج میں کافی قدر و مزلت حاصل تھی۔ اس بات کی توثیق افریقی سیاح ابن بطوطہ نے کی ہے جو محمد بن تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔

7.3 حکمراں طبقہ کی نوعیت (Nature of the Ruling Class)

تیرھویں صدی کے دوران ترک فوجوں نے شمالی ہندوستان پر اپنا سیاسی و عسکری تسلّط قائم کرلیا۔ اب ایک بڑے نامانوس علاقے میں امن و امان قائم کرنا تھا اور ساتھ ہی اس پر حکومت بھی کرنی تھی۔ اس لیے حکمراں طبقہ کو قائم اور مستحکم کرنا تھا۔ ابتدائی دور کا ترک حکمراں طبقہ سلطان کے ساتھ سیاسی و معاشی اقتدار میں حصّہ دار بھی تھا۔ ابتدا میں امراء عملی طور پر دور دراز کے علاقوں میں آزاد تھے جہاں ان کو گورنر کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ ان کو ولی یا مقتی کہا جاتا تھا اور علاقہ کو اقطاع کہا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا رواج شروع ہوا۔

ہم عصر مورخ منہاج و برنی سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی سلطنت کے قیام کے اوائل میں خاص امراء اور سلطان بھی ترک غلام آفسروں کے خاندان سے ہوتے تھے۔ ابتدائی دور میں بہت سے ترک سلطان و امراء نے اپنے پیشے کا آغاز غلام کے طور پر شروع کیا مگر سلطان بننے سے پہلے پروانہ آزادی حاصل کرلیا۔ ایسا ایک سلطان قطب الدین ایبک تھا۔ اس کے انتقال پر (1210ء میں) التتمش نے (جو ایبک کا عزیز غلام

تھا) دہلی پر قبضہ کر لیا اور سلطان بن گیا۔ اس نے ترک غلاموں کے ایک گروہ کی تشکیل دی جن کو شمسی ملک کہا جاتا تھا۔ اس گروہ کو ضیاء برنی نے ترکان چہل گانی کا نام دیا ہے۔ التتمش کے امراء میں تاجک بھی شامل تھے جو غلام نہیں آزاد ہوتے تھے۔ التتمش کے انتقال کے بعد جانشینی کے مسئلہ نے امراء کے درمیان اختلافات پیدا کر دیے۔ حکمراں طبقہ کے درمیان اندرونی جھگڑوں کے باوجود ایک طرح کی بنیادی اتحاد یا یکجہتی تھی جو باہری لوگوں کے لیے عداوت کے طور پر عیاں ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر جب رضیہ سلطان (1240-1236) نے ایک حبشی جمال الدین یاقوت کو امیرِ اخور (شاہی گھوڑوں کا سربراہ) کے بلند مرتبہ سے نوازا تو امراء طبقہ کے درمیان ناراضگی پھیل گئی تھی۔ اسی طرح کی مثال ریحان کی تھی جو ہندو سے مسلمان ہوا تھا۔ اس طرح امراء طبقہ کچھ خاص گروہ کا محافظ تھا۔ کبھی کبھار اعلیٰ خاندان میں پیدائش کے اصول پر کاربند ہوتے جیسا کہ برنی نے بلبن کی پالیسیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے۔ نسل و شاید مذہب نے بھی حکمراں طبقہ کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا۔ حکمراں طبقہ ایک چٹان جیسی تنظیم نہ تھا۔ اس طبقے میں بہت سے گروہ تھے جو اپنے امتیازی مفاد کو حاسدانہ طرزِ عمل سے محفوظ کرتے رہتے تھے۔ وہ ترک عسکری سردار جو معزالدین غوری کے ساتھ آئے اور حملوں میں شرکت کی ابتدائی ترک حکمراں طبقہ کا اہم حصّہ تھے۔ یہ لوگ مرکزی و صوبائی نظام میں اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔

7.3.1 الباری دور (Ilbari Period)

محمد غوری کے انتقال کے بعد قطب الدین ایبک محمد غوری کے ہندوستانی علاقوں کا نگراں بنا۔ ساتھ ہی ساتھ غزنی و سندھ میں محمد غوری کے دوسرے غلاموں یعنی یلدوز و قباچہ نے بھی اپنی آزادی و خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ان سلاطین کو اپنے اقتدار کو قائم و مستحکم کرنے کے لیے امراء کی ضرورت تھی۔ مثال کے طور التتمش دہلی کا تخت دہلی کے امراء کی حمایت کی وجہ سے حاصل کر سکا۔ ترک امراء نے سلاطین اور تخت کے دوسرے دعویداروں کو اقتدار حاصل کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ برنی کے مطابق پرانے ترک امراء آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے "کہ آپ کیا ہیں کہ جو میں نہیں ہوں اور آپ کیا ہونگے جو میں نہیں ہوں گا"۔ ابتدائی ترک حکمراں طبقہ اقتدار میں امتیازی حقوق و اجارہ داری کو اہمیت دیتا تھا اور دوسرے سماجی گروہوں کے لوگ جب ان کی اجارہ داری توڑنے کی کوشش کرتے تو امراء اس پر ناراض ہوتے اور اس کو روکتے۔ التمش کے امراء جو ترکان چہل گانی کہلاتے تھے اس کے انتقال کے بعد بہت طاقتور ہو گئے تھے۔ سلاطین کی یہ کوشش کہ دوسرے لوگ امراء کے گروہ میں شامل ہو جائیں وہ ناکام بنا دیتے۔ رضیہ سلطان کو ترک امراء کی سخت مزاحمت برداشت کرنی پڑی جب اس نے ایک حبشی جمال الدین یاقوت کو بلند عہدہ دے کر امیر اخور بنایا۔ سلطان ناصر الدین محمود (1246تا1266) نے کوشش کی کہ اس گروہ کی طاقت کو کم کرے۔ اس لیے اس نے بلبن کو برطرف کر دیا جو کہ ایک ترکان چہل گانی میں سے تھا اور اس کی جگہ عماد الدین ریحان جو ایک ہندوستانی نو مسلم تھا مقرر کیا۔ مگر اس کی یہ کوشش ناکام رہی۔ اس کوشش پر منہاج ترک امراء کے غصّہ کا اظہار کرتا ہے۔ ترک حکمراں طبقہ کی عداوت کی وجہ سے سلطان نے ریحان کو برطرف کر دیا اور بلبن کو بحال کر دیا۔

جب بلبن (1266تا1287) سلطان بنا اس نے بہت سے اقدام کیے تا کہ ترک امراء کی طاقت کو توڑا جائے۔ برنی لکھتا ہے کہ بلبن نے بہت سارے ترک امراء کا قتل کروا دیا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کوئی امیر سلطان کے لیے دشواریاں پیدا کرے۔ اس نے خود سلطان ناصر

الدین محمود کو کٹھ پتلی کی طرح رکھا۔ کیونکہ اس کو پرانے ترک امراء سے ڈر تھا۔ بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد (1287-1290) سلطان بنا لیکن اس کو قتل کر دیا گیا جسکے نتیجے میں بلبن کے خاندان کا خاتمہ ہوا۔

7.3.2 خلجی عہد (Khilji Period)

1290 میں البار ی حکومت، خلجیوں نے اُکھاڑ پھینکی۔ خلجیوں کا اقتدار پر قابض ہونا ایک نئی چیز تھی۔ ہم عصر تاریخ دان برنی لکھتا ہے کہ خلجی نسل کے حساب سے ترکوں سے الگ تھے۔ جدید مورخین خلجیوں کو ترک مانتے ہیں مگر تیرھویں صدی میں ان کو کوئی ترک نسل کا نہیں مانتا تھا۔ اس لیے خلجیوں کا اقتدار میں آنا انوکھا یا نیا مانا گیا۔ اس لیے بھی کہ وہ پرانے ترک امراء گروہ میں شامل نہیں تھے۔ خلجی عہد کا پہلا سلطان جلال الدین خلجی (1290 تا 1296) تھا لیکن اس کو اس کے بھتیجے اور داماد علاءالدین خلجی (1296 تا 1316) نے قتل کر دیا۔ علاءالدین خلجی نے پرانے ترک امراء گروہ کی طاقت ختم کر دی جب اس نے امراء کے طبقے میں نئے لوگوں کو شامل کیا جیسے مثال کے طور پر ملک کافور جو کہ ایک غیر ترک غلام تھا اور گجرات مہم کے دوران پکڑا گیا تھا۔ اس روش نے حکمراں طبقہ کی بنیاد کشادہ کر دی۔ یہ روش تغلق کے عہد میں بھی جاری رہی۔

7.3.3 تغلق عہد (Tughlaq Period)

تغلق خاندان کا بانی غیاث الاین تغلق (1320 تا 1325) ہے۔ اس کی ایک حادثہ میں موت کے بعد اس کا بیٹا محمد بن تغلق (1325 تا 1351) سلطان بنا۔ اس کے دور میں ہندوستانی، افغانوں کے حکمراں طبقہ میں شامل ہونے کے علاوہ حکمراں طبقہ اور کشادہ ہو گیا جب بہت بڑی تعداد میں بیرونی لوگ اس میں شامل کر لیے گئے۔ جیسے خراسانی جن کو سلطان اعزا کہتا تھا۔ ان اعزا میں سے بہت سارے لوگوں کو امیرِ صدہ (سو کا فوجی افسر) مقرر کیا گیا۔ غیر مسلموں اور ہندوستانی نو مسلم کے بارے میں برنی افسوس کرتا ہے کہ سلطان نے اجلاف طبقہ سے تعلق رکھنے والوں کو اونچے عہدے عطا کرے۔ وہ موسیقی کار، حجام، باورچی لوگوں کا ذکر کرتا ہے جنہیں اعلیٰ عہدے ملے۔ وہ پیرا مالی (باغبان) کی مثال دیتا ہے جسکو دیوانِ وزارت کا عہدہ ملا۔ اسلام قبول کرنے والوں میں عزیز خمار (شراب ساز)، قوام الملک مقبول، افغانوں میں ملک مہک، ملک شاہنو، ہندوؤں میں سائی راج دھارا و بھیرن رائے کو اقطاع و رتبے دیئے گئے۔ فیروز تغلق کے دورِ حکومت میں امراء کے سماجی سلسلہ ءنسب کی کوئی صاف تصویر نہیں ملتی ہے۔ اس وقت حالات غیر محکم تھے اور ایک طرح کا ظاہری دکھاوا تھا کہ سلطان و امراء کے مابین خوشگوار تعلقات ہیں۔

حکمراں طبقہ کے بارے میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ ہر سلطان نے کوشش کی کہ ایک ایسے گروہ کی تشکیل ہو جو ذاتی طور پر اس کا وفادار ہو۔ یہ کوشش پرانے امراء کے گروہ کو بے اثر کر دیتی تھی جن کی وفاداری ہمیشہ شک کے دائرے میں رہتی تھی۔ اسی وجہ سے ہم عصر مورخ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جیسے قطبی (قطب الدین کے) شمسی (شمس الدین التمش کے) بلبنی و علائی امراء۔ لیکن ایک بات غور طلب ہے کہ ہر گروہ یا گروپ یہ کوشش کرتا کہ سلطان کی توجہ حاصل کرے چاہے وہ جیسا بھی ہو۔ کمزور یا طاقت ور کیونکہ ساری مراعات یا

رعایت واقتدار اس کے ذریعہ ہی حاصل کی جاسکتی تھی۔ اس طرح دھیرے دھیرے سلطان کا مقام مستحکم ہو گیا اگروہ مضبوط قوت ارادی رکھتا ہو۔ دہلی سلطنت کے نظام میں افغانوں کا مستقل اضافہ ہوتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لودھیوں (1451تا1526) کے اقتدار میں آنے سے امراء طبقہ میں افغانوں کا غلبہ ہو گیا۔

7.4 علماء (*Ulema*)

عام طور پر سماج کا اوپری طبقہ دو بڑے گروپ میں بٹا ہوا تھا۔ اہلِ سیف (جنگ کرنے والے یا سپاہی) اور اہلِ قلم (پڑھے لکھے لوگ)۔ پڑھے لکھے لوگ (یا منشی) دفاتر وعدالت میں مامور کیے جاتے تھے۔ علماء اسی گروپ کا حصّہ تھے۔ علماء یا عالمِ دین کی دہلی سلطنت میں ایک خاص اہمیت تھی۔ یہ لوگ عوام کے مذہبی نقطۂ نظر کو متاثر کرتے تھے۔ اسی گروپ میں سے لوگ اہم قانونی اور عدالتی عہدوں پر مامور کیے جاتے تھے جیسے صدر الصدور، شیخ الاسلام، قاضی، مفتی، محتسب، امام وخطیب وغیرہ۔ علماء حکمراں طبقہ کا ایک حصّہ ہوتے جن کی پرورش آراضی کے لگان دے کر کی جاتی تھی۔ علماء اس لیے اہم تھے کہ یہ حکمراں طبقہ کو قانونی جواز مہیا کراتے تھے۔ یہ سیاسی ومذہبی دونوں رسوخ رکھتے تھے۔

7.5 اقطاع نظام اور حکمراں طبقہ (*Iqta* System and the Ruling Class)

دہلی سلطنت کی آمدنی کا اہم اور بڑا ذریعہ زمین کا لگان تھا جس کو خراج کہا جاتا تھا۔ دہلی سلطنت میں دو قسم کی زمینیں ہوتی تھیں۔ ایک خالصہ ودوسرا اقطاع۔ خالصہ وہ زمین ہوتی تھی جسکا لگان صرف اور صرف سلطان شاہی خرچے کے لیے رکھتا تھا۔ اقطاع وہ زمین ہوتی تھی جس کی آمدنی یا لگان امراء کو دی جاتی تھی۔ اقطاع دار کو مقطی یا ولی کہا جاتا تھا۔ انکے ذمہّ تین کام ہوتے تھے۔ پہلا اپنے علاقے میں امن وامان قائم کرنا، دوسرے اپنے اقطاع سے لگان جمع کرنا اور تیسرے ضرورت کے وقت سلطان یا مرکز کو سپاہیوں کی صورت میں فوجی امداد فراہم کرنا۔ یہ اقطاع غیر موروثی ہوتے تھے اور اقطاع دار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے۔ در حقیقت سلطان اقطاع نظام کے ذریعہ امراء کو قابو میں کر پاتا تھا۔ مقطی اپنے علاقہ میں کاشتکاروں سے لگان جس کو خراج کہتے تھے وصول کرتے تھے۔ اس لگان میں سے وہ اپنی تنخواہ اور اپنے سپاہیوں کی تنخواہ نکال لیتے تھے اور جو بچتا یعنی فواضل مرکزی حکومت (دیوانِ وزارت) کو بھیج دیتے۔ اس طرح مرکزی حکومت ان اقطاع داروں پر اپنا کنٹرول قائم رکھتی۔ اقطاع دار کو اپنی آمدنی وخرچے کا حساب کتاب بھی دینا ہوتا تھا۔ اس حساب کتاب کی جانچ پڑتال (محاسبہ) بھی سختی سے کیا جاتا تاکہ فریب کو روکا جائے۔ علاء الدین خلجی نے امراء (اقطاع داروں) پر نظر رکھنے کے لیے کئی اقدام اٹھائے۔ برید (خفیہ خبر رساں آفسر) مستقل سلطان کو امراء کی حرکتوں کے بارے میں باخبر رکھتے تھے۔ امراء کے میل جول پر بھی نظر رکھی جاتی۔ ان کے مابین شادیاں بنا سلطان کی اجازت کے ناممکن تھیں۔ یہ سارے اقدام امراء کی مستقل بغاوتوں کے مدِّ نظر اٹھائے گئے۔ امراء اپنے علاقوں کے وسائل پر قبضہ کر لیتے اور بغاوتوں کے لیے یا تخت کے لیے اپنی دعویداری پیش کرنے میں استعمال کرتے۔ محمد بن تغلق کے زمانے میں امراء اپنی تنخواہ تو اقطاع سے وصول کرتے مگر اس کے سپاہیوں کی تنخواہ نقد کی شکل میں مرکز فراہم کرتا تھا۔ اس نئے معاشی بندوبست واقطاع پر

مرکز کے زیادہ سے زیادہ کنڑول نے سلطان وامراء کے مابین تصادم بڑھادیا۔ یہی وجہ تھی کہ اب امراء اقطاع کے نظام کے تحت نفع سے محروم ہورہے تھے۔ مگر فیروز تغلق (1351تا1388) کے عہد میں اقطاع داروں پر مرکزی شکنجہ ڈھیلا ہوگیا۔ فیروز تغلق نے اقطاع کو موروثی کر دیااور فرزندوں وورا ثوں کو اقطاع دینا شروع کر دیا۔اسی وجہ سے فیروز تغلق کے دور میں بہت کم امراء کی بغاوتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مگر اس نرمی نے دہلی سلطنت کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لودھیوں کے دورِ حکومت میں اقطاع دار وجہ دار کہلانے لگے اور ان کی منتقلی ایک جگہ سے دوسری جگہ بند ہوگئی۔

7.6 مقامی سرداران (Local Cheiftains)

حلانکہ پورے شمالی ہندوستان میں راجپوتوں کو سیاسی حکومت سے دست بردار ہوناپڑا تھا مگر دیہاتی علاقوں میں ان کی حکومت اب بھی قائم تھی۔ وہ رائے، رانا، روتا وغیرہ کہلاتے تھے۔ وہ دیہی سیاسی، سماجی و معاشی زندگی میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔ ویسے ہم عصر مورخ ان سرداروں کو دہلی سلطنت کا مخالف مانتے ہیں اور ان کے خلاف جہاد جائز تسلیم کرتے ہیں مگر دونوں کے لیے یعنی ترک حکمرانوں و مقامی سرداروں کے مابین مستقل دشمنی قابلِ عمل نہیں تھی۔ ترک حکمرانوں نے مقامی سرداروں کو اپنے زیر علاقوں میں حکومت کرنی دی جب تک وہ خراج دیتے رہے اور وفادار رہے۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیاں ایک بڑھتا ہوا سیاسی میل جول دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ بلبن کے دربار کی شان و شوکت کو دیکھنے کے لیے مقامی سردار سو سو کوس دور سے آتے تھے۔ بنگال میں تغرل کی بغاوت کچلنے کے بعد اودھ میں بلبن کا خیر مقدم کرنے کے لیے اور لوگوں کے ساتھ رائے و رانا بھی آئے۔ بعد میں جب فیروز تغلق نے بنگال پر حملہ کیا تو دوآبہ و اودھ کے بہت سارے مقامی سرداروں نے اس کی مدد کی جس میں خاص گور کھپور کے ادوے سنگھ راے اور چمپارن کا رائے بھی تھا جس نے بیس لاکھ خراج دیا۔ ایک اور مثال جلال الدین خلجی کے دورِ حکومت کی ہے۔ ملک چھجوؔ جو کہ بلبن کا رشتہ دار اور کڑا کا گورنر کا تھا اس نے جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کی۔ اس بغاوت میں بہت سارے مقامی رائے اور راناؤں نے اس کا ساتھ دیا۔ آخر میں ملک چھجوؔ ہار گیا مگر اس زمانے سے ہندو مقامی سردار دہلی سلاطین کے دربار میں حاضری دینے لگے یا موجود رہنے لگے۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ فیروز تغلق کے دربار میں ہندو مقامی سردار نہ صرف حاضری دیتے بلکہ ان کو بیٹھنے کی اجازت بھی تھی۔

اس سیاسی تعاون کے باوجود مقامی سرداروں کی حالت غیر یقینی تھی۔ دہلی سلاطین کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ جب بھی موقع ملے ان سرداروں کو اُکھاڑ پھینکا جائے یا ان کی مراعات و طاقت کو کم کر دیا جائے اور دہلی سلطنت کا نظامِ محصول انکے علاقوں میں بھی نافذ کر دیا جائے۔ یہ کوشش اصل کاشتکاروں پر بوجھ کم کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان مقامی حاکموں کی یا دوسرے مصالحت کرنے والوں (ریاست اور کاشتکار کے بیچ میں) کے استحقاق کو کم کرنے کے لیے تھی۔ چودھویں صدی میں لفظ زمیندار کا استعمال ان موروثی مصالحت کرنے والوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ امیر خسرو نے سب سے پہلے یہ لفظ استعمال کیا۔ رفتہ رفتہ یہ خوط، مقدم و چودھری کے لیے اور ساتھ ساتھ ان سابق مقامی سرداروں کے لیے جو اب دباؤ کے تحت ایک بڑی طے شدہ رقم نہ دے کر وہ رقم جو تخمینہ لگا کر ٹیکس عائد کر کے طے ہو جاتا، حکومت کو

دے رہے تھے ان کے لیے لفظ زمین دار استعمال ہونے لگا۔ مغل دور میں لفظ زمیندار ان سب موروثی زمین مالکوں کے لیے استعمال ہونے لگا جن کے پاس زمین کے لگان یا خراج میں موروثی حق تھا۔ ہمارے پاس زیادہ معلومات نہیں ہے کہ ان مقامی سرداروں کی میعارِ زندگی کیا تھی۔ ان کی دولت کا اندازہ عام لوگوں کی مفلسی سے کیا جا سکتا ہے۔

7.7 نچلے درجے کے افسران (Lower Rung Officials)

حکمراں طبقہ خاص کر امراء کا کام نچلے سطح کے آفسر کے بنا نہیں چل سکتا تھا۔ ان نچلے آفسروں کے علاوہ انکے پاس نوکر، غلام اور تابع دار بھی ہوتے تھے۔ ان آفسروں کو دو گروہ یا جماعت میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ عدالتی و مذہبی آفسر اور لگان و بندوبست کرنے والے۔ پہلی جماعت میں قاضی و مفتی آتے تھے جو ہر شہر میں مقرر کیے جاتے جہاں بھی خاصی مسلم آبادی ہوتی۔ یہ دونوں طرح کے یعنی دیوانی و فوجداری کے مقدمے دیکھتے تھے۔ ان کا سربراہ قاضی ہوتا تھا۔ ایک داد بک کے نام کا آفسر ہوتا تھا جسکی ذمہ داری یہ تھی کوئی زبردستی ٹیکس وصول نہ کرے۔ وہ امیروں کی نگرانی بھی کرتے۔ وہ ٹیکس عائد کرنے کے لیے مسلمانوں کی جائیداد کا جائزہ لیتے تھے اور اس کا حساب کتاب بھی رکھتے تھے۔ ایک محتسب بھی ہوتا تھا جو کوتوال کے ماتحت کام کرتا تھا جسکی ذمہداری یہ تھی کہ کوئی شریعہ کی کھلے طور پر خلاف ورزی نہ کرے۔ یہ ناپ و تول پر بھی نظر رکھتا تھا۔

ان سارے نچلے سطح کے آفسروں کو تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی تعداد بڑھتی گئ جیسے جیسے مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی۔ ان کے علاوہ اور بھی آفسر ہوتے تھے جیسے مدارس میں استاد، مسجدوں میں امام، موذّن وغیرہ۔ علماء کا طبقہ مل کر انہیں مقرر کرتا تھا۔ ان کا سماج میں عزت و وقار تھا۔ ان تنخواہ پانے والے آفسروں کے علاوہ ایک کافی بڑا گروہ مسلم علماء کا تھا جن کو ریاست سے وظائف و بنا لگان آرضی کے طور پر مدد ملتی تھی۔

ہمیں اس نچلے درجے کے آفسران کے سماجی بنیاد کی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ جدید دور میں یہ آفسران نچلا متوسط طبقہ کا حصّہ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر شاعر، دانشور، مورخ، طبیب اور نچلے درجے کے سرکاری آفسر جیسے عامل (لگان حصول کرنے والے) محرر (حساب کتاب رکھنے والے) وغیرہ بھی اسی طبقے سے آتے تھے۔ اس طبقے کو ہم اہلِ ادب یا پڑھا لکھا طبقہ کہ سکتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ایک ایسا ملک جس میں زیادہ تر آبادی جاہل ہو اس ملک میں پڑھے لکھے طبقہ کی کافی اہمیت ہوتی تھی۔ علاء الدین خلجی کے نئے لگان وصولی کی نظام کے تحت کافی تعداد میں کلرک و آفسر درکار تھے جو مستقل وسیع ہوتے ہوئے نظام کو مرکزی صوبائی و مقامی سطح پر سنبھالتے۔ ان آفسران کی بے راہ روی، ظلم و زیادتی اور عوام پر اپنی طاقت کے بیجا استعمال وغیرہ سدھارنے کے لئیے علاؤالدین کے ذریعہ اٹھائے گئے اقدام کا برنی نے واضح ذکر کیا ہے۔ ان نئے مامور کیے گئے کلرک و آفسروں کے سماجی پس منظر کے بارے میں زیادہ اطلاع نہیں ہے۔ یہ شاید ہندوستان کے نو مسلم تھے یا علماء طبقہ سے تھے۔ اگر ان افسروں کی تعداد میں سے پٹواری و مقدم جو کہ ہندو ہوتے تھے انہیں ہٹادیں تو یہ آفسر ضرور مسلمان ہونگے مگر ہندو لوگ محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں اس طبقہ میں شامل ہونے لگے اور انہی لوگوں میں سے سلطان نے کئی ہندوؤں کو اعلی عہدوں پر فائز کیا۔ اس طرح اس

وقت تک فارسی جاننے والی ایک ہندو جماعت بھی وجود میں آچکی تھی۔

7.8 تجارتی طبقہ (The Merchant Community)

ترکوں کی آمد کے بعد شمالی ہندوستان میں ایک مضبوط و مرکزی ریاست وجود میں آئی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک معتبر اور اچھا سکّوں کا نظام جسکی بنیاد چاندی کے سکّوں پر تھی قائم ہوا۔اس کے علاوہ شاہراہوں پر بڑھتا ہوا تحفّظ، شہروں کا عروج و ترقی اور ہندوستان کا اسلامی دنیا کے ساتھ نئے تعلقات پیدا ہونے کی وجہ سے مغربی و سطیٰ ایشیا سے ہندوستان کی بری و بیرونی تجارت کو خاص کر گجرات سے ترقی ملی اور اس کا مزید پھیلاؤ ہوا۔اس بات کی گواہی ملتانی تاجروں کی متواتر حوالوں سے ملتی ہے جو بڑے بڑے مالی امور سے تعلق بھی رکھتے تھے۔دہلی سلطنت کے ماخزوں میں دو قسم کے تاجروں کا ذکر ملتا ہے۔ برنی نے ان تاجروں کو جو اناج یا غلّہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں ماہر تھے انہیں کاروانی کہا ہے(کاروان فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ لوگ جو گروہ بنا کر سفر کرتے تھے)۔ہم عصر صوفی شیخ نصیر الدین (چراغِ دہلی)ان تاجروں کو نائک کہتے ہیں اور ان کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وہ ہیں جو اناج مختلف حصّوں سے شہر (دہلی) لاتے ہیں کچھ دس ہزار بھری بیل گاڑیاں، کچھ بیس ہزار۔ یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ کاروانی آئندہ صدیوں کے بنجارا تاجر ہیں جیسا کہ مغل ماخزوں سے ظاہر ہے کہ یہ تاجر گروہ میں منظم تھے اور انکے سردار کو نائک کہا جاتا تھا۔

تاجروں کا دوسرا اہم گروہ ملتانیوں کا تھا جن کا ذکر ہمارے ماخزوں میں ملتا ہے۔ برنی کہتا ہے کہ لمبے فاصلے کی تجارت ملتانی تاجروں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ لوگ سود و سودا میں مشغول تھے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ساہا اور ملتانی اتنے دولتمند تھے کہ وہ امراء کو قرض بھی دیتے تھے جن کو عام طور پر نقد رقم کی ضرورت رہتی۔ سہاو ملتانی عام طور پر ہندو ہوتے تھے مگر کچھ مسلم بھی ملتانی تاجر کے گروہ میں تھے مثال کے طور پر حامد الدین ملتانی جسکو برنی ملک التجار (عظیم تاجر) کہتا ہے۔ان تاجر گروہ کے علاوہ اور لوگ بھی تھے جنہوں نے تجارت کو اپنے پیشے کے طور پر اختیار کیا تھا۔اس طرح کا ایک صوفی تھا جو بہار سے تعلق رکھتا تھا اور غلاموں کا تاجر تھا وہ دہلی و غزنی کے بیچ تجارت کرتا تھا۔اسی طرح بہت سے متّقی پرہیز گار لوگ وسطیٰ ایشیا سے دہلی آئے اور تجارت کا پیشہ اپنایا۔ایک اور اہم تاجر گروہ دلالوں کا تھا جو سلطنت کے عہد میں وجود میں آیا۔ یہ لوگ خرید و فروخت کرنے والوں کے مابین کڑی ہوتے تھے اور دونوں فریقوں سے محنتانہ (کمیشن) وصول کرتے تھے۔ برنی ان دلالوں کو حاکمانِ بازار (بازار کا مالک) کہتا ہے یہ لوگ بازار میں قیمتوں کو بڑھانے کا ذریعہ بھی تھے۔

علاؤالدین خلجی ان دلالوں سے ہر چیز کی پیداوار کے اخراجات کے متعلق صلاح مشورہ کر کے بازار میں ان کی قیمت طے کرتا تھا۔ برنی مہتران دلال (دلالوں کا سربراہ) کا بھی حوالہ دیتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دلالوں کی کوئی تنظیم ہوتی ہوگی مگر اس کے بارے میں زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ علاؤالدین خلجی کے عہد میں ان مہترانِ دلال سے سختی سے پیش آیا گیا مگر فیروز تغلق کے دورِ حکومت میں ان دلالوں نے اپنا مقام دوبارہ سے حاصل کر لیا۔ فیروز تغلق نے دلالتِ بازارہ (دلالوں پر ٹیکس) بھی ختم کر دیا۔اس کے علاوہ اگر خرید فروخت کرنے والوں کے مابین کوئی سودا نہیں ہو پاتا تو دلالوں کو اپنا کمیشن بھی واپس نہیں کرنا پڑتا تھا۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی

ہیں کہ تغلق دور میں دلالی ایک تسلیم شدہ ادارہ بن گیا تھا۔ایک اور اہمیت کا حامل تجارتی گروہ صراف کا تھا۔ان کی معاشی حیثیت دلالوں سے کم نہ تھی۔وہ زرِ مبادلہ کا کام بھی کرتے تھے اس لیے غیر ملکی تاجروں کو ان کی بہت ضرورت ہوتی تھی کیونکہ وہ اپنے ملک کے سکّوں کے بدلے میں ہندوستانی سکے انہی سے حاصل کرتے تھے۔وہ دونوں ملکی اور غیرہ ملکی سکّوں کی دھات کی پرکھ کرتے تھے اور مبادلہء زرطے کرتے تھے۔ وہ ہنڈی بھی جاری کرتے تھے۔اس طرح وہ ایک بینک جیسی حیثیت رکھتے تھے۔ترکوں نے ہندوستان میں کاغذ کا استعمال شروع کیا جسکی وجہ سے ہنڈی کا رواج کافی بڑھ گیا تھا۔صرّاف ان سب کام کے لیے اپنا کمیشن (محنتانا) بھی لیتے تھے۔اس عہد میں صراف و دلال دونوں کی تجارتی حلقہ میں کافی اہمیت تھی۔کوئی بھی تاجر ان کی خدمات کے بغیر اپنا کاروبار نہیں چلا سکتا تھا۔

7.9 کاریگر اور غلام (Craftsmen/Women, and Slaves)

دسویں صدی سے شمالی ہندوستان میں شہر دوبارہ پنپنے لگے۔ترکوں کی آمد وان کی مرکزی حکومت نے اس عمل کو اور تیز کر دیا۔انکا حکمراں طبقہ اپنے اعلیٰ معیارِ زندگی کے ساتھ شہروں میں مقیم تھا۔ابن بطوطہ دہلی کو اسلامی دنیا کے مشرقی حصّہ کا سب سے بڑا شہر کہتا ہے اس کے علاوہ کئی اور شہر اہمیت کے حامل ہوئے جیسے ملتان، لاہور، کڑا (الہ آباد کے قریب) دولت آباد (دیوگیر) لکھنوتی وغیرہ۔شہروں کی معاشی زندگی میں امراء اور انکے نوکر و تابع دار اور تاجر و دکان دار غلبہ رکھتے تھے۔شہروں میں سب سے بڑا گروہ نوکروں و غلاموں، کاریگروں، و سپاہیوں کا اور ایک ملا جلا گروہ پھیری والوں، موسیقاروں، آزاد پیشے والوں اور فقیروں وغیرہ کا تھا۔ہمیں اس ملے جلے گروہ کے معیارِ زندگی و سماجی پسِ منظر کی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ اس عہد کے شہروں میں مختلف نسل اور الگ الگ معیار کے لوگ یکجا رہتے تھے۔ شہروں کا نگراں کوتوال تھا جو امن و امان قائم کرتا۔ساتھ ہی ساتھ اور بہت ساری ذمہ داریاں اٹھاتا تھا۔دراصل اس عہد میں شہر مختلف قسم کے کاریگروں کا مرکز تھا جیسے کپڑا بننے والے، کپڑے پر رنگین تصاویر بنانے والے، کڑھائی کرنے والے وغیرہ۔شاہی کارخانوں میں بہت سے کاریگر و دست کار ملازم تھے جو مہنگے کپڑے بناتے تھے جن پر سونے، چاندی و ریشم کے دھاگے کی کشیدہ کاری ہوتی تھی۔بہت سے کاریگر اپنے گھروں میں کام کرتے تھے۔یہ لوگ ذاتوں کی بنا پر تنظیموں (گلڈ) میں منظم ہوتے تھے۔

شہروں میں ایک بڑا گروہ غلاموں و گھریلو نوکروں کا تھا۔ایک لمبے عرصے سے ہندوستان، وسطیٰ ایشیا اور یورپ میں غلامی کا رواج تھا۔غلاموں کے بازار دونوں جگہ یعنی ہندوستان اور وسطیٰ ایشیا میں موجود تھے۔ترکی، کوہ قاف کے، یونانی اور ہندوستانی غلام بڑے قیمتی ہوتے تھے اور ان کی بڑی مانگ ہوتی تھی۔کچھ غلام افریقہ سے بھی درآمد کیے جاتے تھے خاص کر حبشی غلام۔عام طور پر غلاموں کو گھریلو کاموں اور ان کی ہنر مندی کی وجہ سے خریدا جاتا تھا۔کچھ غلام بہت قیمتی ہوتے تھے اور کچھ غلام سلطان بھی بنے۔وسطیٰ اور مغربی ایشیا میں غلاموں کو حاصل کرنے کے لیے حملے کیے جاتے تھے۔ابتدائی ترکی سلاطین نے یہ روش قایم رکھی۔اس وجہ سے قطب الدین نے جب 1195 میں گجرات پر حملہ کیا تو اس نے بیس ہزار لوگوں کو غلام بنایا۔مگر بعد کے سلاطین نے یعنی بلبن و علاء الدین خلجی نے ایسا نہیں کیا۔البتہ غلام مالِ غنیمت کا حصّے ہوتے تھے۔مگر دیہی علاقوں کے زور طلب حصّے میں جنگی مہم کے دوران کافی بڑی تعداد میں مرد، عورت و بچّوں کو گرفتار کیا جاتا

اور غلاموں کے طور پر دہلی کے بازار میں فروخت کیا جاتا تھا۔اس لیے برنی نے غلام لڑکی ولڑکے کی قیمتیں، مویشیوں کی قیمتوں ساتھ بیان کیں ہیں۔ ویسے وسطیٰ ومغربی ایشیا میں غلام عسکری مقاصد کے لیے ہی خریدے جاتے تھے مگر دہلی میں یہ غلام زیادہ تر گھریلو کام کاج کے لیے خریدے جاتے تھے۔ فیروز تغلق نے اس روش سے انحراف کرتے ہوئے اپنے امراء کو یہ حکم دیا کہ جنگ کے دوران غلاموں کو گرفتار کریں اوران میں سے بہترین غلاموں کو سلطان کی خدمت کے لیے بھیجیں۔اس طرح سے ایک لاکھ اسّی ہزار غلام جمع ہوگئے۔اس تعداد میں سے کچھ کو مذہبی تعلیم دی گی، 12000 کو کاریگر بننے کی تربیت دی گی ٔاور مختلف پرگنوں میں بھیج دیا گیا۔کچھ غلاموں سے ہتھیار بند محافظوں کا دستہ مرتب کیا گیا۔ فیروز تغلق کے انتقال کے بعد اس دستے نے سلطان بنانے کا رول ادا کیا مگر کامیاب نہ ہوسکا اور منتشر ہوگیا۔ مغل عہد میں گھر کے کاموں کے لیے غلام استعمال ہوتے رہے۔ مگر صنعت کے شعبے میں اور فوج میں انہوں نے کوئی اہم رول ادا نہیں کیا۔البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ غلامی ایک غیر انسانی روش ہے جو آزاد مزدوروں اور کم تنخواہ والوں کا معیار گرادیتی ہے۔

7.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دہلی سلطنت کی تاسیس اور ترکوں کی حکومت کے قائم ہونے سے ہندوستانی سماج پر بھی اثر پڑا اور ایک نیا حکمراں طبقہ ابھرا جسکی نوعیت وتشکیل گزشتہ حکمراں طبقہ سے مختلف تھی۔ابتدائی دور میں صرف ترک لوگ ہی اس کا حصہّ تھے مگر رفتہ رفتہ اس کی نوعیت میں تبدیلی آئی اور دوسرے لوگ بھی جیسے تاجک، افغان، ہندوستانی مسلمان وہندواور بیرون ملک کے لوگ بھی اس میں شامل ہوگئے۔اس طرح حکمراں طبقے کی بنیاد کشادہ ہوگئی۔نئے حکمراں طبقے کے ہمراہ دوسرے طبقے بھی اہمیت کے حامل ہوئے جیسے علماء، قاضی وغیرہ، نچلے درجے کے افسر جیسے عامل، محرّر وغیرہ۔ شہروں کے دوبارہ ابھرنے اور تجارت کے فروغ سے تجارتی طبقے جیسے ملتانی و بنجاراتاجر وغیرہ اور صراف ودلال وغیرہ ابھرے۔ شہروں میں امراء کے علاوہ انکے تابع دار ونوکر، چھوٹے دکان دار، کاریگر و غلام بھی سماج کے اہم حصّے تھے۔ دیہی علاقوں میں مقامی سردار اور خوط، مقدم وچودھری حکمراں طبقے کی نمائندگی کرتے تھے۔

7.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

اقطاع : قابل تبادلہ زمینی آمدنی کی تفویض جو کسی افسر یا امیر کو اس کی فوجی یا انتظامی خدمات کے عوض میں دی جاتی تھی۔

ولی : بڑے صوبے کا صوبےدار یا گورنر

مقطع : اقطاع کا مالک

ترکان چہلگانی: روایتی طور پر چالیس ترک امیروں کا گروہ، لیکن ان کی تعداد معین نہیں تھی۔

خمار : شراب کی کشید کرنے والا۔

7.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

7.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اقطاع کسے کہتے ہیں؟
2. ولی کسے کہتے ہیں؟
3. مقطع کسے کہتے ہیں؟
4. ترکان چہلگانی کسے کہتے ہیں؟
5. خمار کسے کہتے ہیں؟
6. بنجارا تاجر کسے کہتے ہیں؟
7. ملتانی تاجر کسے کہتے ہیں؟
8. دلال کسے کہتے ہیں؟
9. صراف کسے کہتے ہیں؟
10. طباخ کسے کہتے ہیں؟

7.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

مندرجہ ذیل میں سے کسی تین پر ایک نوٹ لکھیے۔

1. علماء۔
2. اقطاع نظام اور حکمراں طبقہ۔
3. مقامی سرداران۔
4. کم درجے کے افسران۔
5. کاریگر اور غلام طبقہ۔

7.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. حکمراں طبقہ کی نوعیت کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
2. اقطاع نظام کے اہم نکات پر ایک مضمون لکھیے۔
3. کاریگر اور غلام طبقہ پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

7.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Ashraf, Kunwar Muhammad, *Life and Conditions of the People of Hindustan*. 3rd edn., Munshiram Manoharlal, New Delhi, 1988.
2. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*. Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 2017.
3. Habib, Irfan, *Medieval India*: *The Study of Civilization*. 1st edn., National Book Trust, New Delhi, 2007.
4. Khan, Iqtidar Alam, *Studies in Thought*, *Polity*, *and Economy of Medieval India 1000-1500*. Primus Books, New Delhi, 2021.

اکائی 8۔ علاقائی سلطنتیں

(Regional Sultanates)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 بنگال

8.3 جونپور

8.4 مالوہ

8.5 گجرات

8.6 میواڑ

8.7 کشمیر

8.8 وجے نگر ریاست

8.9 بہمنی سلطنت

8.10 اکتسابی نتائج

8.11 کلیدی الفاظ

8.12 نمونہ امتحانی سوالات

8.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

8.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کی ابتدا سے ہی سلاطین اور امراء کے مابین کشمکش سلطنت کو کمزور کر رہی تھی۔ جب تک مرکزی حکومت مضبوط و مستحکم رہی، ساری بغاوتیں کچل دی گئیں۔ سلطنت بکھرنے کے آثار محمد بن تغلق (1325تا1351) کے دورِ حکومت سے عیاں ہونے لگے تھے جب جنوب میں بہمنی سلطنت ایک آزاد ریاست کے طور پر 1347ء میں وجود میں آگئی۔ پھر بھی قریب اگلے پچاس سال تک دہلی سلطنت سالم رہی۔ لیکن امیر تیمور کے حملے (1398ء) نے اس کی کمزوریاں عیاں کر دیں اور امراء کو موقع مل گیا کہ وہ آزاد و خود مختار ریاستیں قائم کر لیں۔ یہ علاقائی سلطنتیں دو قسم کی تھیں۔ ایک وہ جن کا پنپنا و ترقی پانا دہلی سلطنت پر منحصر نہیں تھا۔ مثال کے طور پر آسام، اوڑیسہ و کشمیر وغیرہ۔ دوسرے وہ علاقائی سلطنتین تھیں جنکا وجود دہلی سلطنت کی وجہ سے تھا۔ ان کو دہلی سلطنت کے ریاستی یا علاقائی حکمرانوں نے قائم کیا تھا۔ مثال کے طور پر جونپور، بنگال، گجرات، مالوہ وغیرہ۔

امیر تیمور کے حملے نے جو کہ 1398 میں واقع ہوا دہلی سلطنت کے زوال کو تیز کر دیا اور دہلی سلطنت بکھرنے لگی۔ تیمور کے حملے سے پہلے ہی دہلی سلطنت زوال کی طرف رواں ن تھی۔ کئ علاقائی سلطنتیں ٹوٹ کر وجود میں آگئی۔ جنوب میں محمد بن تغلق کے دورِ حکومت میں بہمنی سلطنت اور وجے نگر ریاست کی بنیاد پڑ گئ تھی۔ مشرق میں بھی بنگال اور مغرب میں سندھ اور ملتان بھی دہلی سلطنت سے الگ ہو گئے۔ امیر تیمور کے حملے کے بعد گجرات، مالوہ اور جونپور کے گورنروں نے بھی اپنے آپکو آزاد کر لیا جب کہ خضر خاں نے پنجاب میں پورے اختیارات حاصل کر لیے۔ راجستھان میں اجمیر سے مسلم گورنر کو باہر نکال دیا گیا اور بہت سے راجپوتوں کی سلطنتیں قایم ہو گئیں۔ حلانکہ یہ ریاستیں آپس میں لڑ رہی تھیں مگر یہ خیال غلط ہو گا کہ پندرہویں صدی میں ہندوستان میں تنزل کا دور تھا۔ سیاسی طور پر ان کی آپسی لڑائیاں اپنے علاقوں تک محدود رہیں اور آپس میں اقتدار کا توازن قایم رہا۔ یعنی کوئی ایک ریاست طاقتور نہ ہوئی جو کہ دوسری ریاستوں پر حاوی ہو جاے۔ مشرق میں گجرات، مالوہ و میواڑ نے ایک دوسرے کو قابو میں رکھا۔ جنوب میں بنگال کو اپنی طاقت بڑھانے سے اوڑیسہ کے گج پتی حکمرانوں نے اور جونپور کے شرقیوں نے روکے رکھا۔ شمالی ہند میں کشمیر الگ تھلگ رہا۔ پندرھویں صدی میں لودیوں کے ظہور نے انکے اور شرقیوں کے بیچ گنگا جمنا دوآب علاقے کے لیے کشمکش شروع کر دی۔ پندرھویں صدی کے آخر میں طاقت کا توازن ختم ہونے لگا۔ لودی حکمرانوں نے شرقی سلطنت کو ختم کر کے اپنا تسلط پنجاب سے لے کر بنگال کی سرحد تک قائم کر لیا۔ ادھر مشرق میں مالوہ اندرونی خلفشار کی وجہ سے ٹوٹنے لگا جس نے گجرات و میواڑ کے بیچ تصادم میں شدت پیدا کر دی۔ ادھر لودی حکمراں بھی اپنا تسلط علاقے میں بڑھانا چاہتے تھے۔ یوں شمالی ہند پر اقتدار قائم کرنے کے لیے مالوہ میدانِ جنگ بن گیا۔

اس سیاسی کشمکش کے باوجود ثقافتی میدان کافی میں ترقی ہوئی۔ ان علاقائی سلطنتوں نے علاقائی رسم و رواج کو بڑھاوا دیا اور خاص کر فن تعمیر میں علاقائی و ترکی رواج کا امتزاج ہوا جس کا نتیجہ خوبصورت عمارتوں کی شکل میں نظر آیا۔ علاقائی زبانوں کو بھی سرپرستی ملی و سیاسی ضرورت کے تحت ان سلطنتوں کے حکمرانوں نے ممتاز علاقائی ہندو راجاوں سے قربت بڑھائی جس کا اثر جاری ثقافتی عمل پر ہوا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں تعلقات و تعاون بڑھا۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی نقشے پر ابھرنے والی مختلف علاقائی سلطنتوں کے بارے میں پڑھیں گے۔
- دہلی سلطنت کی زوال کے وجہ سے ابھرنے والی اور آزاد طور پر عروج پانے والی ریاستوں کو جانیں گے۔
- خصوصی طور پر مشرق میں بنگال، جونپور اور اڑیسہ، مغرب میں گجرات، مالوہ، میواڑ کے بارے میں جان سکیں گے۔
- شمال میں کشمیر اور جنوب میں بہمنی اور، وجے نگر سلطنتوں کا مطالعہ کریں گے۔

8.2 بنگال (Bengal)

یہ مشرقی ہندوستان کا ایک اہم صوبہ تھا۔ بنگال کے حکمراں شروع سے ہی آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ دہلی سے دوری کے وجہ سے کسی کمزور حکمراں کے آتے ہی وہ اپنی آزادی کا اعلان کر دیتے لہذا دہلی سلطان کو ہمیشہ بنگال کے خلاف فوجی کاروائی کرنی پڑتی تھی۔ طغرل خاں کی بغاوت کچلنے کے بعد بلبن نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو وہاں کا صوبیدار بنایا۔ اس کے وارث بہت دنوں تک بنگال پر حکومت کرتے رہے۔ محمد تغلق کے عہد میں شمالی ہندوستان میں بغاوتوں کا ایک سلسلہ ہوا جب وہ ان کو کچلنے میں مصروف تھا ادھر اس موقع کا فائدہ اٹھا کر بنگال 1338ء میں پھر آزاد ہو گیا۔

1342ء میں امیر الیاس خاں پورے بنگال پر قبضہ کر کے سلطان شمس الدین الیاس خاں کے نام سے تخت نشین ہو گیا۔ اس نے ترہت، چمپارن، گورکھپور اور بنارس تک اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس نے اپنے آپ کو دہلی سے مکمل طور پر آزاد کر لیا۔ اس وقت سے لے کر اکبر (1556تا1605) کے عہد تک وہ ایک آزاد مملکت ہی رہا۔ سلاطین دہلی نے ہمیشہ بنگال کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کی لیکن اپنے مقصد میں زیادہ عرصہ تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ فیروز تغلق (1351تا1388) نے 1353ء میں بنگال پر حملہ کیا۔ لیکن فیروز تغلق نے جلد ہی الیاس کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا۔ لیکن وہ ایک آزاد حکمراں کے طور پر کام کرتا رہا۔ الیاس شاہ عوام میں بہت مقبول تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سکندر شاہ تخت نشین ہوا۔ فیروز شاہ تغلق نے 1359ء میں بنگال پر پھر حملہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی بغیر کامیابی حاصل کیے وہ بنگال سے لوٹ آیا۔ اس کے بعد 1393ء تک بنگال پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ اس درمیان بنگال میں کئی خاندانوں کی حکومت قائم ہوئی۔

الیاس شاہی خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ غیاث الدین اعظم شاہ (1389تا1409) تھا وہ اپنی انصاف پسندی کے لیے مشہور تھا۔ وہ عالموں کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس کے عہد میں چین سے سفارتی اور تجارتی تعلقات بہت اعلیٰ سطح پر قائم ہوئے۔ اس نے اپنا سفیر چین بھیجا۔ چین کا سفیر بھی ہندوستان آیا۔ اس کا براہ راست فائدہ بنگال کی تجارت کو ہوا۔ اسی دوران بنگال میں راجہ گنیش کی ہندو حکومت قائم ہوئی لیکن اس کے بعد اس کے جانشینوں نے اسلام قبول کر کے حکومت کرنے کو ترجیح دی۔ پانڈیوا اور گوڑ شہر جو بنگال میں ثقافتی مراکز کی حیثیت سے ابھرے، بنگال کے سلاطین نے وہاں عظیم عمارتیں تعمیر کروائیں جو فن تعمیر کے لحاظ سے یگانہ تھیں۔ ان لوگوں نے بنگالی زبان وادب کو فروغ

دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ مثلاً شری کشن وجے کے مصنف مالدھر باسو کو گن راجا خاں کے خطاب سے نوازااوراس کے بیٹے کو ستیہ راجا خاں کا خطاب دیا گیا۔ بنگالی زبان وادب کے فروغ کے لیے سب سے سنہرا دور علاء الدین حسین شاہ کے عہد کو مانا جاتا ہے۔

علاء الدین حسین شاہ 1493ء میں بنگال کا سلطان بنا۔ بنگال میں امن وامان کے ایک نئے دور کا آغاز کیا، ہندوؤں کے ساتھ اس نے غیر معاندانہ پالیسی اپنائی۔ سرکاری ملازمت میں ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں برتا، انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا مثلاً ایک ہندو عالم اس کا وزیر تھا۔ اس کے علاوہ کئی اعلیٰ عہدیدار مثلاً طبیب اعلیٰ، محافظ اعلیٰ اور ٹکسال کا ناظم سب ہندو ہی تھے۔ وہ وشنو سنت چیتنیہ کی بہت عزت کرتا تھا۔ علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا نصرت شاہ بادشاہ بنا۔ اس کے بعد اس کے کمزور جانشینوں کی حکومت کے دوران 1538ء میں شیر شاہ نے بنگال پر قبضہ کر لیا۔ حسین شاہی خاندان کی جگہ افغانوں کی حکومت قائم ہوگئی بالآخر 1576ء میں اکبر نے اسے مغل حکومت میں شامل کر لیا۔

8.3 جونپور (Jaunpur)

جونپور دہلی سلطنت کی سب سے پہلی ریاست تھی جس نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے 1360ء میں شہر جونپور قائم کیا تھا۔ بعد میں جونپور شرقی ریاست کا مرکز بن گیا۔ 1394ء میں محمد تغلق دوئم نے اپنے امیر خواجہ جہاں ملک سرور کو ''ملک الشرق'' کے خطاب کے ساتھ مشرقی علاقوں کا حاکم بنا دیا۔ ملک الشرق کی نسبت سے اسے شرقی حکومت کہا جانے لگا۔ وہ ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ اپنی سلطنت کو اس نے بہت وسعت دی۔ 1399ء میں ملک سرور کے انتقال کے بعد مبارک شاہ تخت پر بیٹھا۔ تیمور کے حملے کی وجہ سے پھیلی سیاسی افراتفری کا فائدہ اٹھا کر اس نے دہلی سلطنت سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس نے سلطان کا خطاب اپنایا۔ اپنے نام سے خطبہ پڑھوایا اور سکے بھی جاری کیے۔ شرقی سلطنت اپنے عروج کے زمانے میں کول (علی گڑھ)، پورب میں بکسر اور دربھنگہ، اتر میں نیپال کی ترائی اور جنوب میں بندیل کھنڈ تک کے ایک وسیع اور عریض علاقے تک پھیلی ہوئی تھا۔

1400ء میں مبارک شاہ کا چھوٹا بھائی ابراہیم شاہ شرقی ریاست کا سلطان بنا۔ اس نے جونپور پر 40 سال حکومت کی۔ وہ شرقی خاندان کا سب سے اہم سلطان تھا۔ ابراہیم شاہ کا اور دہلی کے سلاطین کے درمیان ہمیشہ تنازع رہا۔ جونپور پر قبض کرنے کے منصوبے کو ابراہیم شاہ نے ناکام بنا دیا۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ حسین شاہ تھا۔ سلطان بہلول لودی نے حسین شاہ کو شکست دے کر جونپور کو دہلی سلطنت میں شامل کر لیا۔ 1494ء میں سکندر لودی نے بنارس کے نزدیک حسین شاہ کو شکست دی۔ جونپور اس طرح دہلی سلطنت کا ایک حصّہ بن گیا۔

شرقی سلطانوں نے جونپور کو ثقافت کا ایک نیا مرکز بنا دیا۔ جونپور کی شاندار عمارتیں، مسجدیں اور مقبرے فن تعمیر کے اہم نمونے ہیں ۔ شرقی سلاطین علم وادب اور ثقافت کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے اپنے دربار میں شعراء، ادباء، علماء اور صوفیا کی سرپرستی کی۔ جونپور اپنی ثقافتی و تہذیبی ترقی کی وجہ سے 'شیراز مشرق' کے نام سے مشہور ہوا۔ ملک محمد جائسی کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ ان کی مشہور تصنیف ''پدماوت'' کسی

تعارف کی محتاج نہیں۔ جونپور کی اٹالہ مسجد شرقی طرز تعمیر کی ایک بہترین مثال ہے۔اسی وجہ سے بعض مورخین نے اس کو 'شیراز۔ہند'-- کے نام سے بھی منسوب کیا۔

8.4 مالوہ (Malwa)

مالوہ پر راجپوت خاندان کی حکومت تھی۔ یہ صوبہ نربدا اور تاپتی دریاوں کے بیچ پٹھاری علاقے میں واقع تھا۔ یہ علاقہ معاشی اعتبار سے بہت ہی اہم تھا۔ یہ جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے ایسی جگہ واقع تھا کہ اس پر قبضہ ہونے کا مطلب کہ پورے شمالی ہندوستان پر اقتدار قائم کرنے کے مترادف تھا۔ اسی لیے سلاطین دہلی کی نگاہ مالوہ پر لگی رہتی تھی۔ سب سے پہلے التمش نے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ 1310ء میں علاءالدین کے کمانڈر عین الملک ملتانی نے مالوہ کے راجہ پر فتح پائی۔ علاءالدین نے عین الملک کو ہی وہاں کا نگران اعلیٰ مقرر کیا۔ 1310ء سے 1378ء تک مالوہ پر دلی کے سلطانوں کا ہی اقتدار ہی قائم رہا۔ 1398ء میں تیمور کے حملہ کی وجہ سے جو سیاسی انتشار پھیلا اس کا فائدہ اٹھا کر وہاں کے صوبیدار دلاور خاں غوری نے اپنی آزادی کا علان کر دیا اور ایک آزاد حکمراں کی طرح حکومت کرنے لگا۔ لیکن اس نے سلطان کا لقب اختیار نہیں کیا۔

1406ء میں دلاور خاں کی موت کے بعد اس کا بیٹا الپ خاں تخت نشین ہوا اور ہوشنگ شاہ کا خطاب اختیار کیا اور ایک آزاد حکمراں کی طرح حکومت کی۔ اس کے زمانے میں مالوہ کی راجدھانی دھار سے مانڈو منتقل ہوئی۔ وہ توسیع پسند بادشاہ تھا اس نے اپنی سرحدوں کو بڑھانے کے لیے قریبی ریاستوں پر حملہ کر کے ان پر اپنا اقتدار قائم کیا۔

ہوشنگ شاہ کا 1435ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ کے نام سے مالوہ کے تخت پر بیٹھا۔ ایک سال کے بعد اس کے وزیر محمود خاں نے اسے قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن کر بیٹھا اور مالوہ پر ایک نئے خلجی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ محمود خلجی کی تعریف کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے کہ ''وہ بہت ہی نرم مزاج، بہادر اور انصاف پسند بادشاہ تھا۔ وہ ایک عالم بھی تھا۔ اس کے عہد حکومت میں ہندو مسلم عوام بہت ہی خوش حال اور پر سکون تھے۔ ان میں دوستانہ تعلقات تھے۔ کوئی ایسا سال نہیں جب وہ میدان جنگ میں نہ اترا ہو اس طرح خیمہ اس کا گھر بن گیا اور میدان جنگ اس کی آرام گاہ فرصت کے اوقات وہ تاریخ کو سننے میں گزارتا تھا۔ چتوڑ کے راجہ رانا کے ساتھ محمود خلجی کی جنگ کسی فیصلہ کے بغیر ختم ہوئی لیکن دونوں فریقوں نے اپنی کامیابی کا نہ صرف دعویٰ کیا بلکہ اپنی فتح کی یادگار میں چتوڑ میں رانا نے وجے استمبھ بنوایا۔ محمود نے بھی اپنی کامیابی کا دعویٰ کرتے ہوے مانڈو میں سات منزلہ مینار تعمیر کروایا۔ اس کی بہادری سے متاثر ہو کر مصر کے خلیفہ نے اسے سلطان کا خطاب دیا اور اپنا سفیر اس کے دربار میں بھیجا۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ سلطان محمود دوئم 1512ء میں سلطان بنا کچھ دنوں کے بعد گجرات کے سلطان بہادر شاہ نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا اور اس کے خاندان کے دوسرے لوگوں کو ملک بدر کر دیا۔ صرف ایک شخص بچ گیا جو خوش قسمتی سے اس وقت ہمایوں کے دربار میں تھا۔ 1531ء میں مالوہ گجرات میں شامل کر لیا گیا۔ مالوہ ثقافتی اعتبار سے بہت ترقی پزیر تھا۔ مالوہ کے حکمرانوں نے بہت ہی عالی شان عمارتیں تعمیر کروائیں۔ ان عمارتوں میں جامع مسجد، منڈ ولا محل بہت ہی مشہور ہیں۔

8.5 گجرات (Gujarat)

غیر ملکی حملہ آوروں کے لیے گجرات ہمیشہ سے توجہ کا مرکز رہا کیونکہ گجرات بہت ہی زرخیز علاقہ تھا اس لیے زرعی پیداوار یہاں کا اہم ذریعہ آمدنی تھا اور دوسرے یہاں سمندری قدرتی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے تجارت بہت ترقی پر تھی۔ گجرات ملکی اور غیر ملکی تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ لہذا اپنی زراعت اور تجارت اور قدرتی وسائل کی وجہ سے گجرات بہت ہی دولت مند خطہ شمار ہوتا تھا۔ 1297ء میں علاء الدین خلجی نے اس پر قبضہ کرلیا اور سلاطین دہلی کے گورنر گجرات پر بہت ہی لمبے عرصے تک اس پر حکومت کرتے رہے۔ 1401ء میں ظفر خاں گجرات کا گورنر بنا۔ مگر اس نے باقاعدہ آزاد حکمراں کی طرح حکومت شروع کردی۔

ظفر احمد خاں کا لڑکا تاتار خاں اپنے والد کو قید کر کے نصیر الدین محمد شاہ کے نام سے خود سلطان بن بیٹھا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اس کو قتل کر دیا گیا۔ لہذا ظفر خاں دوبارہ 1407ء میں سلطان مظفر شاہ کے خطاب سے بادشاہ بنا۔ اس نے مالوہ کے حکمراں ہوشنگ شاہ کو شکست دے کر مالوہ پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا پوتا الپ خاں احمد شاہ کے نام سے سلطان بنا۔ اس نے تیس سال (1411ء سے لے کر 1441ء) حکومت کی۔ احمد شاہ اول کو گجرات سلطنت کا اصل بانی بھی کہا جاتا ہے اس کے اہم کارناموں میں امراء پر کنڑول قائم کرنا، حکومت کو استحکام بخشا اور ریاست کو توسیع دے کر مضبوط بنانا شامل ہیں۔ احمد شاہ نے گجرات سے منسلک راجپوت ریاستوں کو اپنے زیر اقتدار لانے کی کوشش کی۔ سوراشٹر میں اس نے گرنار کے مضبوط قلعے پر قبضہ کر لیا۔ لیکن خراج دینے کے وعدے پر قلعہ راجہ کو لوٹا دیا۔ اس نے سدہ پور پر بھی حملہ کیا۔ ہمیں اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ اس نے سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کا بڑی تعداد میں تقرر کیا، جو اس کی مذہبی رواداری کی بہترین مثال ہے۔ وہ ایک عدل پسند بادشاہ تھا۔

احمد شاہ کے انتقال کے بعد گجرات پھر سے سیاسی انتشار کا شکار ہو گیا۔ اس انتشار کو ختم کر کے امن وامان قائم کرنے کا سہرا محمود بیگڑا کو ہے۔ اس نے گجرات پر 50 سال سے بھی زیادہ 1459ء سے 1511ء تک حکومت کی۔ محمود بیگڑا سوراشٹر کو اپنے زیر اقتدار لانا چاہتا تھا کیونکہ یہ علاقہ اپنی قدرتی بندرگاہوں اور زرخیزی کی وجہ سے بہت ہی خوشحال تھا۔ گرنار کا قلعہ سوراشٹر پر کنڑول قائم رکھنے اور سندھ کے خلاف جنگی مہم کے لیے بہت موزوں تھا۔ لہذا اس نے گرنار پر حملہ کر کے فتح کر لیا۔ سلطان نے گرنار کی پہاڑی کے نیچے مصطفیٰ آباد نام کا ایک نیا شہر بسایا۔ اس نے وہاں پر باغ بھی لگوائے۔ گجرات اپنی تجارت کے لیے بہت مشہور تھا۔ اس کے تجارتی تعلقات مغربی ایشیا کے ملکوں سے بہت ہی پرانے تھے۔ پرتگالی اپنی بحری قوت کی بنیاد پر گجرات کی تجارت میں دخل اندازی کرنے لگے تھے۔ محمود نے پرتگالیوں کے خلاف بھی معر کہ آرائی کی لیکن اس میں اس میں اسے کامیابی نہیں مل سکی۔ محمود بیگڑا نے تجارت کو بہت فروغ دیا۔ تاجروں اور مسافروں کی سہولت کے لیے سرائے اور مسافر خانے بنوائے۔ وہ خود تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن اس نے اہل علم اور دانشوروں کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ ان کی سرپرستی کرتا تھا اس کے عہد حکومت میں متعدد عربی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اُدے راج اس کا درباری شاعر تھا اور وہ سنسکرت کا شاعر تھا۔ محمود د بیگڑہ کے عہد میں گجرات اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ اور اس کا شمار ملک کے خوشحال اور طاقتور ریاستوں میں ہونے لگا۔ 1573ء میں اکبر نے اس کو مغل حکومت میں شامل کر لیا۔

8.6 میواڑ (Mewar)

راجپوتانہ کی سب سے اہم اور مضبوط ریاست میواڑ تھی۔ یہاں سیسودیا خاندان کی حکومت تھی۔ 1303ء میں علاءالدین خلجی نے میواڑ کی راجدھانی چتوڑ پر قبضہ کر لیا۔ خضر خاں کو وہاں کا نگراں متعین کیا گیا چتوڑ کا نام بدل کر خضر آباد کر دیا۔ لیکن خضر خاں کو وہاں کے راجپوتوں کی مخالفت کی وجہ سے چتوڑ چھوڑنا پڑا۔ مجبور ہو کر علاءالدین نے مالدیو نامی راجپوت سردار کو اپنا نمائناہ منتخب کیا۔ علاءالدین کے بعد دیونے میواڑ کے وقار کو بحال کیا۔ سب سے اہم حکمراں رانا کمبھا((68-1433 تھا جس کا سارا وقت گجرات اور مالوہ کے ساتھ جنگوں میں گزارا۔ مالوہ کے سلطان محمود خلجی پر فتح حاصل کرنے کی یاد میں چتوڑ میں ''وجیا ستمھ'' بنوایا۔ میواڑ کا سب سے مشہور و معروف راجا رانا سانگا تھا۔ بابر کی مدد سے وہ ہندوستان میں افغانوں کی حکومت کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا لیکن بابر نے اس کنواہ کی جنگ میں شکست دے کر اس کی قوت کو ختم کر دیا میواڑ کے راجاوں نے اکبر کو بھی پریشان کیا بالآخر جہانگیر کے عہد میں امر سنگھ نے مغلوں کی ماتحتی قبول کر لی۔ میواڑ کے علاوہ مارواڑ دوسری اہم ریاست تھی۔ اکبر کے زمانہ میں مارواڑ پر مغلوں کا تسلط ہو گیا۔ آمیر ایک تیسری اہم ریاست تھی جہاں کچھواہوں کی حکومت تھی۔ آمیر کا سب سے مشہور راجہ بھارمل تھا جس نے اکبر کی ماتحتی قبول کر لی۔ اس طرح یکے بعد دیگرے یہ علاقائی ریاستیں مغل سلطنت کا حصہ بن گئیں۔

8.7 کشمیر (Kashmir)

کشمیر میں بھی مسلمانوں نے ایک آزاد ریاست قائم کی۔ 1315ء میں شاہ مرزا نامی ایک مسلم لوہرا خاندان کی ملازمت میں شامل ہوا۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ کے انتقال کے بعد 1339ء میں شاہ مرزا نے کشمیر کا تخت ہڑپ لیا اور شمس الدین شاہ کے خطاب کے ساتھ بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکے بھی جاری کیے۔ اس کے انتقال کے بعد 47 سالوں تک اس کے لڑکوں جمشید، علاء الدین، شہاب الدین اور قطب الدین نے کشمیر پر حکومت کی۔ قطب الدین کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا سکندر تخت نشین ہوا لیکن کچھ سالوں کے بعد اس کے بھائی شاہی خاں نے اپنے بھائی کو دستبردار کر کے خود 1460ء میں زین العابدین کے نام سے تخت نشین ہو گیا۔ زین العابدین کا شمار کشمیر کے عظیم ترین حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ زین العابدین نے وہ تمام احکامات منسوخ کر دیئے جنھیں سکندر نے نافذ کیا تھا۔ مثلاً سکندر نے ایک فرمان جاری کیا کہ تمام برہمن اور تعلیم یافتہ ہندو یا تو مسلمان ہو جائیں یا وادی چھوڑ کر باہر چلے جائیں۔ زین العابدین نے مذہبی رواداری کی پالیسی اپنائی اور کشمیر کے برہمن جو وادی چھوڑ کر چلے گئے تھے ان کو واپس بلایا۔ زین العابدین نے وسیع النظری کی پالیس اپنائی اس نے جزیہ اور گاوکشی کو بند کرنے کا حکم دیا۔ مندر تعمیر کرنے کی عام اجازت دے دی گئی۔ کتب خانوں کو بھی بحال کیا گیا۔ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوے ستی پر سے پابندی بھی ہٹالی۔ ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔

زین العابدین خود ایک عالم اور شاعر تھا۔ اسے کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ مثلاً فارسی، ہندی، تبّتی، کشمیری، سنسکرت وغیرہ۔ اس کے زیر نگرانی مہابھارت اور راج ترنگنی کا سنسکرت سے فارسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ بہت سی عربی اور فارسی زبان کی کتابوں کا ترجمہ ہندی

میں ہوا۔ان خوبیوں کی وجہ سے اسے ''کشمیر کا اکبر'' کہا جاتا ہے۔1470ء میں زین العابدین کا انتقال ہو گیا۔اس کے بعد اس کا بیٹا حیدر شاہ تخت نشین ہوا لیکن وہ اور اس کے جانشین کشمیر کی تاریخ میں کوئی اہم مقام حاصل نہ کر سکے۔زین العابدین کے انتقال کے بعد کشمیر میں پھر لاقانونیت پھیل گئی اور بالآخر اس کا فائدہ اٹھا کر ہمایوں کے ایک رشتہ دار مرزا حیدر نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔وہ ہمایوں کے نام سے کشمیر پر حکومت کرتا رہا لیکن عملی طور پر وہ ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا۔اکبر نے 1586ء میں کشمیر کو مغل حکومت میں شامل کر لیا۔

8.8 وجے نگر سلطنت (Vijayanagara Empire)

عہدِ وسطیٰ کے جنوبی ہندوستان میں دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک وجے نگر اور بہمنی سلطنتوں کا تسلّط رہا۔یہ نہ صرف اس عہد کی طاقتور سلطنتیں تھی، بلکہ انکے دور میں زندگی کے ہر شعبے معاشی، تہذیبی، فنونِ لطیفہ اور ادب کے میدانوں میں کافی پیش رفت ہوئی۔وجے نگر کا قیام ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔اس سلطنت کا قیام کس طرح عمل میں آیا مورخین کے درمیان اس میں اختلافات رائے پایا جاتا ہے۔ایک روایت کے مطابق وجے نگر سلطنت، پانچ بھائیوں کے ایک کنبے کے دو افراد ہری ہر اور بکا نے قائم کی تھی۔یہ دونوں وارنگل کے کاکتیاؤں کے باج گزار تھے اور موجودہ کرناٹک میں واقع کامپلی سلطنت میں وزیر رہے تھے۔1327ء میں سلطان محمد تغلق نے کمپلی پر قبضہ کر لیا تو انہیں قید کر کے دہلی لے جایا گیا۔یہاں انہوں نے اسلام مذہب قبول کر لیا اور انہیں سلطان محمد تغلق کا اعتماد حاصل ہو گیا۔اب انہیں ایک بار پھر کامپلی کے صوبہ میں نظم و نسق کی ذمہ داری لینے اور وہاں کے مقامی عوام کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ہری ہر اور بکا نے تھوڑے عرصہ بعد ہی اپنے نئے آقا اور نئے مذہب سے قطع تعلق کر لیا۔ان کے گرو 'ودیارنیہ' کی کوشش سے ان دونوں کو ہندو مت میں دوبارہ شامل کر لیا گیا اور انہوں نے وجے نگر میں اپنی الگ ریاست قائم کر لی۔لیکن جدید دانشوروں نے اس روایتی مثاحبہ کو مسترد کر دیا ہے انکے مطابق ہری ہر و بکا کرناٹک کے 75 نائکوں کی جماعت میں سے تھے جنہوں نے ترکوں کی حکومت کے خلاف بغاوت کری۔وجے نگر کی قیام کے متعلق کچھ بھی تنازع ہو مگر ہمارے لیے یہ بات قابل غور ہے کہ اپنا نظم و نسق قائم کرنے میں وجے نگر حکمراں نہ صرف چولہ سلطنت کی تامل رواتیں بروائے کار لائے بلکہ تیلگو و کنڑ رواتیتوں کا بھی استعمال کیا۔اس طرح وہ صرف ایک صوبائی حکمراں ہی نہ تھے بلکہ پورے جنوبی ہندوستان کی ترجمانی و نمائندگی کرتے تھے۔

ہری ہر اول (1336-1357)

ہری ہر اول کی تاج پوشی 1336ء وجے نگر شہر میں ہوئی۔ہری ہر کو شروع میں میسور کے ہوئسال راجا اور مدورائے کے سلطان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ہوئسال کا سارا علاقہ 1346 تک وجے نگر کے قبضہ میں آ چکا تھا۔

بکا اول (1357-1377)

بکا اول نے واحد حکمراں کی حیثیت سے 1377 تک بیس سال حکومت کی۔اسے بہمنی سلطنت کے خلاف اکثر لڑنا پڑا۔بکا کی حکومت کا اہم ترین قابل ذکر واقعہ یہ ہوا کہ اس نے مدورائے کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

ہری ہر دوم (1377-1404)

بکا اول کے بعد اس کا لڑکا ہری ہر دوئم تخت نشین ہوا۔ اس نے ستائیس سال تک حکومت کی۔ اس نے پورے جنوبی ہند میں وجے نگر حکومت کا اقتدار قائم کیا۔ شمال مغرب میں بہمنی سے گوا، چول دبھول اور کھرے پٹن کے بندر گاہ لے لیے گئے اور کچھ عرصہ کے لیے وجیہ نگر کی سلطنت کی شمالی سرحد دریائے کرشنا بن گئی۔ کونڈوڈو کے ریڈیوں سے کرنول، نیلورااور گنتور کے کچھ حصے بھی چھین لیے گئے۔ ہری ہر دوئم نے جنوبی شری لنکا پر حملہ کیا اور اسے خراج دینے پر مجبور کیا۔ اس طرح وجے نگر حکومت کا جنوب میں اقتدار بڑھ گیا۔

دیورائے اول (1406-1422)

ہری ہر دوئم کے 1404 میں انتقال کے بعد اس کے لڑکوں کے درمیان تخت کے لیے زبردست جھگڑا شروع ہو گیا۔ کچھ عرصہ کی بدنظامی کے بعد دیورائے اول ہری ہر دوم کا جانشین بنا۔ پرتگالی مورخ نونیز کے مطابق بکا دوئم اور دیورائے نے وجے نگر شہر کی بڑی توسیع کی۔ انہوں نے شہر کی کئی دیواریں، مینار اور ترتیب کے ساتھ قلعہ تعمیر کرائے لیکن سیول کا بیان ہے کہ ان کا اہم ترین کام دریائے تنگ بھدرا پر ایک بہت بڑا باندھ اور دریا سے پندرہ میل دور تک ایک نہر تعمیر کروانا تھا۔ یہ نہر ہندوستان کے اہم ترین آب پاشی کے ذرائع میں شمار کی جاتی ہے۔ دیورائے اول کو بہمنی سلطان فیروز شاہ (1397۔1433) کے ساتھ جنگ کرنا پڑی۔ آخر میں صلح کے بعد اپنی لڑکی کی شادی فیروز کے ساتھ کرنا پڑی۔ بہمنیوں سے وارنگل کے الگ ہو جانے کی وجہ سے جنوب میں طاقت کا توازن تبدیل ہو گیا۔ اسی اثناء میں فیروز شاہ بہمنی کو بری طرح سے شکست دینے میں دیورائے اول کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے کرشنا ندی کے دہانے تک کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ دیورائے اول کی حکومت کے آخری دنوں میں اطالوی سیاح نکولو کونتی وجے نگر آیا۔ اس شہر کے بارے میں اس کے تاثرات آج بھی محفوظ ہیں۔

دیورائے دوئم (1422-1446)

کچھ عرصے تک بدنظمی رہنے کے بعد دیورائے دوم 1422 میں تخت نشین ہوا۔ وہ اس خاندان کا سب سے اہم بادشاہ مانا جاتا ہے۔ 1467 میں اس نے کونڈوڈو پر حملہ کیا اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد دیورائے دوم نے اڑیسہ پر حملہ کیا۔ دیورائے دوم نے کیرل پر بھی حملہ کیا اور کوئلن اور دوسرے سرداروں کو مغلوب کر کے اپنا اقتدار قائم کیا۔ عبدالرزاق (ایرانی سیاح) کے مطابق دیورائے دوم کی سلطنت شری لنکا سے گلبرگہ اور اوڑیسہ سے مالا بار تک پھیلی ہوئی تھی۔ نونیز کے مطابق دیوائے کوئلن، شری لنکا، پولی کٹ، پیگو اور دوسرے مقامات کے حکمرانوں سے خراج وصول کرتا تھا۔

کرشن دیورائے (1509-1530)

دیورائے دوم کی موت کے بعد وجے نگر سلطنت میں بدنظمی پیدا ہو گئی تھی۔ وجے نگر سلطنت میں سب سے بڑے بیٹے کی جانشینی کا حق طے نہ ہو سکنے کی وجہ سے تخت کے امیدوار کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ ایسے حالات میں متعدد باج گزار ریاستیں آزاد ہو گئیں۔ ریاست کے وزیر طاقتور ہو گئے اور عوام سے مختلف قسم کے تحائف اور بھاری محصول وصول کرنے شروع کر دیئے۔ اس سے عوام میں بے چینی پھیلنے

لگی۔ ریاست کی حکمرانی کرناٹک اور آندھرا پردیش کے کچھ حصوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ حکمراں عیش و عشرت میں غرق ہو گئے اور امورِ حکومت سے لاپرواہی برتنے لگے۔ کچھ ہی دن بعد راجا کے ایک وزیر سلوا نے گدی پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ خاندان بھی امن و امان برقرار رکھنے میں ناکامیاب رہا۔ بالآخر کرشن دیورائے (1509 تا 1530) نے نئے حکمراں خاندان تلوا کی بنیاد رکھی۔

کرشن دیورائے اس خاندان کا عظیم ترین شخص تھا۔ بعض مورخین اسے وجے نگر کا سب سے بڑا راجا مانتے ہیں۔ کرشن دیورائے کا عہدِ حکومت وجے نگر حکومت کی زبردست کامیابی کا زمانہ تھا۔ اس کی فوجوں کو ہر جگہ کامیابی ملی جس کی وجہ سے وجیہ نگر ریاست بہت خوشحال ہو گیا۔ اطالوی سیّاح پائیز کے مطابق وہ عظیم الشان اور ہر طرح سے مکمل انسان تھا۔

کرشن دیورائے کی تخت نشینی کے وقت وجے نگر سلطنت کے حالات قابلِ اطمینان نہ تھے۔ اڑیسہ کے گج پتی حکمراں شمالی اضلاع پر قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ اگرچہ بہمنی سلطنت پانچ ریاستوں میں بکھر چکی تھی لیکن شمال کی جانب سے بالخصوص بیجاپور سے برابر دباؤ پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ پرتگالیوں کی طاقت کا بھی سامنا کرنا تھا۔ پرتگالی مغربی ساحل کے بحری راستوں اور تجارت پر بہت تیزی کے ساتھ اپنا کنٹرول قائم کرتے جا رہے تھے۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود کرشن دیورائے دس برس کی مدت کے اندر پورے ملک میں وجیہ نگر کی حکومت کا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پرتگالی بھی اب اس کے دوست بن گئے تھے۔ سات سال تک کئی لڑائیاں لڑنے کے بعد کرشن دیورائے نے اڑیسہ کو کرشنا ندی تک وجے نگر کے تمام مفتوحہ علاقے واپس کرنے کے لیے مجبور کیا اور بیجاپور سے صلح کر لی۔ کرشن دیو نے جنگ کے لیے زبردست تیاریاں شروع کیں اور رائے چور اور مدگل پر دھاوا بول کر جنگ کا آغاز کیا 1520ء میں بیجاپور کے سلطان کو شکست ہوئی اور اسے کرشنا ندی کے اس پار کھدیڑ دیا گیا۔ وجیہ نگر کی فوج بلگام تک پہونچ گئی۔ پھر اس نے بیجاپور پر بھی قبضہ کر لیا اور کئی دنوں تک قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد جب گلبرگہ کو بھی تاخت و تاراج کر دیا گیا تو صلح ہوئی۔

کرشن دیورائے بہادر جنگجو ہونے کے علاوہ عظیم مدبر، منتظم اور فنونِ لطیفہ کا سرپرست بھی تھا۔ متعدد ممتاز ادیب بادشاہ کی فیاضی سے متاثر ہو کر اس کی سرپرستی میں داخل ہو گئے تھے۔ کرشن دیورائے نے خود تلگو میں امکتہ مالیدہ نامی ایک کتاب سیاست کے موضوع پر لکھی ہے۔ اس کے عہد میں تلگو ادب کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ تلگو کے علاوہ کنڈ اور تامل زبانوں کے شاعروں کی بھی کرشن دیورائے نے حوصلہ افزائی کی۔ کرشن دیورائے نے مذہب کے معاملے میں نرم رویہ اختیار کیا۔ عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے کام کرے اور سب سے زیادہ اس کی وہ بے پناہ دولت جسے اوقاف اور عطیوں کی شکل میں مندروں اور برہمنوں کو دینے کی بنا پر اس کا شمار جنوبی ہندوستان کے عظیم ترین شہنشاہوں میں کیا جاتا ہے۔

کرشن دیورائے کے بعد اس کے جانشینوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ لیکن ان لوگوں میں وہ قوت یا صلاحیت نہیں تھی جو کرشن دیورائے میں تھی۔ 1565 میں تالی کوٹا کی جنگ میں بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کے سلاطین نے وجے نگر کے قائم مقام حکمراں رام راج کو شکست دی اور وجے نگر کو بری طرح لوٹ لیا گیا اور اسے برباد کر دیا گیا۔

8.9 بہمنی سلطنت (Bahmani Sultanate)

بہمنی سلطنت کی بنیاد ایک افغان امیر علاؤالدین حسن نے 1347ء میں ڈالی جس کا خاندان علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت میں دہلی سلطنت میں اہم عہدوں پر فائز ہوا۔ ایک عام روایت کے مطابق حسن ایک برہمن گنگو کا خدمت گار تھا۔ اسی وجہ سے حسن گنگو کہلاتا تھا۔ یہ روایت کہاں تک سچ ہے اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ علاؤالدین حسن نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے خاندان کا درجہ بلند کرنے کے غرض سے اپنا سلسلۂ نسب ایرانی کرداروں اسفندیار اور بہمن سے منسلک کرا اور اپنے نام میں بہمن کا اضافہ کیا۔ اسی لقب کے باعث نئی ریاست بہمنی سلطنت کہلائی۔ سلطان علاؤالدین بہمن شاہ نے گیارہ سال تک حکومت کی۔ اس کی حکومت کا بیشتر حصہ جنگ لڑنے اور ملک کی توسیع میں گزرا۔ سلطنت کے نظم و نسق کو منظم کرنے کے خیال سے ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا اور ہر صوبہ کے لیے صوبے دار مقرر کیا۔

بہمنی سلطانوں اور وجے نگر ریاست کے حکمرانوں کے مفاد کا ٹکراؤ تین الگ اور مختلف علاقوں میں تھا۔ رائچور یا تنگ بھدرا دوآب، کرشنا گوداوری ڈیلٹا اور مراٹھاواڑ کا علاقہ۔ تنگ بھدرا دوآب کا علاقہ اپنے زبردست معاشی اور معاشی اہمیت کی وجہ سے ٹکراؤ کا سبب بنا رہا۔ کرشنا گوداوری ڈیلٹا کا علاقہ زرخیز ہونے کے علاوہ اس میں متعدد بندرگاہیں بھی تھی۔ مراٹھاواڑ علاقے میں لڑائی کونکن کے علاقہ پر اور کونکن کو آنے والے راستوں پر قبضہ کے لیے تھی۔ اس علاقہ میں گوا ایک اہم بندرگاہ تھا جو کہ تجارت کے لحاظ سے جنوبی ریاستوں کے لیے اہم تھا۔ رائچور دوآب اس سے پہلے کی ریاستوں یعنی چولہ و چالوکیہ اور یادوں اور ہوسالیہ کے مابین تصادم کا سبب بھی تھیں۔

وجے نگر اور بہمنی سلطنتوں کے درمیان فوجی ٹکراؤ ایک معمول تھا۔ در حقیقت یہ فوجی تصادم اس وقت تک جاری رہا جب تک یہ دونوں ریاستیں قائم رہیں۔ ان مسلسل جنگوں سے متنازعہ علاقوں میں بھاری تباہی اور بربادی ہوئی۔ دونوں ہی فریق شہروں اور گاؤں کو تاخت و تاراج کر ڈالتے تھے۔ ان لڑائیوں کی بنیاد مذہب ہرگز نہیں تھا بلکہ اس کے پس پشت میں معاش و تجارت پر کنٹرول کے مقاصد کار فرما تھے۔ لیکن مذہب نے ان لڑائیوں کو تلخ بنا دیا تھا۔ ان فوجی ٹکراؤ کو عہدِ وسطیٰ کے مورخین نے کافی تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن یہ بیانات زیادہ اہمیت کے حامل نہیں ہے کیونکہ یہ تصادم دونوں فریقین کی سرحدوں میں کوئی خاصی تبدیلی نہیں لایا آخر میں دونوں کو پرانی سرحد ہی قبول کرنی پڑتی تھی۔

بہمنی سلطنت کا سب سے طاقت ور حکمراں فیروز شاہ بہمن (1397تا1433) تھا۔ معاصر مورخ فرشتہ (تاریخِ فرشتہ) اسے بہمنی خاندان کا سب سے عظیم بادشاہ کہتا ہے۔ برہانِ مآثر (1591تا94) کے مصنف سیّد علی بن عزیزاللہ طباطبائی کی رائے ہے وہ ایک نیک، انصاف پسند اور فیاض طبیعت کا بادشاہ تھا۔ فیروز شاہ بہمن نے کھیرلا کے گونڈ راجہ نرسنگھ کے خلاف کامیاب مہم کی اور برار کی طرف اپنی سلطنت کی توسیع شروع کی۔ نرسنگھ کو چالیس ہاتھی اور بہت کافی زر و مال تاوانِ جنگ کے طور پر فیروز کو دینا پڑا اور اپنی ایک لڑکی کی شادی بھی فیروز سے کرنی پڑی۔ کھیرلا نرسنگھ رائے کو واپس مل گیا اور اسے سلطنت کا ایک امیر بنا دیا گیا۔

فیروز شاہ بہمن کی دیورائے اول کے ساتھ بھی جنگ ہوئی۔ صلح کے بعد اس کا خاتمہ ہوا۔ صلح کے شرائط دیورائے اول کے لیے بہت شرمناک تھیں۔ اس کو بانک پور کا قلعہ فیروز کو دینا پڑا اس کے علاوہ اپنی بیٹی کی شادی فیروز کے ساتھ کرنی پڑی۔ لیکن کرشنا گوداوری ڈیلٹا پر تسلط کے لیے لڑائی جاری رہی۔ جس میں فیروز شاہ بہمن کو شکست ہوئی۔ فیروز کو بہمن سلطنت کا جنوبی اور مشرقی علاقہ دشمن کے قبضہ میں چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ اس شکست کا فیروز شاہ پر بہت اثر پڑا اور وہ غمگیں رہنے لگا اور آخر میں اپنے بھائی احمد کے حق میں حکومت سے دست بردار ہو گیا۔

فیروز شاہ مذہبی علوم، خاص طور پر قرآن کی تفسیر اور فقہ وغیرہ سے پوری طرح واقف تھا۔ علمِ نباتات، قدرتی علوم، اقلیدس، علمِ منطق، علمِ کلام وغیرہ سے بھی اسے خاص دلچسپی تھی۔ وہ ایک اچھا خطاط بھی تھا اور شاعری بھی کرتا تھا۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق وہ محض عربی، ترکی اور فارسی زبانوں کا ماہر نہیں تھا، بلکہ اسے تلگو، کنڑ اور مراٹھی زبانوں پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ اس کے حرم میں مختلف ملکوں اور علاقوں کی بہت ساری عورتیں تھیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ان عورتوں سے ان کی زبان میں ہی بات کرتا تھا۔ فیروز شاہ نے دکن کو ہندوستان کا ثقافتی مرکز بنانے کا عزم کر رکھا تھا۔ دہلی سلطنت کے زوال کے بعد بہت سے علماء و مشائخ نے دہلی سے دکن آکر سکونت اختیار کی۔ بیرونی ملکوں کے علماء کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ فیروز شاہ اکثر آدھی رات تک درویشوں، شاعروں، مورخین اور اپنے درباریوں میں سے سرکردہ عالموں اور دانشوروں کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ بہمن نے بلا کسی مذہبی تفریق کے برہمنوں کو حکومت کے انتظامی امور میں الگ الگ عہدوں پر فائز کیا خاص طور پر مالیات کے شعبہ پر برہمن چھائے ہوئے تھے۔

پندرھوں صدی کے دوسرے حصّے میں بہمنی سلطنت جنوب میں ایک نمایاں طاقت بن کر ابھری۔ دیورائے دوم کے انتقال کے بعد وجے نگر سلطنت میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات نے اوڑیسہ کے گج پتی حکمرانوں کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ علاقے میں اپنا رسوخ اور اقتدار بڑھائیں۔ بہمنی سلطنت نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور اپنی سلطنت کی برار اور خاندیش اور مغرب میں کونکن کی طرف توسیع کی۔ اسی دوران آفاقی (نئے آنے والے) اور دکھنی (پرانے) امراء کے ٹکرائو سے بہمنی سلطنت کے اندرونی معاملات میں افراتفری کا ماحول تھا۔ یہ حالات سدھرے محمود گاواں (1463 تا 1482) کے اقتدار میں آنے سے جو کہ بہمنی سلطنت کا سب سے عظیم وزیر اعظم تھا۔

محمود گاواں پیدائشی طور پر ایرانی تھا اور پہلے وہ ایک تاجر تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں۔ 1456ء میں وہ اس وقت توجہ کا مرکز بنا جب اس کو ایک فوجی دستے کا سربراہ بنا کر ایک تخت کے ایک جھوٹے دعویدار کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کا تعارف موجودہ سلطان سے ہوا اور اس کا رتبہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ 1461 میں جب سلطان کا انتقال ہوا اور اس کا جانشین کم عمر تھا تو محمود گاواں کو نائبین کی جماعت کا ایک رکن نامزد کیا گیا۔ 1463 میں محمود گاواں کو وکیل السلطنت (وزیرِ اعظم) نامزد کیا۔ اور خواجہ جہاں اور ملک التجار کے القاب سے نوازا گیا۔ محمود گاواں کا سلطنت کے معاملات میں تقریباً بیس سال تک اثر حاوی رہا۔ اس دوران اس نے بہمنی سلطنت کی سرحدوں کی توسیع کی کوشش کی خاص کر مشرق و مغرب میں—اس کا سب سے اہم جنگی کارنامہ مغربی ساحلی علاقوں پر فتح پانا

تھا جیسے ڈابھول اور گوا۔ ان بندر گاہوں کا ہارنا وجے نگر کے لیے کافی نقصان دہ ثابت ہوا۔ ان پر قبضہ سے ایران و عراق سے تجارت کو فروغ ملا اور اندورنی تجارت اور صنعتوں کو بھی ترقی ملی۔

محمود گاواں نے نہ صرف بہمنی سلطنت کی توسیع کی بلکہ نظام حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے متعدد اصلاحات بھی کیں۔ بہمنی سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا لیکن اب ان صوبوں کے رقبے میں اضافہ ہو گیا تھا۔ بہتر نظم و نسق کے لیے پوری سلطنت کو آٹھ صوبوں میں یا طرفوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر صوبہ کا الگ الگ طرفدار ہوتا تھا۔ صوبیداروں کے اختیارات میں کمی کر دی گئی اور ان آٹھوں صوبوں میں کچھ علاقہ (خالصہ) سلطان کے خرچ کے لیے بطور خاص مقرر کر دیا گیا۔ ان علاقوں کا انتظام دربار سے براہراست ہوتا تھا۔ نئے انتظام میں صوبیدار کو صرف ایک ہی قلعہ کا اختیار دیا گیا۔ بقیہ قلعوں کے لیے سلطان کے متعین کردہ افراد اور فوج مقرر کی گئی۔ ان سب کی تنخواہ صدر مقام سے دی جاتی تھی۔ محمود گوان نے زمین کی پیمائش پر کسانوں کے ذریعے حکومت کو ادا کیے جانے والے لگان کا نفاذ بھی کیا۔

محمود گاواں ایک علم پرور وزیر تھا۔ اس نے علوم و فنون کو فروغ دیا۔ اس نے بیدر میں تین منزلہ مدرسہ بنوایا۔ اس میں ایک ہزار طالب علموں کے رہنے کی گنجائش تھی۔ انہیں خوراک اور کپڑا سلطنت کی طرف سے مفت دیا جاتا تھا۔ محمود گوان کے دعوت پر اس وقت کے مشہور ایرانی اور عراقی علماء بھی اس مدرسہ میں آئے تھے۔

بہمنی سلطنت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ امراء کے مابین تصادم تھا۔ امراء دو جماعت میں منقسم تھے۔ ایک جماعت نئے آنے والے امراء کی تھی جنہیں آفاقی بھی کہتے تھے اور دوسری پرانے امراء کی جو دکھنی کہلاتے تھے۔ چونکہ محمود گاواں آفاقی تھا اس کو دکھنی امراء کا اعتماد حاصل کرنا بہت مشکل ثابت ہوا۔ حالانکہ اس نے ایک مصالحت کی پالیسی اپنائی۔ اس کے باوجود محمود گاواں اس لڑائی جھگڑے کو روکنے میں ناکام رہا۔ اس کے حریفوں نے بہمنی سلطان کے کان بھر دیئے اور نوجوان سلطان نے محمود گاواں کو 1486 میں سزائے موت دے دی۔ اس وقت وہ تقریباً ستّر سال کا تھا۔ اس کی موت کے بعد امراء کے مابین تصادم مزید شدید ہو گیا اور صوبائی گورنر سرکش اور آزاد ہو گئے۔ جلد ہی بہمنی سلطنت پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ گول کنڈہ، بیجاپور، احمد نگر، برار اور بیدر۔ ان پانچ میں احمد نگر، بیجاپور اور گول کنڈہ نے جنوبی ہندوستان کی سیاست میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ آخر میں مغل حکومت نے سترھویں صدی میں ان تینوں ریاستوں کو اپنی حکومت کا حصّہ بنالیا۔ اور آخر میں مغل حکومت کی یہ توسیع اس کے زوال کا سبب بنی۔

8.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

بے شک چودھویں اور پندرھویں صدی ہندوستان میں سیاسی یک جہتی نہ تھی اور نہ ہی کسی کل ہند سیاسی ریاست نے دہلی سلطنت کی جگہ لی۔ مگر جو علاقائی سلطنتیں مختلف علاقوں میں رونما ہوئیں انہوں نے اپنے آپسی تصادم کے باوجود اپنے علاقوں میں امن وامان قائم رکھا اور ثقافت کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیے۔ انہوں نے علاقائی رسم ورواج، زبانوں و فن تعمیر کی سرپرستی کی۔ اس ہندو مسلم تعاون و ہم آہنگی نے کل ہند مغل سلطنت کے لیے زمین ہموار کی۔

8.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

اقتدار کا توازن	:	ایسا سیاسی نظام جس میں کوئی ریاست اتنی طاقتور نہ ہو جائے کہ وہ دوسری ریاست پر قابض ہو جائے۔
مذہبی رواداری	:	مذہب کے معاملے میں رعایت دینا یا بے تعصّبی برتنا۔
باج گزار	:	خراج یا محصول دینے والا۔
طرف	:	بہمنی سلطنت میں صوبہ۔
آفاقی	:	بہمنی سلطنت میں امراء کا وہ گروہ جو وسطی و مغرب ایشیا سے آکر دکن میں بس گئے تھے۔
دکنی	:	بہمنی سلطنت میں امراء کا وہ گروہ جو ان افراد پر مشتمل تھا جو مقامی لوگ تھے۔
رائچور یا تنگ بھدرا دوآب	:	کرشنا ندی اور اس کی معاون ندی تنگ بھدرا کے درمیان کا علاقہ۔

8.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اقتدار کے توازن سے کیا مراد ہے؟
2. مذہبی رواداری سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
3. باج گزار کسے کہتے ہیں؟
4. طرف کسے کہتے ہیں؟
5. آفاقی کسے کہتے ہیں؟
6. دکنی سے کیا مراد ہے؟
7. رائچور یا تنگ بھدرا دوآب کہاں واقع ہے۔
8. دکنی امرا کون تھے؟
9. محمود گاواں کہاں کا رہنے والا تھا؟
10. محمود گاواں پہلے کیا تھے؟

8.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بنگال کی خود مختار سلطنت کے عروج پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. مالوہ کے سلطان محمود خاں خلجی کی کامیابیوں کا جائزہ لیجیے۔
3. محمود بیگڑا گجرات کا عظیم سلطان تھا، دلیل کے ساتھ وضاحت کیجیے۔

4. سلطان زین العابدین کو کشمیر کا سلطانِ اعظم کیوں کہا جاتا ہے؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔
5. وجے نگر اور بہمنی سلطنت کے درمیان تصادم کی کیا وجوہ تھیں۔

8.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پندرہویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالیے۔
2. وجے نگر اور بہمنی سلطنت کے درمیان تصادم کی کیا وجوہات تھیں۔
3. بہمنی سلطنت کے عروج وارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

8.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanate to the Mughals*. Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 2017.
2. Habib, Irfan, *Medieval India*: *The Study of Civilization*. 1st edn., National Book Trust, India, 2007.
3. Mahalingam, T.V., *Administration and Social Life under Vijayanagar*: *Social life*. University of Madras, 1975.

اکائی 9۔ مغل سلطنت: قیام

(Foundation of the Mughal Empire)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 بابر کی آمد کے وقت ہندوستان کی سیاسی صورتحال

9.3 بابر اور وسطی ایشیاء

9.4 ہندوستان میں مغل سلطنت کا قیام

9.4.1 بابر اور راجپوت سیاسی طاقتیں

9.4.2 بابر اور افغانی سردار

9.5 ہمایوں

9.5.1 بہادر شاہ اور ہمایوں

9.5.2 ہمایوں کی شیر شاہ کے ساتھ جدوجہد

9.6 ہندوستان میں دوسری افغان سلطنت کا قیام

9.7 اکبر اور مغل سلطنت

9.7.1 مغل سلطنت اور بیرم خان

9.7.2 سلطنت کا پھیلاؤ

9.7.3 شمالی اور وسطی ہندوستان

9.7.4 مغربی ہندوستان

9.7.5 گجرات کی فتح

9.7.6 مشرقی ہندوستان

9.7.7 شمالی مغرب کی فتوحات
9.7.8 دکن اور جنوبی ہندوستان
9.8 اکبر کے جانشین اور مغل سلطنت کا پھیلاؤ
9.8.1 شاہجہاں
9.8.2 مغل تخت کی جانشینی کا تنازعہ
9.8.3 اورنگ زیب کے دور اقتدار میں مغل سلطنت
9.8.4 اورنگ زیب کی دکن پالیسی
9.9 اکتسابی نتائج
9.10 کلیدی الفاظ
9.11 نمونہ امتحانی سوالات
9.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
9.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
9.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

9.0 تمہید (Introduction)

موجودہ اکائی کا دائرہ بابر اور ہمایوں کے تحت ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام کے بارے میں ہے۔ مغل سلطنت کو للکارنے اور اُکھاڑ پھینکنے کے لیے افغانوں کی کوشش بھی زیرِ بحث لائی گئی ہے، ساتھ ہی افغان حکمرانی کا ایک مختصر محاسبہ بھی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اکائی بنیادی طور پر بابر، ہمایوں اور اکبر اور اس کے جانشینوں کے دور میں علاقائی توسیع کے متعلق ہے۔ ہمایوں نے 1555ء میں مغل سلطنت کو دوبارہ بحال کیا۔ مگر اکبر کے دور اقتدار میں مغل سلطنت ایک سیاسی حقیقت اور ہندوستانی سیاست کا ایک اہم عنصر بن گئی۔ اکبر کی پالیسیوں کو ان کے جانشینوں نے کچھ تبدیلیوں کے ساتھ یا اپنے دور کے سیاسی ماحول کے مطابق بنایا۔ ایک بڑی سلطنت کی ترقی کے دوران مغل حکمرانوں کو کچھ سیاسی طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا جنہوں نے مختلف خطوں میں اپنا تسلط جمایا ہوا تھا۔ ان میں اہم راجپوت اور جنوبی ہندوستان کے حکمراں تھے جیسے بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر اور مراٹھہ سردار۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان کی سیاسی صورتحال بابر کی آمد پر جانیں گے۔
- لودیوں کے خلاف بابر کی کامیاب مہمات کے بارے میں واقف ہو جائیں گے۔
- مقامی حکمراں تاقتوں جیسے راجپوت اور افغان کے ساتھ مغلوں کی فتوحات اور جدوجہد کے بارے میں جان سکیں گے۔
- شیر شاہ کے ظہور اور استحکام کو سمجھ سکیں گے۔
- ہمایوں او مغل سلطنت کا احیاء کے بارے میں جان سکیں گے۔
- بیرم خان کا اقتدار کیسے ختم ہوا اور اکبر نے ریاست کے معاملات کو کیسے اپنے ہاتھوں میں لیا۔
- اکبر اور اس کے جانشینوں کے تحت مغل سلطنت کی علاقائی توسیع کا جائزہ لے سکیں گے۔

9.2 بابر کے حملے کے وقت ہندوستان کی سیاسی صورتحال

(Political Situation in India at the Time of Babur's Invasion)

پندرہویں صدی کے اوائل میں تغلق خاندان سیاسی بدنظمی سے دوچار تھا۔ دونوں خاندان سید اور لودی اس سیاسی انتشار کو دور کرنے کے لیے مکمل طور پر ناکام رہے۔ دوسری طرف سے امراء موقعے کا فائدہ اُٹھا کر بغاوت پر اُتر آئے۔ اسی طرح سے شمالی ہندوستان کے باقی ریاستوں میں بھی سیاسی صورتحال کافی گھمبیر تھی ں جن میں گجرات، مالوہ اور میوار قابل ذکر ہیں۔

مالوہ میں سلطان محمد قلی دوم کی طاقت کمزور تر ہوتی جارہی تھی۔ اسی دور میں ریاست گجرات مظفر شاہ دوم کے زیر تسلط تھی۔ ایسوڈیہ کے راجا رانا سانگا بر عکس دوسرے بادشاہوں کے زیادہ مضبوط اور طاقتور تھے۔ مالوہ کے حکمراں جو کہ معاشی اور کاروباری لحاظ سے کافی مال دار تھے۔ یہ ریاست تجارتی نقطہ نظر سے گجرات کے بندرگاہوں کے لیے تجارتی رابطے کا ایک بہترین ذریعہ تھی اسی لیے یہ علاقہ لودی خاندان کے لیے کافی اہمیت کا حامل تھا۔ علاوہ ازیں گجرات اور میوار لودی خاندان کے درمیان ایک آہنی دیوار کی مانند حائل تھا۔ مالوہ کے سلطان حکومت کے اہل نہ تھے اور اس کے وزیر مدنی راے اندرونی خلف شعاری کے باعث حکومت کی باگ دوڑ کو زیادہ دیر تک سنبھال نہیں پائے۔ بالآخر رانا سنگھا نے اُن کی کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر مالوہ اور گجرات کو اپنے زیر تسلط کیا۔ پندرہویں صدی کے اوآخر میں رانا سانگا نے رنتھمبور اور چندیری پر قبضہ کر کے لگ بھگ تمام راجپوت ریاستوں پر اپنا سیاسی تسلط قائم کیا۔ اور اگر جنوبی ہندوستان کی طرف غور سے دیکھا جائے تو وہاں دو طاقتور خودمختار ریاستیں وجے نگر اور بہمنی سلطنت اپنے عروج پر تھیں۔ مشرقی ہندوستان میں نصرت شاہ کی حکومت بنگال پر قائم تھی۔ سلطان ابراہیم لودی کے دور حکومت کے آخری ایام میں افغان امراء ناسخ خان لوہانی معروف بہ فامولی وغیرہ نے محمد شاہ کی زیر نگرانی میں جون پور کی ایک الگ ریاست کی بنیاد ڈالی۔ دوسری جانب ان بڑی طاقتوں کے وہاں بے شمار افغان امراء نے آگرہ کے گردونواح میں سیاسی حل چل مچائی تھی جن میں

بہت ہی طاقت ور لوگ میوات میں حسن خان، بیانہ میں ناظم خان، دھول پور میں محمد زیتون، گوالیار میں تارتار خان، رانیری میں حسین خان لوہانی، اٹاوہ میں قطب خان، کالپی میں عالم خان اور سنبھل میں قاسم سنبھلی وغیرہ ہیں۔

اس سیاسی صورتحال کو دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ بابر کی آمد کے وقت راجپوت اتحاد ہندوستان پر اپنا سیاسی نظام قائم کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر بابر سیاسی مداخلت نہ کرتا تو قابل اور جنگجو راجپوت سردار رانا سانگا شمالی ہندوستان پر اپنا قبضہ ضرور جمالیتا۔ بقول مورخین ہندوستان کی علاقائی ریاستیں جو سیاسی طور پر منقسم تھیں اس کی باضابطہ ایک مذہبی بنیاد تھی جو راجپوت اتحاد اور رانا سانگا کی زیر سرپرستی ایک ہندو حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس دلیل کی بنیاد پر بابر اپنی کتاب 'بابر نامہ' میں اس باب کا ذکر کرتے ہیں کہ اُس وقت ہندوستان میں پانچ مسلمان بادشاہتوں کے علاوہ، دو ہندو ریاستیں میواڑ اور وجے نگر بھی موجود تھیں۔ علاوہ ازیں جنگ خانوا کے بعد بابر نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ راجپوت اتحاد، رانا سانگا کی زیر سرپرستی مذہبی جوش وجذبے کے ساتھ مسلم طاقتوں کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے۔

لیکن مورخوں نے اس بات کی تردید کی ہے۔ بابر نے کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے کہ یہ طاقتیں مذہبی بنیاد پر ایک دوسرے کی دشمن تھیں۔ بابر بذات خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ بہت سارے رائے اور رانا اسلام کے فرماں بردار تھے۔ علاوہ ازیں اگر اس اتحاد کی طرف دیکھا جائے تو وہاں بہت سارے مسلم امراء جن میں حسن خان میواتی، محمود خان لودی، وغیرہ جو رانا سانگا کے شانہ بہ شانہ مل کر بابر کے مخالف تھے۔ بلکہ واقعات مشتاقی 1560ء میں حسن خان میواتی پر یہ الزام عائد ہے کہ اُس نے یہ اتحاد قائم کیا تھا۔ تاکہ وہ مغل بادشاہ کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو سکیں۔ بلکہ امر حقیقت یہ ہے کہ رانا سانگا کے بجائے سلطان محمود نے یہ اعلان کیا کہ وہ دلی کا بادشاہ ہے۔ اگرچہ رانا سانگا کی طاقت ناقابل تسخیر تھی اور بابر کی طاقت سے خوفزدہ تھے پس مذہبی نظریہ سے اس کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔

9.3 بابر اور وسطی ایشیا (Babur and Central Asia)

پندرہویں صدی کے آخر میں امیر تیمور خان کی تمام تر طاقتیں زوال پذیر ہو رہی تھیں۔ اُسی زمانے میں ازبکوں (Uzbeks) کے سردار شیبانی خان نے ماورالنہر (Transoxiana) میں اپنے قدم مضبوتی سے جما لیے تھے۔ تقریباً اُسی زمانے کے آس پاس ایران میں صفویوں (Safavids) نے بھی اپنے قدم مضبوط کر لیے تھے۔ اسی اثناء میں عثمانی ترکوں نے مغرب اور مشرق کی طرف فتوحات حاصل کیں۔ کچھ عرصے بعد ایران کے شاہ اسماعیل نے شیبانی خاندان کو 1510ء میں شکست دے دی۔ اس کے بعد 1512ء میں عثمانی سلطان کے ہاتھوں شاہ اسماعیل کو بھی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس طرح ازبگوں کے لیے راستہ ہموار ہو گیا اور وہ ماورالنہر کے حاکم بنے رہے۔

ظہیر الدین محمد بابر نے 1494ء کو 12 سال کی عمر میں فرغانہ (ماورالنہر کا چھوٹا سا علاقہ) کا پایہ تخت سنبھالا۔ منگول اور تیمور شہزادہ جیسے سمرقند کا سلطان احمد مرزا جو بابر کا چچا بھی تھا فرغانہ سے والہانہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اس لیے بابر کے لیے فرغانہ پر تخت نشیں ہونا آسان کام نہ تھا۔ علاوہ ازیں بابر کو اُن امراء کا سامنا تھا جو بابر سے کسی حد تک ناخوش تھے۔ ان سبھی مشکلات کے باوجود بھی بابر نے وسطی ایشیا میں اپنے قدم جمائے اور سمرقند کو دوبارہ 1497ء فتح کیا لیکن سمرقند اس کی تحویل میں زیادہ دیر تک نہ رہ سکا۔ تیموری سلطانوں کا تسلط وسطی ایشیا پر اس قدر

بڑھ گیا جس نے بابر کو مجبور کیا کہ وہ کابل کی طرف رخ کر کے اپنی سیاسی قسمت آزمائی کرے۔ بابر نے وسطی ایشیا سے جو جنگی حکمت عملی سیکھی تھی اُس کا بھرپور استعمال ہندوستان میں کیا۔ کابل کا بادشاہ اُلغ بیگ مرزا 1501ء میں فوت ہوا۔ اُلغ بیگ کی وفات کے بعد بابر نے 1504ء میں کابل پر قبضہ کیا۔ دریں اثنا کابل کو فتح کرنے کے بعد بابر کی دلی خواہش وسطی ایشیا کو بھی اپنے زیر تسلط لانا تھا لیکن ازبکوں کے تسلط کے باعث یہ بابر کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔

وسطی ایشیا کی سیاسی صورتحال نے بابر کو مجبور کیا کہ وہ وسطی ایشیا کا خواب ترک کر کے اپنا دھیان ہندوستان کی طرف مرکوز کرے۔ بقول ابوالفضل ہندوستان کے کثیر وسائل اور افغانستان کی خستہ معاشی حالات نے بابر کو ہندوستان کی جانب پیش قدمی کرنے پر مجبور کیا۔ سکندر لودی کے مرنے کے بعد ہندوستان میں جو سیاسی انتشار پیدا ہوا اُس نے بھی بابر کو ہندوستان آنے پر مائل کیا تھا۔ پنجاب کے گورنر دولت خان لودی اور رانا سانگا کی دعوت پر بابر کا ارادہ مزید پختہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں بابر کے آباؤاجداد نے بھی شمال مشرقی ہندوستان کے علاقوں پر حکومت کی تھی، اس لیے بابر نے اسے اپنی میراث سمجھ کر دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔

9.4 ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی قیام (Foundation of Mughal Rule in India)

پانی پت کے معرکہ سے قبل بابر نے ہندوستان پر چار بار چڑھائی کی۔ ان حملوں سے بابر کی طاقت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ کہ بابر کو جنگوں کی قدرے مہارت حاصل تھی۔ سب سے پہلے بجیرہ 1519-20ء پر چڑھائی کی گئی تھی۔ بعد ازاں سیالکوٹ اور لاہور پر 1520-21 مختصراً ابراہیم لودی اور بابر کی فوجیں پانی پت کے تاریخی میدان میں معرکہ آرا ہوئیں۔ یہ مختصر سی لڑائی لڑ کر بابر نے چند ہی گھنٹوں میں کامیابی اپنے نام درج کی۔ اگرچہ بابر کی فوج کی تعداد قلیل تھی لیکن اُن کا فوجی نظم وضبط قابل ستائش تھا۔ اگرچہ ابراہیم کی فوجیں بابر کی فوج کی نسبت کئی گنا زیادہ تھی (تقریباً ایک لاکھ سپاہی، پانچ سو سے ہزار تا ہاتھی) لیکن بابر کی کم فوجی طاقت کے سامنے ابراہیم لودی کو پھر بھی شکست سے دوچار ہونا پڑا اس کامیابی کی وجہ رومی کا جنگی طریقہ کار تھا۔ جو بابر بڑی مہارت سے چلانے میں کامیاب ہوا۔ افغانی فوج نے دائیں طرف سے باہر کی فوج پر تابڑتوڑ حملے کیے۔ تاکہ افغانی فوج جو بابر کی فوج سے تعداد میں زیادہ تھی۔ جو نہ آگے بڑھ سکے اور نہ پیچھے مڑ سکیں۔ بابر کی فوج نے دونوں اطراف سے ان پر حملے کیے جس کی وجہ سے افغانی فوج میں بھگ دڑ مچ گئی۔ ان حالات کا بابر نے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے سیدھے آگے سے حملہ کر دیا۔ بعد میں بابر کی فوج نے آگ کے گولے برسانے شروع کر دیے جس کی وجہ سے افغانی فوج مفلوج ہو کر رہ گیئں۔ بابر کے بقول تقریباً بیس ہزار افغان فوجیوں سمیت ابراہیم لودی کو بھی موت کی گھاٹ اتارا گیا اس بات کا بابر نے خود تذکرہ کیا ہے کہ یہ توپ خانہ نہیں بلکہ اس کی فوجی حکمت عملی اور تیر اندازی ہے۔ جس نے اس فیصلہ کن معرکے میں اس کے لیے کامیابی کی راہیں ہموار کی۔ پانی پت کی جنگ سے اگرچہ مغل حکومت کی شروعات ہوئی تھی لیکن یہ جنگ آنے والی جنگوں کی آغاز تھا۔ مثال کے طور پر فتح یاب ہونے کے لیے لازمی تھا کہ میواڑ کا رانا سانگا اور دہلی کے گردونواح میں جو فوجی طاقتیں موجود تھیں انہیں اپنے زیر تسلط رکھنا بھی لازمی بن گیا تھا اور مشرقی ہندوستان پر بھی اپنا تسلط جمانا ضروری بن گیا تھا۔ بالآخر اپنے امراء کو بھی راضی رکھنا بابر کے لیے لازمی بن گیا تھا۔

9.4.1 بابراورراجپوت سیاسی طاقتیں (Babur and the Rajput Political Powers)

مذکورہ سطور میں یہ بات زیر بحث لائی گئی تھی کہ راجپوت سلطنت کے راجا رانا سانگاایک طاقت ور حکمراں گزرے ہیں۔ بابر نے اپنی کتاب میں راناسانگاپر یہ الزام عائد کیا ہے کہ جو جنگ ابراہیم لودی کے خلاف لڑی جاچکی تھی۔ راناسانگانے بابر کا ساتھ نہ دیتے ہوئے بابر کے ساتھ کیے گئے وعدے کی خلاف ورزی کی۔ ان اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر یہ صاف ظاہر ہے کہ دونوں بابر اور راناسانگاابراہیم لودی کو شکست دینا چاہتے تھے۔ لیکن راناسانگانے آگے آنے کے لیے ہچکچاہٹ دکھائی۔ رانا سنگھا کی اُمیدوں پر اُس وقت پانی پھیر گیا جب بابر نے ہندوستان میں اپنی سیاسی کشمکش کو جاری رکھا۔ کیوں کہ راناسانگا یہ اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ ابراہیم لودی کو شکست دینے کے بعد وبابر ہندوستان سے اپنے وطن کی طرف رخ کرے گا تاکہ وہ اس کی عدم موجودگی میں ہندوستان پر اپنا سیاسی تسلط قائم کریں۔ بابر اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ ہندوستان میں اپنا سیاسی تسلط برقرار رکھنے کے لیے راناسانگا کو شکست دینا لازمی بن گیا تھا۔ دریں اثناء راناسانگانے بابر کے خلاف جس سیاسی اتحاد کا اطلاق کیا تھا۔ اُس میں بہت سارے افغان امراء نے راناسانگا کے اتحاد کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ حسن خان میواتی نے اس اتحاد میں ایک کلیدی رول ادا کیا۔ بہار کا حسن خان اور حُسین خان نے بھی اس اتحاد میں شمولیت اختیار کی علاوہ ازیں عبدالعزیز کی ہار جو بابر کا فوجی کمانڈر تھا اور راجپوت فوجیوں کی شجاعت ودلیری نے بابر کی فوجی طاقت کو پست کیا۔ فرشتہ اور بدایونی اکبر کے ہمعصروں نے اس بات کا انکشاف ظاہر کیا ہے کہ بابر کی فوجیوں پر اس قدر خوف ودہشت طاری ہوئی تھی کہ امراء نے بابر کو یہ مشورہ دیا کہ وہ پنجاب جاکر حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیں ۔تاہم بابر نامہ میں اس بات کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا مگر فوجیوں پر خوف ودشت قدرے طاری تھا۔ البتہ بابر نے ایک مذہبی تقریر سے اپنے فوجیوں کے حوصلے بلند کیے بابر نے سیکری کے متصل کھنواہ گاؤں میں اپنے فوجیوں کو پھر سے مستحکم کیا۔ یہاں بھی بابر نے رومی جنگی حکمت عملی اختیار کی۔ اس وقت اس نے اپنے بائیں جانب توپ کا سہارا لیا۔ اور اپنے دائیں جانب فوجی بیل گاڑیوں کا بھرپور استعمال کیا۔ لیکن یہ گاڑیاں لوہے کے زنجیروں سے بندھی ہوئی تھیں ۔ معرکہ کے وقت اس نے مضبوط لکڑی کے سٹول رسیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے باندھ دیے تھے۔ اس سے نہ صرف اس کے فوجیوں کی نقل وحمل میں رکاوٹ پیدا کی بلکہ اس کا جنگی اسلحہ بھی محفوظ رہا۔ استاد مصطفی اور استاد علی کے زیر سرپرستی میں اس لائحہ عمل کو تیار کرنے میں لگ بھگ بیس سے بائیس دن کا وقفہ لگا تھا۔ 17 مارچ 1527ء کو جنگ کھنواہ میں بابر نے اپنے توپ خانے کا بھرپور استعمال کیا اس جنگ میں راناسانگا شدید زخمی ہونے کے بعد امبر پہنچائے گئے۔ اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے اور بہت سارے جنگ کی نوعیت دیکھ کر بھاگ گئے۔ راناسانگانے بابر کو جو وقت فراہم کیا تھا بابر نے اس موقعے کا بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ مختصر یہ کہ اس جنگ میں راناسانگا کی شکست کی وجہ بابر کا فوجی نظم وضبط متحرک ہوا۔ گھوڑسواری اور توپ خانہ وغیرہ نے اس جنگ میں فیصلہ کن مرحلہ اختیار کیا۔ راناسانگا کے بعد مدنی رائے نے قوت مدافعت کا مظاہرہ کیا۔ مگر 1528 میں مدنی رائے کو بھی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس طرح سے راجپوت طاقتیں استعماری ذوق کا شکار ہوگئیں۔

9.4.2 بابراورافغانی سردار (Babur and the Afghan Chiefs)

افغانوں نے اگرچہ دہلی پر قبضہ جمانے کے ارادے ترک کردیے تاہم مشرقی ہندوستان (بہار اور جونپور) میں جہاں سلطان محمد لوہانی

کے زیر سرپرستی میں نوحانی افغان بر سرپیکار تھیں۔تاہم چونار، جون پور اور اودھ کے افغانیون نے نوہانیوں کے ساتھ تعاون کرنے سے گریز کیا۔ بر عکس اس کے انہوں نے 1527ء میں بے حد آسانی کے ساتھ ہمایوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔اسی اثناء میں سلطان محمد لوہانی کی وفات 1528ء سے نوہانی طاقت کمزور پڑی۔ سلطان سکندر کے بیٹے اور ابراھیم کے بھائی شہزادے محمد لودی نے محمد نوہانی کی وفات کے بعد اس خلا کو پُر کیا۔ محمد لودی کے زیر سرپرستی میں بتدریج دیگر افغانوں نے ایک نیا اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ جن میں بابن، بایزید، فتح خان سروانی اور بنگال کے نصرت شاہ بھی شامل ہیں۔

بابر ان حالات و واقعات کو دیکھ کر آرام سے نہیں رہ سکتا تھا۔اس نے اپنے فوجیوں کو متحرک کیا اور نصرت شاہ کو گھاگرہ میں 1529ءایک بڑی شکست سے دوچار کیا۔اس طرح سے افغانوں کے حوصلے پست ہوگئے،اگرچہ بابن اور بایزید نے مذاہمت کا راستہ اختیار کیا تھا۔ لیکن اُن کی یہ کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ بابر نے لگ بھگ چار سالوں میں بڑی سے بڑی طاقتوں کو زیر کیا اور اس طرح سے بابر نے دہلی میں باضابطہ ایک سلطنت کی ساکھ قائم کی مگر زندگی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ بالآخر بابر 29دسمبر 1530ء کو اس دنیا سے رحلت کر گئے۔

مغل سلطنت کی بنیاد جو بابر کے زیر سرپرستی میں پڑی۔ وہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اگرچہ افغانوں اور راجپوتوں کی طاقت کو مکمل طور پر دبایا نہیں گیا تھا۔ تاہم پانی پت اور کھنوہ کی معرکہ آرائی کے بعد ملکی سطح پر ایک بڑی سلطنت قائم کرنے کا ایک حوصلہ مند قدم تھا۔ جس کو فقط بابر کے جانشین ہی پورا کر سکتے تھے۔

9.5 ہمایوں (Humayun)

بابر کی وفات کے بعد ہمایوں (1531-1540) تیئیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ مگر ہمایوں کو کافی درپیش مشکلات کا سامنا تھا۔ جن میں سے کئی مسائل کو بابر نے خود ہی جنم دیا۔اور کچھ مسائل اُن کی وفات کے بعد ابھر کر سامنے آئے۔اُن مشکلات میں غیر مستحکم انتظامیہ، ہمایوں کے عزیز واقارب کا مخالفانہ رویہ، معاشی وسائل کی کمی، افغانوں کا دشمنانہ رویہ، ہمایوں کے بھائیوں کا وفادار نہ ہونا وغیرہ شامل ہیں۔ اپنی ساخت کو برقرار رکھنے کے لیے ہمایوں کو مشرقی اور مغربی ہندوستان کے افغانوں کو اپنے زیر تسلط کرنا لازمی تھا۔ سب سے پہلے انہوں نے مغربی افغانوں کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی۔

9.5.1 بہادر شاہ اور ہمایوں (Bahadur Shah and Humayun)

ہمایوں اور بہادر شاہ کے جو آپسی مراسم تھے۔ وہ حالات و واقعات کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ شروعات میں (جنوری 1531 سے 1533 وسط) میں بہادر شاہ نے ہمایوں کے ساتھ مخلصانہ رویہ اختیار کیا۔ اسی اثنا میں اس نے یہ بھی سعی کی کہ اُس نے اپنا اثر رسوخ مغل سرحدوں تک استوار کیا۔ مثال کے طور پر ریاست مالوہ پر اس کی نظریں جمی رہی۔ جو تجارتی اور زرخیزت کے لحاظ سے کافی اہمیت کی حامل تھی۔ مختصراً جنوری 1531ء میں انہوں نے مالوہ پر اپنا تسلط قائم کیا۔ ساتھ ہی میں بہادر شاہ نے ہمایوں کے مشرقی ہندوستان کے حریفوں کے ساتھ معاہدے کیے۔ جن میں شیر شاہ اور بنگال کے نصرت شاہ قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں شمالی اور مشرقی ہندوستان کے بہت سے متنفر افغانوں

نے بھی بہادر شاہ کا ساتھ دیا۔اتنا ہی نہیں سلطان علاؤالدین لودی، بہلول لودی اور اس کے بیٹے فتح خان اور تاتار خان، گاوالیار کا رائے نار سنگھ اور کالپی کا عالم خان لودی بھی بہادر شاہ کے درپردہ مددگار ثابت ہوئے۔

ہمایوں ان سبھی واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے دریں اثنا بہادر شاہ نے بل سا، راے سین، اُجین اور گاگران پر اپنا تسلط قائم کیا۔اس وقت ہمایوں چنار پر چڑھائی کر رہا تھا۔ لیکن بہادر شاہ کی ان حرکات کی وجہ سے ہمایوں کو آگرہ لوٹ آنا پڑا۔ مگر بہادر شاہ مغلوں سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بہادر شاہ نے فوراً خراسان خان کو سفیر بنا کر ہمایوں کے پاس بھیجا۔اور ہمایوں نے اس چیز کا مطالبہ کیا۔ کہ اس کے دشمنوں کو بالخصوص محمد زماں مرزا کو پناہ نہ دی جائے۔اور ساتھ ہی ہمایوں نے اس بات کو تسلیم کیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمایوں نے گجرات پر 1530ء میں حملہ کیا۔ جس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ جنوری 1524ء میں بہادر شاہ نے محمد زماں مرزا کو پناہ دینے کے ساتھ ساتھ چتوڑ کو بھی اپنی طاقت کا نشانہ بنایا تھا۔ چتوڑ بہادر شاہ کے لیے کافی اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ اس سے اس کی سلطنت کا پھیلاؤ اجمیر، ناگور اور رنتھمبور کی طرف ہوتا۔ مگر ہمایوں کی طرف سے بہادر شاہ کو چتوڑ بچانے کے لیے کوشش نہیں کی گئی۔ کیونکہ ہمایوں کے چتوڑ پہنچنے تک کافی عرصہ لگا۔اسی اثناہ میں ہمایوں مانڈو پہنچا جو کہ چتوڑ سے گجرات بھاگنے کا ایک خاص راستہ تھا اس طرح سے بہادر شاہ کے فوجی خیموں کو چاروں اطراف سے گھیرا گیا۔اور آنے والی کمک کو بھی روکا گیا۔ایک مہینے تک بہادر شاہ کی فوج لڑتی رہی۔ بالآخر بہادر شاہ مانڈو سے چمپانیر، احمد آباد، کامبے اور کاٹھیاوار سے ڈیو پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔اگرچہ مغلوں نے ان کا پیچھا کیا۔تاہم بہادر شاہ اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہوا۔اس طرح سے ہمایوں نے آگرہ کی طرف رخ کرنے سے پہلے مرزا عسکری کو مانڈو کا حکومتی نظام سنبھالنے کو کہا مگر مرزا عسکری کی نااہلی کی وجہ سے وہاں کا انتظامیہ درہم برہم ہو گیا۔ جس کا بہادر شاہ نے فائدہ اُٹھا کر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو پھر سے بحال کیا۔ مگر 17 فروری 1537ء میں بہادر شاہ کو پرتگالیوں کے ہاتھوں موت کی گھاٹ اتارا گیا۔اس طرح سے ہمایوں کو مشرقی ہندوستان کی طرف رخ کرنا پڑا۔

9.5.2 ہمایوں کی شیر شاہ کے ساتھ جدوجہد (Humayun's Conflict with Sher Shah)

گجرات کی واپسی پر ہمایوں نے اپنی توجہ مشرقی ہندوستان پر مرکوز کی۔ جہاں پر شیر شاہ اپنے قدم جمانا چاہتا تھا۔ ہمایوں گجرات کے مسئلے میں اس قدر مصروف رہا اور اس طرح شیر شاہ نے اُس کی عدم موجودگی میں مشرقی ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں کی۔اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے شیر شاہ کو بنگال کے بادشاہ اور افغانی امراء کو اپنے قابو میں کرنا لازمی بن گیا تھا۔ شیر شاہ کو بنگال کے حکمرانوں سے دو حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا پڑا۔ پہلا حملہ 1532ء سلطان نصرت شاہ کے دور اقتدار میں ہوا۔ دوم ابراہیم خان کی زیرپرستی سلطان محمد شاہ کے دور حکومت 1534ء میں انجام دیا گیا۔ مگر بنگالی فوج کو دونوں مرتبہ شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ شیر شاہ کی ان فتوحات سے بنگال فوج کی کمزوریاں نمایاں ہوئیں اور اس طرح سے شیر شاہ کی ناموری میں مزید اضافہ ہوا۔ دوسری جانب مشرقی افغانوں نے جو شیر شاہ سے باغی ہو گئے تھے وہ پھر سے اس کے پرچم تلے آ گئے۔اور بہادر شاہ کی وفات کے بعد اُن کے پاس یہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ جہاں سے وہ مغلوں کے

خلاف لڑ سکتے تھے۔ شیر شاہ اپنے آپ کو مسلم قائد کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔1530ء میں شیر شاہ نے بنگالی فوج کو سورج گڑھ میں شکست دی۔ نتیجتاً بنگال کے سلطان محمد شاہ شیر شاہ کو جنگی ہاتھی اور معاشی معاونت دینے پر راضی ہو گئے۔ یہ بڑی کامیابی اور مغل مشرقی علاقوں پر حملے نے ہمایوں کو خبر دار کیا۔اور انہوں نے ایک ہندو بیگ کو جون پور کا گورنر بنا کر بھیجا۔تا کہ وہ مشرقی علاقوں کے حالات و واقعات پر پوری نگاہ رکھیں۔ مگر شیر شاہ نے بڑی ہی چالاکی سے ہندو بیگ کو ہمایوں کی وفا شعاری کا یقین دلایا۔اور دوسری طرف سے اپنی فوج کو مضبوط اور مستحکم کیا۔تا کہ وہ مغلوں پر دوبارہ چڑھائی کرے۔جب کہ اس کی تیاریاں مکمل ہوئیں۔تو اس نے ہندو بیگ کو دھمکی آمیز خط بھیجا۔ساتھ ہی میں شیر شاہ نے بنگال پر 1537ء یلغار کی۔ہندو بیگ کو شیر شاہ کا یہ رویہ پسند نہ آیا۔اور اس نے ہمایوں کو شیر شاہ کی ان حرکات سے آگاہ کیا۔کچھ افغانی امراء نے ہمایوں کو یہ مشورہ دیا کہ چنار بچائیں۔جس کو ہمایوں نے مان لیا۔مورخین کے مطابق ہمایوں کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔جس سے ہمایوں کو سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا۔اس طرح سے شیر شاہ نے موقع کا فائدہ اُٹھا کر گور کو جو اس وقت بنگال کی راجدھانی تھی اپریل 1537ء میں اپنے قبضے میں کر لیا۔

اس وقت ہمایوں نے شیر شاہ کو بنگال اور روہتاس گڑھ سونپنے کو کہا۔مگر شیر شاہ نے ہمایوں کی بات کو مسترد کیا۔اب ہمایوں نے شیر شاہ کی طاقت کو قابو کرنا چاہا۔اگرچہ وہ بنگال کی سیاسی صورتحال سے کنارہ کش ہونا چاہتا تھا۔مگر شیر شاہ نے ہمایوں کو بنگال کی سیاست میں مطمئن کر دیا۔ستمبر 1537ء میں ہمایوں بنگال پہنچے۔

ہمایوں بنگال میں تقریباً چار مہینے رہا تا کہ وہاں کی خستہ صورتحال کو سنبھالے۔دریں اثناء شیر شاہ نے آگرہ سے بنگال تک کے تمام آنے جانے والے راستوں کو اپنے قابو میں کر لیا۔ہمایوں کی مشکلات میں اُس وقت مزید اضافہ ہوا جب ہندال مرزا نے بادشاہت کا اعلان کیا۔ہمایوں فوراً چنار پہنچا۔اور مارچ 1539ء میں چوسا پہنچے۔دریائے کرم ناسا پر انہوں نے خیمے قائم کیے۔ہمایوں نے اُس وقت بہت بری غلطی کی۔جب اس نے دریا کو پار کر کے اپنی فوجی طاقت کا غیر ضروری مظاہرہ کیا۔شیر شاہ یہ جانتے ہوئے کہ ہمایوں کا اسلحہ ختم ہونے والا تھا۔اسی اثنا میں انہوں نے مغل فوجیوں پر حملہ کر دیا۔اور بڑی تعداد میں مغل فوجیوں کو مار گرایا۔اس حملے میں ہمایوں نے اپنی جان کو بچاتے ہوئے آگرہ میں دم سنبھالا۔اس سے شیر شاہ کے حوصلے مزید پختہ ہو گئے۔ہمایوں اور شیر شاہ کی دوسری بڑی جنگ قنوج میں 1540ء میں ہوئی۔جس میں ہمایوں کو دوسری بار شکست سے دوچار ہونا پڑا۔اور اس جنگ سے دوسری افغان سلطنت کی بنیاد پڑی۔جن وجوہات کی بنا پر ہمایوں کی شکست کے اسباب منظر عام پر آئیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

- ہمایوں کے بھائیوں کا مخالفانہ رویہ اور ہمایوں کی رحم دلی۔
- ہمایوں کو جہاں مستعد رہنا چاہئے تھا وہاں اس نے سستی کا مظاہرہ کیا۔
- بنگال کی سیاست میں ہمایوں کا غیر ضروری الجھنا جس سے شیر شاہ نے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو مضبوط کیا۔
- ہمایوں کا مالی بحران کا شکار ہونا۔
- شیر شاہ کی ہمت، تجربہ، فوجی نظم وضبط،اور باقی خصوصیات جن کا ہمایوں عادی نہیں تھا۔

9.6 ہندوستان میں دوسری افغان سلطنت کا قیام

(Establishment of the Second Afghan Empire in India)

مغل بادشاہ کو شکست دینے کے بعد شیر شاہ نے خود کو بادشاہ قرار دیا۔اور اس طرح سے دوسری افغانی سلطنت پر حکومت کی ابتدا کی۔یہ سلطنت جس نے پندرہ سال (1540تا1555)ءتک حکومت کی ذمہ داری سنبھالی۔یہ مغل اقتدار کی تاریخ میں ایک چھوٹا سا وقفہ تھا۔مگر سیاسی اور انتظامی لحاظ سے یہ وقفہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔شیر شاہ اپنے پانچ سالہ دورِ اقتدار (1540تا1545)ء میں زیادہ تر جنگوں میں مصروف رہا۔سب سے پہلے شیر شاہ کو شمال مغرب کی سرحد پر گاہ کازِر کا سامنا تھا۔جنھوں نے شیر شاہ کے لیے بہت سارے مشکلات کھڑے کیے۔پنجاب کے گورنر خضر خان نے بھی خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔اس لیے 1541ء میں شیر شاہ نے اس پر حملہ کیا۔مالوہ میں قادر شاہ کو بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔گوالیار جو عبدالقاسم کے زیر تسلط تھا۔اس کو بھی شیر شاہ نے اپنے قبضے میں کیا۔راجپوتوں کو اپنے قابو میں لانے کے لیے شیر شاہ نے 1543ء میں رائے سین پر حملہ کیا۔جو راجہ پران مل کے زیر تسلط تھا۔

1543 میں ہی ملتان کو بھی اپنے تسلط میں لایا۔اجمیر، پالی، ناگور، بیکانیر اور چتوڑ کو بھی 1544ء میں شیر شاہ نے اپنے زیر تسلط کیا۔ بالآخر کالنجار قلعہ کو فتح کرتے کرتے شیر شاہ بری طرح زخمی ہوا اور 22 مئی 1545ء کو شیر شاہ ابدی نیند سو گئے۔شیر شاہ کا جانشین اسلام شاہ (1545تا53ء) اندرونی سازشوں میں مصروف رہا۔عادل شاہ 1553ء میں اسلام شاہ کے بعد تخت نشین ہوا۔اس کے دور حکومت میں بغاوتوں اور سرکشیوں نے سلطنت کی جڑیں کمزور کر دیں۔اور اس طرح سے ہمایوں کو دوبارہ تخت حاصل کرنے میں آسانی ہو گی۔

9.7 اکبر اور مغل سلطنت (Akbar and the Mughal Empire)

سور خاندان کی خانہ جنگی نے ہمایوں کو دوبارہ موقعہ فراہم کیا کہ وہ مغل حکومت کو از سر نو تشکیل دے۔اس سے قبل ہمایوں مغل حکومت کو مزید وسعت دیتا لیکن اس کی زندگی نے وفانہ کی۔بالآخر ہمایوں 1556ء میں ابدی نیند سو گیا۔اور سلطنت اپنے کمسن بیٹے جلال الدین اکبر کو سپرد کیا۔اکبر کی ولادت 1542ء میں امر کوٹ میں ہوئی۔ہمایوں کی غیر موجودگی میں اکبر کی دیکھ بال اس کے چچانے کی۔ہمایوں کی اچانک وفات کے بعد اکبر کی تاج پوشی کلانور میں 1556ء میں ہوئی۔اکبر اس وقت تخت نشین ہوا۔جب چاروں اطراف سے ان کے حریف مغل حکومت کو ختم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

9.7.1 مغل حکومت اور بیرم خان (Mughal Government and Bairam Khan)

اکبر کی کم سنی میں مغل نظام کو بیرم خان جو ہمایوں کا ایک قریبی امیر تھا،اس نے مغل نظام کو 1556-60ء تک سنبھالا بیرم خان کی سب سے بڑی فتح پانی پت کی دوسری جنگ تھی۔15 نومبر 1556ء میں بیرم خان نے ہیمو کو شکست دی اور اس طرح سے افغانی طاقت کو بہت بڑا دھچکا لگا۔اسی مدت میں بیرم خان نے مغل حکومت کے تمام کاموں کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔اسی اثنا میں اس کو وکیلِ سلطنت کے عہدے پر فائز کیا گیا۔دریں اثنا بیرم خان نے پسندیدہ امراء کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا جس سے باقی ماندہ امراء بیرم خان کے مخالف ہو

گئیں۔ بیرم خان اس قدر خود مختار بنے جس سے نہ صرف امراء بلکہ اکبر بھی ناراض ہوا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اکبر نے بیرم خان کو اپنی گرفت میں لانے کی سعی کی۔ نتیجتاً بیرم خان مغل حکومت کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ مگر اکبر بیرم خان کو انکے عہدے سے ہٹانے میں کامیاب ہوئے۔ بعد میں اس کی غلطیوں کی تلافی ہوئی۔ بالاخر بیرم خان کو مکہ روانہ کیا گیا۔ لیکن راستے میں بیرم خان کو قتل کر دیا۔

9.7.2 مغل حکومت کی وسعت (Extent of Mughal Empire)

ابتدائی مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد مغل بادشاہ اکبر نے مغل حکومت کو وسعتیں دینے کی کامیاب کوششیں کیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہو سکیں۔ اس وقت کی مشہور سیاسی طاقتوں میں راجپوت، گجرات، بنگال اور بہار میں افغانی، دکن اور جنوبی ہندوستان میں خاندیش، احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ، وغیرہ ریاستیں تھیں۔ شمالی مغربی ہندوستان میں کچھ قبائلوں نے اپنا تسلط جمار کھا تھا۔ یہ ایک امر حقیقت ہے کہ اکبر کے دور حکومت میں مغل حکومت کے سیاسی وسعتیں سب سے زیادہ بڑنے لگیں۔ جہاں تک اکبر کے جانشینوں (جہانگیر، شاہجہاں، اور اورنگ زیب) کا سوال تھا۔ انہوں نے مغل سلطنت کی سرحدوں کو اتنی وسعت نہیں دی۔ جتنی کہ اکبر نے دی تھی۔ اورنگ زیب کے دور حکومت میں جنوبی ہندوستان اور شمالی مشرقی (آسام) تک ہندوستان کی سرحدیں استوار ہوئیں۔

9.7.3 شمالی اور وسطی ہندوستان (North and Central India)

پہلا معرکہ گوالیار اور جون پور (1559 تا 60) ء میں ہوا۔ رام شاہ کے ساتھ ایک مختصر سی جنگ میں گوالیار قلعے پر قبضہ کیا گیا۔ جونپور کے حکمراں کو بھی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح سے جونپور بھی مغل حکومت کے قبضہ میں چلا گیا۔ ادہم خان کی سرپرستی میں وسطی ہندوستان کی ریاست مالوہ جس پر باز بہادر کا تسلط تھا کو بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ 1564ء میں گونڈوانہ کی ریاست جو رانی درگاوتی کی زیر تسلط تھی کو بھی فتح کیا گیا۔ دریں اثنا اکبر کو وسطی ہندوستان میں بہت ساری بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اکبر نے منیب خان کی مدد سے ہونے والی بغاوتوں پر قابو پالیا۔

9.7.4 مغربی ہندوستان (Western India)

راجپوت ریاستوں کو حاصل کرنے کے لیے اکبر نے جنگ اور حکمت عملی سے کام لیا۔ آمیر کے راجہ بھارمل نے امن کے ساتھ اکبر کی حکومت کو تسلیم کیا۔ رانا پرتاپ ہی اکلوتا راجپوت راجا تھا جس نے مغلوں کی بالادستی کو چنوتی دی۔ 1576ء میں رانا پرتاپ اور مغل فوج کے مابین ہلدی گھاٹی کے مقام پر جنگ ہوئی۔ اگرچہ اس جنگ میں رانا پرتاپ کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مگر انہوں نے شجاعت و دلیری کا مظاہرہ کیا اور مغلوں کو دیرپا چلینج دیا۔ 1569ء میں راجا سُر جان رائے کی ریاست رنتھمبور کو فتح کر کے مغل سلطنت کا حصہ بنادیا گیا۔ اسی سال میں کلنجار کو بھی بآسانی مغل سلطنت نے اپنے زیر تسلط کر لیا۔ ماروار، جودپور، بکانیر اور جیسلمیر بھی مغل سلطنت کی گرفت میں چلا گیا۔

9.7.5 گجرات کی فتح (Conquest of Gujarat)

وسطی ہندوستان اور راجستان میں اپنے آپ کو مستحکم کرنے کے بعد اکبر نے گجرات ریاست کی طرف اپنی نگاہیں مرکوز کی۔ گجرات جو

کہ ذرخیزیت اور تجارتی اعتبار سے کافی اہمیت کی حامل سلطان مظفر شاہ سوم کے زیر انتظام تھی۔ شہنشاہ اکبر نے 1572ء میں احمد آباد کی طرف اپنی پیش رفت کی۔ کچھ مدت کے بعد اس ریاست کو اپنے قبضے میں کر کے مرزا عزیز کو ریاست کا گورنر مقرر کیا۔ مگر چھ ماہ کی مدت میں بغاوت کے عناصر منظر عام پر آئے۔ یہ خبر سن کر اکبر نے دوبارہ گجرات کی طرف پیش قدمی کی اور بغاوت کرنے والے افراد کو اپنے قابو میں کیا۔ اس طرح سے گجرات کی ریاست دوبارہ مغل سلطنت کی اقتدار میں آئی۔

9.7.6 مشرقی ہندوستان (Eastern India)

بہار کے گورنر سلیمان کرانی نے 1564ء میں بنگال کو اپنے قبضہ میں کیا سلیمان اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ وہ شہنشاہ اکبر کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس لیے انہوں نے اکبر کو اپنا حاکم تسلیم کیا تاہم 1572ء میں ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے داؤد نے مغلوں کی بادشاہت سے انکار کر دیا۔ داؤود کو اپنے قابو میں لانے کے لیے اکبر نے 1574ء میں بنگال اور بہار پر حملے کیے۔ آخر کار 1576ء میں ریاست بنگال مکمل طور پر مغلوں کے زیر تسلط چلی گئی۔

9.7.7 شمالی مغرب کی فتوحات (Conquests of the North-West)

شمالی اور مغربی ہندوستان میں اکبر کو سب سے بڑا مسئلہ روشنائی تحریک کا تھا۔ اس کی بیخ کنی کرنے کے لیے اکبر نے ٹوڈر مل اور راجا مان سنگھ کو بھیجا جو کامیاب ہوئے۔ کشمیر کی جاذبیت اور دلکشی نے اکبر کو پہلے ہی اپنی طرف متوجہ کیا تھا راجا بھگوان داس اور شاہ قلی مرحوم کی زیر سرپرستی میں فوج لے کر یوسف شاہ چک کو شکست سے دوچار کر کے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اگرچہ یوسف شاہ کے بیٹے یعقوب نے کچھ امراء د کے ساتھ مل کر مغلوں کے خلاف سازشیں کیں۔ تاہم وہ ناکام رہے اور 1586ء میں کشمیر مغل حکومت کا ایک صوبہ بن گیا۔ 1590ء میں سندھ کے ایک خود مختار علاقہ ٹھاٹاہ پر بھی قبضہ کیا گیا۔ مختصر 1595ء میں شمال مغرب پر مغل حکومت کا بھرپور تسلط ہوا۔

9.7.8 دکن اور جنوبی ہندوستان (Deccan and South India)

1590ء کے بعد اکبر نے اپنے سفارت کاروں کو جنوبی ہندوستان کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ اکبر کی حکومت کی اطاعت کریں مگر جنوبی ہندوستان کی ریاستیں جیسے خاندیش، احمد نگر، بیجاپور، اور گولکنڈہ نے ان سفیروں کی مانگ کو مسترد کیا۔ اس طرح سے 1595ء میں مغل فوجیوں نے احمد نگر پر حملہ کر دیا۔ احمد نگر کے بعد باقی ماندہ ریاستوں نے بھی مجبوراً مغل حکومت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔

9.8 اکبر کے جانشین اور مغل سلطنت کی توسیع

(Successors of Akbar, and Expansion of Mughal Rule)

جیسا کہ ہم نے پہلے ہی اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ اکبر کے عہد حکومت میں مغل حکومت کی سرحدیں اپنے عروج پر تھیں۔ اکبر کے جانشینوں میں جہانگیر، شاہجہاں اور بالخصوص اورنگ زیب نے مغل حکومت کو کسی حد تک وسعت دی۔

اکبر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر 1605ء میں تخت نشیں ہوا۔ 1606ء میں ان کے بیٹے خسرو نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کر دی مگر جہانگیر اس بغاوت کو کچلنے میں کامیاب ہوا۔ 1611ء میں جہانگیر نے مہر النساء سے شادی کی جو بعد میں نور جہاں کے نام سے موسوم ہوئی۔ کچھ مورخوں کے مطابق نور جہاں نے ایک الگ گروہ بنایا تھا۔ جس کا نام نور جہاں جنٹا (Jaunta) تھا۔ جو مغل حکومت کے سیاسی معاملات پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اور نور جہاں نے جہانگیر کو نظر انداز کر کے سیاسی معاملات کو آگے بڑھایا۔ اس طرح سے مغل حکومتسے باقی ماندہ امراء بغاوت پر اتر آئے۔ جہانگیر اپنی سیاسی سرگرمی میں میواڑ کے ساتھ پہلے جنگ شروع کی لیکن بعد میں امر سنگھ کے ساتھ معاہدہ ہوا ۔ بعد ازاں جہانگیر کی نگاہیں جنوبی ہندوستان پر جمی رہیں۔ جہانگیر کے دور حکومت میں بھی ان ریاستوں پر مغل حکومت کا تسلط پوری طرح قائم نہ رہ سکا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہیں کہ قندہار کی ریاست جہانگیر کے دور حکومت میں ہی مغل حکومت کی گرفت سے نکل گئی۔

9.8.1 شاہجہاں (Shahjahan)

فروری 1627ء میں شاہجہاں کی تاج پوشی آگرہ میں ہوئی۔ شاہجہاں کے دور حکومت کے پہلے تین سالوں میں جھجھار سنگھ بندیلہ نے بندیل کھنڈ میں مغلوں کے خلاف بغاوت کی۔ جس کو مغل فوج نے اورنگ زیب کی سرپرستی میں شکست۔ دوسری جانب خان جہاں لودی نے دکن میں بغاوت شروع کر دی۔ جس کو شاہجہاں نے فوری طور پر قابو کر لیا۔ شاہجہاں کے دور حکومت میں ہی دکنی ریاستوں جیسے احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ نے دوبارہ مغل سلطنت کو چیلینج کیا۔ تاہم شاہجہاں نے ان ریاستوں کے ساتھ کچھ معاہدے کئیں۔ جس سے کچھ مدت تک امن وامان قائم رہا۔ دکنی مہم کے بعد شاہجہاں نے اپنا رخ قندہار اور بلخ کی جانب کیا۔ قندہار پر 1638ء میں قبضہ کر لیا۔ مگر بدخشاں اور بلخ تین مسلسل حملوں کے باوجود بھی مغل فوج کی گرفت میں نہ آسکے۔

9.8.2 مغل تخت کی جانشینی کا تنازعہ (Conflict for Succession to the Mughal Throne)

شاہجہاں کے آخری دور میں مغل حکومت خانہ جنگی کی شکار ہوگئی۔ کیونکہ مغل حکومت میں جانشینی کا کوئی خاص قائدہ یا قانون نہ تھا۔ اس وقت شاہ جہاں کے چار بیٹے مختلف صوبوں کے بحیثیت گورنر تعینات تھیں۔ داراجو شاہجہاں کا بڑا بیٹا تھا اس کو پنجاب اور ملتان کا گورنر بنایا گیا تھا۔ شجاع کو بنگال کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اورنگ زیب دکن کا صوبیدار تھا۔ اور مراد گجرات میں بحیثیت گورنر مامور تھا۔ جوں ہی شہزادوں کو شاہجہاں کی علالت کا علم ہوا۔ تو وہ پوری جنگی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ حالاں کہ شاہجہاں نے دارا کو ہی تخت نشینی کے لیے نامزد کیا تھا۔ سب سے پہلے شجاع نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔ اور آگرہ کی طرف اپنی پیش قدمی کی۔ مگر دارا نے بر وقت کاروائی کر کے شجاع کو بہادر گڑ (بنارس) میں شکست دی۔ دوسری طرف اورنگ زیب نے مراد کو اپنے ساتھ ملا کر یہ لالچ دیا کہ وہ حکومت کو حاصل کرنے کے بعد اُن کو برابر کا شریک رکھے گا۔ اس طرح سے وہ آگرہ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے دھرمات میں اپریل 1658ء میں شاہی فوج کے ساتھ مد مقابل ہوئے۔ جس میں شاہی فوجیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دھرمات کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے آگرہ کی طرف پیش قدمی کی اور مئی 1658ء کو سموگڑھ میں دارا کو شکست دی۔ اور آگرہ کے قلعے کو اپنے قبضہ میں لے کر اپنے والد شاہجہاں کو نظر بند کیا۔ بعد ازاں اورنگ زیب نے مراد کو فریب دے کر جیل خانے میں ڈال دیا۔ اگرچہ اس کے ساتھ حکومت کو بانٹنے کا عہد وپیمان کیا گیا تھا۔ لیکن دو سال بعد اس کو بھی

جیل خانے میں موت کی نیند سلا دیا گیا۔ 21 جولائی 1658ء کو اورنگ زیب نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ دسمبر 1658ء میں شجاع کو بھی اورنگ زیب کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ مارچ 1659ء دیورائے اجمیر کے متصل اورنگ زیب اور دارا کے مابین آخری جنگ میں دارا کو شکست ہوئی۔ اور بعد میں اورنگ زیب نے دارا کو پکڑ کر قید کرکے اس کو دہلی لے جا کر قتل کر دیا۔

9.8.3 اورنگ زیب کے دور میں مغل سلطنت (Mughal Empire under Aurangzeb)

اورنگ زیب نے لگ بھگ پچاس سال تک مغل حکومت کا دور اقتدار سنبھالا۔ ان کے دور میں مغل حکومت کی سرحدیں اپنے عروج پر پہنچی۔ اورنگ زیب ایک محنت کش، سادہ لوح، اور اعتقاد پسند بادشاہ تھے۔ دور جدید کے مورخ اورنگ زیب کے دور اقتدار کے متعلق مختلف رائے رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اورنگ زیب کو کٹر مسلمان مان کر یہ کہتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ بھید بھاو کرتا تھا۔ مگر حالیہ تحقیق نے اس دلیل کو رد کیا ہے۔ اورنگ زیب کے دور اقتدار میں کوچ (بہار) پر 1661ء میں قبضہ کیا گیا۔ 1663ء میں ایہوم (اسام) پر بھی قبضہ کیا گیا یہ بات یہاں قابل ذکر ہے۔ کہ اورنگ زیب کے دور اقدار میں جاٹ، افغانی، ستنامی، اور سکھوں نے اورنگ زیب کے خلاف بغاوتیں شروع کر دیں۔ جو مغل حکومت کی زوال پذیری کا باعث بنی۔ اورنگ زیب نے مارواڑ اور میواڑ پر بھی حملے کیے۔

9.8.4 اورنگ زیب کی دکن پالیسی (Deccan Policy of Aurangzeb)

اورنگ زیب دکن کی سرزمین سے کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ اسی لیے ریاستوں کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے ایک خاص لائحہ عمل مرتب کیا۔ دکن میں اورنگ زیب کی سب سے بڑے سیاسی حریف مراٹھی سردار شیواجی اور بیجاپور کی ریاست تھی۔ 1665ء میں شیواجی کو شکست دینے کے بعد مغلوں نے شیواجی کے ساتھ پُرنزر معاہدہ کیا۔ جو زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ 1686ء اور 1687ء میں اورنگ زیب نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو بل ترتیب اپنے حملوں کا ہدف بنایا۔ بیجاپور اور گول کنڈہ کو اپنے قبضے میں کرنے کے بعد اورنگ زیب نے اپنی توجہ مراٹھا سرداروں کی طرف مبذول کی مگر 1707ء یعنی اورنگ زیب کی وفات تک وہ مراٹھا سرداروں کو اپنے قابو میں نہ لا سکا۔ اس طرح سے اورنگ زیب کی دکن پالیسی بھی مغل حکومت کے زوال کا ایک سبب بنی۔

9.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

بابر کی آمد پر ہندوستان کی سیاسی صورتحال انتشار سے دوچار تھی - یہ سمجھنا مناسب نہں ہوگا کہ ہندوستانی سیاست کا تعین مزہبی بنیادوں پر ہوتا تھا- بلکہ سیاسی منظرنامے پر حالات اور ذاتی مفادات حاوی رہے- لیکن پانی پت کے بعد بھی بابر کا راستہ ہموار نہیں تھا- اسے راجپوتوں اور منحرف افغانوں کے چیلنج کا سامنا تھا۔ یہ بابر کی فوجی حکمت عملی تھی جس نے اسے تمام مشکلات کے خلاف فتح دلائی-اس کا بیٹا ہمایوں جو اپنے والد جیسا جرنل نہیں تھا، متحدہ افغان اپوزیشن کے خلاف کھڑا نہ ہو سکا اور اس طرح وہ اپنی والد کی میراث کو کچھ عرصے تک برقرار رکھنے میں ناکام رہا- نتیجے کے طور پر وہ تقربیا" تیرہ سال تک بیابان میں پھنک دیا گیا-اس عرصے کے دوران ہم نے ایک عظم افغان- شیر شاہ- کا ظہور دیکھا جس نے اگرچہ صرف 5 سال حکومت کی لیکن تاریخ میں اپنی عظمت کے مستقل نشان چھوڑ گیا- مگراس کے

جانشین زیادہ دیر تک سلطنت کو نہ سنبھال سکے اور اس طرح سے 1555ء میں ہمایوں نے اقتدار کو دوبارہ حاصل کیا۔

اکبر بہت چھوٹی عمر میں شہنشاہ بن گیا۔ بیرم خان نے نوجوان شہنشاہ کے لیے بطور نائب ریاست (Regent) کام کیا۔ اکبر نے فتوحات کی پالیسی شروع کی اور مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کے بڑے علاقوں کو سلطنت کے تحت لے آیا۔ حالانکہ جنوب میں کامیابی صرف دکن کے علاقوں تک محدود تھی۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ استحکام کا عمل بھی شروع کیا گیا۔ نتیجتاً مفتوحہ علاقوں کو ایک متحدہ انتظامی نظام کے تحت رکھا گیا۔ اکبر کی مظبوط سلطنت کو اس کے جانشینوں نے مزید وسعتیں دی اور لگ بھگ 200 سال کے عرصے تک حکومت کی۔ اورنگ زیب کے دور میں جنوب (بیجاپور اور گولکنڈہ وغیرہ) اور شمال مشرق میں نئے علاقے شامل کیے گئے۔ لیکن ان کے دور میں ہی مغل سلطنت زوال کا شکار ہونے لگی۔

9.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

وکیلِ سلطنت : وکیلِ سلطنت کو شہنشاہ کا نائب سمجھا جاتا تھا۔

روشنائی تحرک : یہ ایک مقبول، غیر فرقہ پرست، صوفی تحرک تھی جس کی بنیاد پیر روشنائی نے رکھی تھی۔ انہوں نے اکبر کے دور حکومت میں مغلوں کے خلاف بغاوت کی۔

صوبیدار : یہ مغل صوبائی انتظامیہ کا سربراہ تھا جو گورنر کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔

نوحانی : نوحانی جسے لوحانی بھی کہا جاتا تھا لودی قبیلے کا ایک پشتون قبائلی ذیلی گروپ تھا۔

9.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

9.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بابر کے آمد پر دہلی سلطنت کا کون سا خاندان ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا؟
2. بابر کی آپ بیتی کا نام بتائیں؟
3. پانی پت کی پہلی جنگ کب لڑی گئی؟
4. راجپوت سلطنت کے طاقتور راجا کا نام بتائے؟
5. دوسری افغان سلطنت نے کتنے عرصے تک حکومت کی؟
6. اکبر کی ولادت کب اور کہاں ہوئی؟
7. جہانگیر کے کس بیٹے نے اُن کے خلاف بغاوت کی تھی؟
8. مغل سلطنت کا زاوال کب شروع ہوا؟
9. شاہجہان کی تاج پوشی کب ہوی؟

10. اورنگ زیب نے کتنے عرصے تک حکومت کی؟

9.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پانی پت جنگ کی اہمیت پر مختصر بحث کریں؟
2. ہمایوں کو درپیش مشکلات کو مختصر بیان کیجیے۔
3. دوسری افغان سلطنت سے کیا مراد ہے؟
4. گجرات کو مغلوں نے کس طرح سے اپنے گرفت میں لایا؟
5. اورنگ زیب کی دکن پالیسی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

9.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. بابر کی آمد پر ہندوستان کی سیاسی حالات کی وضاحت کیجیے۔
2. اکبر کے دور میں مغل سلطنت کی سیاسی توسیع اور استحکام پر بحث کریں؟
3. 'یہ وسطی ایشائی صورتحال تھی جس نے بابر کو ہندوستان کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا' اس پر تبصرہ کریں۔

9.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Chandra, Staish, *Medieval India From Sultanate to the Mughals*, Part-II, New Delhi, Har-Anand Publications, 1997.
2. Moreland, W.H., *India at the Death of Akbar*: *An Economic Study*, New Delhi, 1983.
3. Mukhoty Ira, *Akbar*: *The Great Mughal*, New Delhi, Aleph Book Company, 2020.
4. Richards, J.F., *The Mughal Empire*: *The New Cambridge History of India*, Vol. I. Cambridge University Press, Cambridge, 1996.
5. Truschke, Audrey, *Aurangzeb*: *The Man and the Myth*, New York City, Penguin, 2018.
6. Ali, M. Athar, *Mughal India*: *Studies in the Polity*, *Ideas*, *Society*, *and Culture*, New Delhi, Oxford University Press, 1997.

اکائی 10۔ مغل ریاست کی نوعیت

(Nature of the Mughal State)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 اقتدار اعلیٰ اور مغل حکومت

10.3 اکبر کا شاہی نظریہ

10.4 ریاست کی نوعیت: تشریحات

10.4.1 مشرقی مطلق العنانی

10.4.2 مرکزی ریاست

10.4.3 غیر مرکزیت پسند ریاست

10.4.4 پدری افسر شاہی ریاست / پدرانہ افسر شاہی ریاست

10.4.5 جنگی ریاست

10.5 اکتسابی نتائج

10.6 کلیدی الفاظ

10.7 نمونہ امتحانی سوالات

10.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

10.0 تمہید (Introduction)

سابقہ اکائی میں مغل حکومت کی بنیاد کا بغور جائزہ لیا گیا ہے کہ کیسے بابر نے مغل حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بابر کے جانشینوں خاص کر اکبر نے بابر کے ادھورے کام کو مزید آگے بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مغل حکومت نے تقریباً دو صدیوں تک بر صغیر کے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ جس سے نہ صرف زندگی کے مختلف معاملات اثر انداز ہوئے۔ بلکہ نظام حکومت بھی کافی متاثر ہوا۔ مغل ریاست کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس تاریخ کے بہت سارے ماخذ دستیاب ہیں۔ ابتدائی برطانوی مصنفین کی تحریروں سے شروع کرتے ہوئے ابھی حال تک ہمیں مورخین کے درمیان اس بات پر عالمانہ مباحثے کا پتہ چلتا ہے کہ آیا مغل حکومت مفتوحہ یا نہایت مرتکز افسر شاہی سلطنت یا پدری وراثتی یا مطلق العنان ریاست تھی یا ایسی ریاست جسے مالی بندوبست کے معنی میں سمجھا جاتا ہے وغیرہ۔ اس اکائی میں ہم پہلے مرکزی ایشائی روایت اور مغل حکمرانوں کے ذریعہ کی جانے والی اختراعات سے تلاش کرتے ہوئے شاہی نظریات کی بنیاد کی وضاحت کریں گے۔ مغل حکومت کی شناخت کو پرکھنے کے لیے مختلف تشریحات سے متعارف کرایا جائے گا اور مختلف مورخین کی رائے جاننے کی کوشش کی جائے گی۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل اقتدار اعلیٰ کے نظریہ کے ارتقاء کے بارے میں جانیں گے۔
- اس اکائی میں مرکزی ایشیائی روایت اور مغل حکمرانوں کے شاہی نظریات کی وضاحت کریں گے۔
- مغل سلطنت پر فارسی اور ترک منگول روایت کا جائزہ لیں گے۔
- اکبر کے تحت شاہی نظریہ کی وضاحت کریں گے۔
- مغل ریاست کی نوعیت پر مختلف تشریحات سے متعارف ہو سکیں گے۔

10.2 اقتدار اعلیٰ اور مغل حکومت (Sovereignty and the Mughal State)

اقتدار اعلیٰ کے معنی ہے جب ریاست اندونی اور بیرونی معاملات میں خود مختار، طاقتور اور آزاد ہو۔ مغل اقتدار اعلیٰ کو سمجھنے کے لیے ہمیں تیموری اور منگول سیاست کو سمجھنا ہو گا کیونکہ ہم جانتے ہے کہ مغل امیر تیمور اور چنگیز خان کی براہ راس اولاد تھے۔ 14 ویں صدی میں منگول سلطنت کے زوال کے بعد تیمور جو کہ ایک چغتائی ترک تھا نے مرکزی ایشیا، مغربی ایشیا کے کچھ حصوں کا احاطہ کرتے ہوئے ایک بڑی سلطنت قائم کی۔ مشرقی یورپ میں تیموری، عثمانی (ترک)، صفوی (ایران) میں اور بعد میں ہندوستان میں مغلوں نے حکومت کی۔ اگرچہ یہ سب مسلمان تھے لیکن انہوں نے خلیفہ سے رسمی منظوری حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا جو اس وقت روبہ زوال تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگرچہ ان قوتوں نے آہستہ آہستہ اسلام قبول کیا تھا لیکن ان کے سیاسی نظریات خالصتاً اسلامی اصولوں پر مبنی نہیں تھے۔ تیموری نظام حکومت

چنگیز کے یا(منگول روایت)، ترکی روایتیں اور شرعی اصول کے مشترکہ اوصاف تھے۔ لہذا مغل حکومت کو تیمور نظام حکومت کے گہرے جائزے کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے اور اسلامی، فارسی، اور ترک و منگول رواجوں کے امتزاج کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ تیمور کی سلطنت یا چغتائی خان عملداری ایک ڈھیلی ڈھالی ساخت سے ایک گہرائی سے بنے ہوئے نظام میں تبدیل ہوچکی تھی۔ جس میں الوہی ادراک اور چنگیزی فرمان کی آمیزش تھی۔ الوہی اعلان کے پہلو کو چنگیز خان کے مانوس ضوابط (قبائل کی تقسیم) پر ترجیح دی جاتی تھی۔ الیاتی پہلو کسی دیگر قسم کے قانون یا فرمان کے مقابلے ریاست کو زیادہ جواز فراہم کرتے تھے۔ بعض دانشوروں نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ تیمور خان نے ضابطہ پرست نظام اپنایا تھا (زیادہ تر فارسی روایت پر مبنی)۔ تاہم اقتدار اعلیٰ میں شرکت کے ان کی اصول کا نتیجہ حکومت کی تقسیم اور لامرکزیت کی شکل میں نکلا۔ مغل حکومت کا نظریہ بادشاہت کے ترک و منگول نظریہ کو سمجھے بغیر نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مغل اقتدار کا جو طرز فکر تھا وہ ترک و منگول کے نظریہ بادشاہت پر قائم تھا، کیونکہ مغل حکومت کے بانی بابر کی رگوں میں منگول فاتح چنگیز خان اور چغتائی فاتح تیمور دونوں کا خون دوڑتا تھا۔ ترک و منگول نظریہ بادشاہت کے مطابق بادشاہ کی حیثیت پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے الوہی ترجیح (فرایزدی) حاصل ہوتی ہے۔ مغلوں نے بھی اس نظریہ حکومت کو اپنایا اور بادشاہ کو ایک مطلق العنان حکمراں تسلیم کیا۔ بادشاہ تمام سول اور فوجی طاقت اپنے اختیار میں رکھتا تھا۔ اس طرح اقتدار اعلیٰ ایک موروثی حیثیت رکھتا ہے۔

منگول ریاست میں بڑے خان (The Great Khan) ایک خاص اہمیت کے حامل تھے۔ بقول تیمور 'روئے زمین پر بادشاہ کو خدا کے ایک نائب کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی حاکمیت میں کسی کی دخل اندازی نہیں ہونی چاہیے۔ امراء اور عہدیداروں کا احترام اور اعتماد لازمی ہے مگر بادشاہ کا فیصلہ حتمی سمجھنا چاہیئے۔' بابر کے دادا ابو سعید مرزا نے تیموری نظریہ بادشاہت میں زبردست تبدیلی کی۔ تیموری اپنے علاقائی دائرہ اختیار میں مطلق العنان قوت سے استفادہ کرتے تھے لیکن نظریاتی طور پر عظیم منگول خان کی فرمانروائی (بھلے ہی رسمی) کو تسلیم کرتے تھے۔ بابر کے دادا نے عظیم منگول خان کی اقتدار اعلیٰ کو ماننے سے انکار کیا۔

تقریباً 1505ء میں بابر نے 'پادشاہ' کا خطاب اپنایا تھا، جب کہ اُس نے کابل میں ایک مضبوط و منظم حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب تیموری اقتدار کو مختلف اطراف سے خطرہ لاحق تھا اور بابر نے اپنے دادا کی اتباع کرتے ہوئے بادشاہ کا خطاب اپنے لیے اختیار کیا۔ بابر کے مذہبی عقائد نے اس کے سیاسی نظریہ کی تشکیل نہیں کی بلکہ اُس کا سیاسی نظریہ حکمرانی کے عین مطابق تھا۔ بابر اگرچہ خود دار مسلمان تھا تاہم اس نے سیاست اور مذہب کو مختلف سمجھا۔ بابر کا ماننا تھا کہ اقتدار اعلیٰ کی پابندی ایک زنجیر کی مانند ہے اور کوئی مقتدر اعلیٰ اپنے کام کو عیش و نشاط سے نہیں جوڑ سکتا۔ اُس کا خیال تھا کہ بادشاہت (اقتدار اعلیٰ) کو منقسم نہیں ہونا چاہیے اور حکمرانی میں شراکت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس عمل سے مقتدر اعلیٰ کے کام کاج میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

بڑے بیٹے کی حیثیت سے ہمایوں کی تخت نشینی نے ایک مثبت روایت قائم کی۔ تخت نشینی کو برقرار رکھنے کے لیے بابر اور ہمایوں نے جو روایت قائم کی آگے جا کر اس کے مغل سلطنت پر مثبت اثرات مرتب ہوئے جس سے اقتدار اعلیٰ کے اصول و ضوابط کی بنیاد قائم ہوئی۔ بابر

کی وفات کے بعد بغیر کسی جھگڑے کے ہمایوں کی جانشینی واقع ہوئی۔ مگر سلطنت کی بھائیوں کے درمیان تقسیم کا مسئلہ آسانی سے حل نہیں ہوا۔ یہ تقسیم خود ہمایوں کے لیے ناگوار تھی کیوں کہ اس کے پاس قلیل وسائل تھے۔اس طرح کے سلوک کے باوجود اس کے بھائیوں نے ضرورت پڑنے پر اس کی مدد نہیں کی۔اس صورت حال میں ہمایوں نے محسوس کیا کہ سلطنت کی تقسیم کا طریقہ کار خامیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمایوں کے ذاتی عقائد نے ایک نظریہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ جس میں مختلف طریقوں سے اظہار خیال پایا گیا۔ وہ ماورائیت اور علم نجوم میں دلچسپی رکھتے تھے۔اور ایک دیندار مسلمان کی طرح بادشاہ کو کرہ ارض پر خدا کا نائب سمجھا تھا۔اس کا خیال تھا کہ سورج طبعی دنیا کا محور ہے۔اور بادشاہ کا سورج سے موازنے کرنے کے لائق ہونے کے سبب فانی (انسانی) دنیا کا مرکز ہے۔ ہمایوں نے تیموری وراثت پر اپنی سلطنت کو منظم کیا۔ جس میں نئے عدالتی طریقہ کار اور تقریبات کا تعین کیا گیا۔ جس سے بادشاہ کی حثیت میں اضافہ ہوا۔ بادشاہت کے بارے میں ہمایوں کے تصور یہ بیان کرتا ہے کہ حاکمیت بادشاہ کی ذاتی ملکیت ہے جس وہ چاہے عطا کر سکتا ہے۔ بادشاہت کے مطلق ہمایوں کے نظریات میں امراء کو سر تسلیم خم کرنا بھی کامل سمجھا جاتا تھا۔تاہم ہمایوں اپنے امراء سے مکمل وفاداری پر اختیار رکھنے کے اہل نہیں تھا۔

10.3 اکبر کا نظریہ بادشاہت (Imperial Ideology of Akbar)

اکبر کے دور حکومت (1556تا1605ء) میں بادشاہ کی عزت و طاقت میں بے حد اضافہ ہوا جس کی وجہ اکبر کی مثالی شخصیت ہے کیونکہ انہوں نے مختلف نسلیں مذہبی اور سماجی گروہوں کے مابین نازک توازن پر مبنی انتظامی ساخت کی تخلیق کے ساتھ علاقے کی توسیع کا کام مضبوط کیا۔اکبر کے اقتدار کو ابوالفضل کے ذریعے خاندانی نظریات کے منظم اظہار کے ذریعے مزید تقویت پہنچائی گئی تھی۔ درباری مورخ کی حیثیت سے ابوالفضل نے اکبر کے عہد سے وابسطہ تصورات کو نہ صرف ایک شکل دی بلکہ انہیں واضح طور پر پیش بھی کیا۔ابوالفضل کے مطابق منصب شاہی عطیہ خداوندی ہے۔اور عطیہ اس انسان کو ملتا ہے جس میں صفات قدسی ہوتے ہیں۔ جیسے اعلیٰ ظرفی ،اعلیٰ فیض رسانی ، وسیع صلاحیت ،اعلیٰ فہم و فراصت ، فطری سلسلہ نسب، عدل و انصاف وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ اور اکبر بادشاہ میں یہ صفات بدرجہ غایت تھیں۔ابو الفضل یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ عوام پر اکبر کا اقتدار محض جابرانہِ قوت، بغاوت کو کچلنے ، فتح اور فوجی طاقت کو اصولوں سے جاری نہیں ہوتا بلکہ یہ تعظیم و تکریم پر مبنی تھا۔

ابوالفضل اکبر کو خداوندی نور یا فرایزدی (Izadi-i-Farri) سے منسوب کرتا تھا۔ابوالفضل کی طرح دیگر درباری مورخین نے بہت سے ماٰخذ میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مغل بادشاہ کو راست طور پر خدا سے اقتدار حاصل ہوا ہے۔ان کے ذریعہ مذکور قصص و روایات میں سے ایک میں منگول ملکہ 'الان گوا' کا قصہ ہے جو اپنے خیمے میں آرام کرتے وقت سورج کی ایک کرن کے ذریعہ حاملہ ہو گئی تھی۔اس کی پیدا ہونے والی اولاد میں یہ ملکوتی روشنی نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔الوہی روشنی کو حاصل کرنے والی اشیا کی درجہ بندی میں مغل بادشاہ کو ابو الفضل نے سب سے اعلیٰ مقام پر رکھا ہے۔ یہاں وہ مشہور ایرانی صوفی شہاب الدین سہروردی (متوفی 1191) سے فیضان حاصل کرتا ہے جنھوں نے سب سے پہلے اس تصور کو تکمیل تک پہنچایا تھا۔اس تصور کے مطابق ایک درجہ بندی میں یہ ملکوتی روشنی بادشاہ میں منتقل ہوتی ہے،اس کے بعد وہ عوام کے لیے روحانی رہبری کا منبع بن جاتا ہے۔

اکبر کی روحانی خواہش نے اسے ایک آزاد خیال اور وسیع مذہبی ترتیب کی طرف لے گیا۔ مذہبی امور میں اکبر کی ریاستی پالیسی بڑے پیمانے پر ترک منگول روایات کے ذریعے متعین تھی۔ عام طور پر اکبر کے مذہبی نظریات زرتشت، صوفی، ناتھ یوگی یا برہمنی عقیدے کے تیئں اس کے تعلق کے ساق و سباق میں واضح کیے گئے۔ اس کے الوا ہی عقیدہ کو کثیر عقائد اور رواجوں کی امیزش کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اکبر نے مختلف ہندو رسموں کو اپنایا جیسے سورج اور آگ کی پوجا کرنا، سنسکرت میں سورج کے 1001 ناموں کو دُہرانا، اپنے سر پر ٹیکا لگانا، راکھی کی رسم اپنایا وغیرہ۔ اکبر کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ تمام مذاہب میں سچائی کا عنصر موجود ہے۔ لیکن غلامانہ تقلید اور رسم و رواج کی اندھی عقیدت نے اسے دھندلا دیا تھا۔

مذہب کو سمجھنے کے راسخ العقیدہ اسلامی طریقے سے دور ہوتے ہوئے اکبر نے کچھ نئے طور طریقے متعارف کیے۔ ان میں سے ایک دینِ الاہی یا توحیدِ الاہی ہے۔ ابوالفضل کے مطابق دینِ الاہی کا خاص مقصد لوگوں کی روحانی رہنمائی کرنا تھا۔ جدید مورخین کا دعواہے کہ اکبر نے اس مذہبی عقیدت مندی کو سیاسی الہ بنایا۔ ایسا لگتا ہے کہ بڑتی ہوئی سلطنت میں دانشدار اور وفادار افسران کی کمی پر تشویش بڑھ رہی تھی جو سلطنت کی توسیع اور ایک موثر انتظامیہ کی سیاسی اور فوجی ضروریات کو ایک موثر طریقے سے سنبھال سکتے تھے۔ ایس۔ اے۔ اے رضوی چار قسم کی عقیدت مندی کا حوالہ دیتا ہے جن کا مقصد تخت شاہی کے آس پاس نئے مغل طبقہ اشرافیہ کو اتحاد میں لانا تھا۔ عقیدت مندی کے یہ چار زمرے تھے: اپنی زندگی (جان)، جائداد (مال)، مذہب (دار) اور عزت (ناموس) کو بادشاہ کے خاطر وقف کر دینے کی خواہش۔ جے۔ ایف۔ ریچرڈز کے مطابق "پروکاری یا شاگردی ایک متفاوت قسم کے امراء کو تخت شاہی کے ساتھ متحد کرنے کا ایک انتہائی موثر ذریعہ تھا۔" اس پالیسی کا اثر اکبر کے بعد بھی رہا۔ شہزادوں اور اعلا افسران بھی اپنے آپ کو شہنشاہ کے پروکار مانتے تھے۔

10.4 ریاست کی نوعیت کی تشریحات (Interpretations of the Nature of State)

10.4.1 مشرقی مطلق العنانی (Oriental Despotism)

اس نظریہ کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ہمیں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے بارے میں ہمیں فرانسیسی سیاح فرانسس برنیر (Francis Bernier) کی سمجھ کا جائزہ لینا ہوگا۔ برنیر ایک معالج، سیاسی فلسفی نیز ایک مورخ تھا۔ وہ 1656ء سے 1668ء تک بارہ سال ہندوستان میں مغل دربار سے وابستہ رہا۔ برنیر نے تقریباً اپنی ہر مثال میں عہد مغل کے ہندوستان کی حالت کو یورپ کی ترقی کے مقابلے میں بے رنگ بتایا ہے۔ اس کی تحریر *Travels in the Mughal Empire* مغربی دنیا میں بے حد مقبول ہوئی۔ وہ ہمیشہ ہندستان کا موازنہ یورپ سے کرتا ہے اور عموماً ہندوستان پر یورپ کی فوقیت پر زور دیتا ہے۔ برنیر کے مطابق ہندوستان اور یورپ کے درمیان بنیادی فرق میں سے ایک ہندوستان میں نجی زمین کی ملکیت کا فقدان تھا۔ اس کا نجی یا ذاتی ملکیت کے وصف میں پختہ یقین تھا۔ اس نے زمین پر شاہی ملکیت کو ریاست اور اس کے باشندوں، دونوں کے لیے نقصان دہ مانا ہے۔ اس تحریر سے کئی لوگوں کو ایسا لگا کہ مغل سلطنت میں بادشاہ ساری زمینوں کا مالک تھا جو اسے اپنے لوگوں کے درمیان تقسیم کرتا تھا جس سے معیشت اور سماج پر برے اثرات مرتب ہوئے۔

برنیر کے بیانات نے اٹھارویں صدی سے ہی مفکرین کو متاثر کیا۔ مثال کے طور پر فرانسیسی فلسفی مونٹیسکو (Montesquieu) نے برنیر کی تحریر کا استعمال، مشرقی مطلق العنانی کے نظریہ کو مضبوطی دینے کے لیے کیا۔ جس کے مطابق مشرق (Orient/East) میں حکمراں اپنی رعایا کے اوپر مطلق العنان اقتدار رکھتے تھے جنہیں تابعداری اور غریبی کی حالت میں رکھا جاتا تھا۔ اس دلیل کی بنیاد یہ تھی کہ ساری زمین کا تعلق بادشاہ سے ہوتا تھا یعنی اس کے قبضے میں ہوتی تھی اور نجی ملکیت کا وجود نہیں تھا۔

اس نظریہ کو مزید تقویت نوآبادتی حکمرانوں سے ملی جنہوں نے اس نظریہ کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ نوآبادیاتی افسر جیسے ولیم جونز، جیمز مل وغیرہ کی رائے تھی کہ ہندوستان میں بادشاہ مطلق العنان تھے اور ان پر کسی قسم کا دباؤ (pressure) نہیں تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یورپ کی طرح ہندوستان میں قانون بنانے کے لیے پارلیمنٹ یا کونسل جیسے اداروں کا فقدان تھا۔ بادشاہ کا خاص مقصد زیادہ سے زیادہ محصول حاصل کرنا تھا۔ عوامی فلاح و بہبود کی کمی تھی۔ کسانوں کے زندہ رہنے کے لیے صرف تھوڑا سا اناج چھوڑ دیا جاتا تھا۔

ڈبلیو ایچ مورلینڈ کی تحریروں میں خاص طور پر *The Agrarian System of Moslem India* میں یہی نظریہ پیش کیا گیا۔ انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اس نظریہ کو ایشیائی طریقہ پیداوار (Asiatic Mode of Production) کے نظریہ کے طور پر مزید ترقی دی۔ انہوں نے یہ دلیل دی کہ ہندوستان (نیز دیگر ایشیائی ممالک) میں نوآبادیت سے قبل ریاست کے ذریعے فاضل پیداوار پر تصرف ہوتا تھا۔ اس سے ایک ایسے دیہی سماج کا ظہور ہوا جو بڑی تعداد میں یکساں اور مساوات پر مبنی تھا۔ ان دیہی طبقات پر شاہی دربار کی نگرانی ہوتی تھی۔ حکومت اس وقت تک ان کی خودمختاری کا احترام کرتی تھی جب تک کہ فاضل پیداوار کا بہاؤ بلا روک ٹوک کے آتا تھا۔ اس نظام کو مارکس نے جمودی نظام (Stagnant System) کہا ہے۔ اس نظام کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا بدلاؤ ممکن نہیں ہے۔ تاہم دیہی سماج کی یہ تصویر کشی حقیقت سے دور تھی۔ دراصل سولہویں اور سترہویں صدی میں دیہی سماج میں بڑے پیمانے پر سماجی اور معاشی فرق تھا۔ ایک طرف سے تو بڑے زمیندار تھے جو زمین کے مالک تھے۔ دوسری طرف وہ مزدور تھے جن کے پاس زمین نہیں تھی۔ ان دونوں کے درمیان میں بڑا کسان تھا جو کرائے کے مزدوروں کا استعمال کرتا تھا۔ دوسری طرف کسی مغل سرکاری دستاویز نے یہ ظاہر نہیں کیا ہے کہ ریاست ہی زمین کی اکیلی مالک تھی۔ اکبر کا سرکاری مورخ ابوالفضل زمینی مال گزاری کو حکومت کے معاوضہ کے طور پر ذکر کرتا ہے جو رعایا کو حفاظت مہیا کرنے کے بدلے میں بادشاہ کے ذریعے کیا گیا مطالبہ ہے، نہ کہ شاہی زمین پر عائد کیا گیا لگان۔ ممکن ہے یورپی سیاح ایسے مطالبوں کو لگان مانتے تھے۔

10.4.2 مرکزی ریاست (Centralised State)

کچھ مورخین کے مطابق مغل سلطنت ایک مرکزی ریاست تھی۔ ان مورخین کے مطابق مغل معاشی نظام ہی مغل ریاست کو مرکزی حیثیت فراہم کرتا ہے۔ معاشی نظام میں ضبطی نظام، جاگیرداری نظام اور منصب داری نظام وغیرہ شامل ہیں۔ عرفان حبیب ضبطی نظام کو (پیمائش پر مبنی مال گزاری متعین کرنے کا طریقہ) مغلوں کے تحت متحدہ انتظامی ڈھانچے کے مجسم نمونے کے طور پر دیکھتے ہیں جس کو

1580ء میں آخری شکل فراہم ہوئی تھی۔ان کے بقول اکبر بادشاہ نے 1574تا75 میں اہم اقدامات کاایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں دوسری باتوں کے علاوہ محاصل کی شرح کی تفصیلات طے کرنے کی نئ کوشش کی گئی تھی۔ تفصیلی معلومات کی بنیاد پر ہر فصل کے لیے نقد میں محاصل کی شرح بالواسطہ طور پر مقرر کی گئی تھیں۔لاہور، ملتان،اجمیر، دہلی،مالوہ،آگرہ الہ آباداور اودھ صوبوں کے مختلف فصلوں کے لیے نقد محاصل شرح(دستور العمل) کے علاحدہ گوشوارہ کے ساتھ محاصل کے حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ان منظور شدہ نقد شرحوں کو سال در سال نافذ کیا جاتا تھا۔وقتاً فوقتاًان شرحوں کی صرف انتظامیہ کے فرمان کے ذریعے ہی نظر ثانی کی جاتی تھی۔عرفان حبیب اس بات کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ضبطی نظام پورے خطہ سندھ سے گھاگرا تک فوجی مع بیورلک نظام کی اجینسی کے ذریعے زیر عمل تھا۔اور ریاستی پیداوار کا ایک تہائی سے لے کر نصف کے درمیان تغیر پذیر ہوتا رہتا تھا۔لہذا نظام ضبط مغل ریاست کو مرکزی حیثیت بخشتا ہے۔

مورخین کے مطابق مغل ریاست انتہائی مرکزیت کی حامل تھی۔عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں خصوصاً مغل دور میں ہمیں بہت سارے بندر گاہ نظر آتے ہے جو اندرونی اور بیرونی پھلتی پھولتی تجارت کی وجہ تھے۔ جب تک مغل سلطنت اپنی عروج پر تھی یہ بندر گاہیں بڑے تجارتی مراکز کے طور پر پروان چڑھتی رہیں۔جونہی سلطنت کا زوال شروع ہواان بندر گاہوں کی شان وشوکت بھی ختم ہوئی۔

منصب داری اور جاگیر داری نظام، مغل دور کے دو اہم ادارے تھے۔ مغل بادشاہوں بالخصوص اکبر نے ان اداروں کو مزید جلا بخشی۔جس سے مغل ریاست کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔عرفان حبیب کے مطابق جب تک مغل بادشاہوں نے ان اداروں کو ضبطی نظام پر قائم رکھاتب تک مغل ریاست کی مرکزی حیثیت برقرار رہی۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ جاگیر داروں کو اپنی جاگیر سے دو سال کے وقفے کے بعدان کی منتقلی یقینی ہو جاتی تھی۔جاگیر دار کو جاگیر پر صرف مالی حق حاصل تھا نہ کہ وہ اس کے مالک کی حیثیت رکھتے تھے۔منصب دار ایک فوجی اور شہری اہلکار تھااس کے ذمے ایک بڑی فوج کا اہتمام کرنا تھاتا کہ سلطنت کو مزید وسعت ملے۔میر بخشی منصب داروں کی دیکھ ریکھ کرتا تھا۔ مختصراًاطہر علی کے مطابق منصب داری اور جاگیر داری نظام سے مغل حکومت کو نہ صرف فروغ حاصل ہوا بلکہ یکساں نظام اور استحکام بھی ملا۔علاوہ ازیں یکساں رائج السکہ، جاسوسی نظام، ملکی اور غیر ملکی تجارت وغیرہ وغیرہ مغل حکومت کے ریاست کی مرکزیت کا بین ثبوت ہیں۔

عرفان حبیب کے نظریہ کو متعدد مورخین نے تنقید کا ہدف بنایا۔انہوں نے اکبر سے اورنگ زیب کے دور پر خاصہ زور دیا۔اکبر سے پہلے اور اورنگ زیب کے بعد کے دور کو ان کی تاریخی تحریروں میں نظر انداز کیا گیا ہے۔شیرین موسوی جنہوں نے مغل ماخذ، سرکاری اور غیر سرکاری دونوں پر کام کیا ہے،اس نقطہ نظر کو مسترد کیا جو کہتے ہے کہ مغلوں کا اثر کبھی بھی ہندوستانی سماج میں داخل نہیں ہوا۔ان کا خیال یہ ہے کہ ریاستی اثر سماج کے کمتر طبقے میں داخل ہو جاتا تھا۔اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ جب بنارسی داس(جونپور کاایک سونار)اکبر کی موت کی خبر سن کر سیڑھیوں سے گر جاتا ہے اور وہ دوبارہ سکون کی سانس لیتا ہے جب وہ جہانگیر کی جانشینی کی خبر سنتا ہے۔

10.4.3 غیر مرکزی ریاست (Decenteralised State)

وہ مورخین جن کا ماننا ہے کہ مغل حکومت ایک غیر مرکزی ریاست تھی،ان میں سی اے بیلی (C.A Bayly)مظفر عالم، سنجے

سبر منیم، چیتن سنگھ، آر۔ پی ترپاٹھی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی دلیل مندرجہ ذیل نقطوں پر پیش کی ہے۔

- **مضبوط شہری دانشور:** طاقتور شہری ممتاز شخصیات کی موجودگی میں مغل سلطنت کی مرکزیت قائم رہنا مشکل تھا۔ ایک اچھے مرکزی نظام کے باوجود یہ شہری طبقہ بہت سارے معاملات پر اپنا حق رکھتا تھا۔ سی اے بیلی کی مطابق ان کے پاس ایک اپنے عہدے کے ذریعے حاصل کیا ہوا بڑا سرمایہ (Portfolio Capital) تھا جس کا صحیح استعمال کر کے یہ سماج میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔
- **ضبطی نظام میں غیر یکسانیت:** ضبطی نظام جو عرفان حبیب کے مطابق مرکزی ریاست کی مثال تھی مگر بقول مظفر عالم اور سنجے سبرامنیم یہ سبھی علاقوں کے لیے یکساں طور پر رائج نہ تھی ان کا خیال ہے کہ اکبر کے دور حکومت کے آخری ایام میں بہت سے صوبوں میں آراضی (پیمائش کی گئی) سے مطلق کوئی جانکاری نہیں ملتی۔ تقریباً 1600ء میں مغلوں کے تحت مال گزاری کی وصولی کا تیسرا حصہ ضبط کے علاوہ دیگر طریقوں سے انجام دیا جاتا تھا جن صوبوں میں ضبطی نظام رائج تھا ان میں الہ آباد، اودھ، آگرہ، دہلی اور ملتان تھے۔ 1600ء میں مالوہ اور گجرات میں بھی ضبط کو اپنایا نہیں گیا تھا۔ اجمیر میں دیگر طریقے اپنائے جاتے تھے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر مغل نظام حکومت میں مرکزی ریاست کا ہونا خاصہ مشکل تھا۔
- **قطعاتی ریاست:** اس نظریہ کے مانند برٹن اسٹین (Burton Stein) نے قطعاتی ریاست (Segmentary State) کا نمونہ پیش کیا جسے اس نے ایک ماہر بشریات، ایڈن ساؤتھ ہال (Aidan Southall) سے لیا تھا۔ ساؤتھ ہال نے اس نظریہ کو جنوبی افریقہ کے الور (Alur) سماج کے بارے میں وضاحت کی لیے وضع کیا تھا۔ برٹن اسٹین نے پہلے چول سلطنت کی تاریخ اور سیاست میں اس نظریہ کا اطلاق کیا اور پھر اس نے وجے نگر اقتدار کی ساخت کی وضاحت کے لیے اس نمونے کا استعمال کیا۔ بعد میں اسٹین نے اس نظریہ کی توسیع مغل سلطنت پر بھی کی۔ لفظ طبقہ (Segment) کا استعمال کرتے ہوئے اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل طاقت مقامی سرداروں جیسے زمیندا، جاگیرداروں کے ہاتھوں میں رہتی تھی اور طاقت یا اقتدار نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی تھی۔ کیونکہ بادشاہ برائے نام ہی تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغل سلطنت میں مرکزیت کا فقدان تھا۔ تاہم اس نظریہ پر کچھ مورخ جیسے ہرمن کلکے نے سوال کھڑے کیے ہیں۔
- **قبائل کی تقسیم:** آر۔ پی ترپاٹھی نے بھی مغل ریاست کو غیر مرکزی ریاست سے منسوب کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ مغل سلطنت میں قبائل کی تقسیم کے ذریعہ، اقتدار اعلیٰ کے تقسیم پر زور دیا گیا ہے جس سے جاگیرداری نظام کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس میں افسری نظام اور مضبوط شہنشاہ کے ابھرنے کی بہت کم گنجائش تھی جو کہ مرکزیت کے لیے مطلوبہ لازمی شرط تھی۔

10.4.4 پدری افسر شاہی ریاست (Patrimonial Bureaucratic State)

اسٹیفن بلیک (Stephen Blake)، مغل ریاست کا تجزیہ پدری افسر شاہی ریاست کے طور پر کرتا ہے۔ یہ تصور انہوں نے میکس ویبر (Max Weber) سے لیا۔ مغل ریاست پر اس کا اطلاق اس اصول پر مبنی ہے کہ چھوٹی ریاستوں میں حکمراں اس طرح

حکمرانی کرتے ہیں گویا کہ یہ ان کی باپ دادا کی وراثت ہو یا ذاتی ملکیت ہو۔ علاقے کی توسیع اور بڑی ریاستوں کے ظہور کے ساتھ موثر حکمرانی کے لیے افسر شاہی کی تقرری عمل میں لائی جاتی ہے۔ یہ پدری افسر شاہی ریاست کی بنیاد ہے۔ اُن کے مطابق مغل بادشاہوں نے موروثی طور پر حکومت کی اور موروثی افسر شاہوں جیسے شہزادوں کی مدد سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ حالانکہ اس نقطہ نظر کو مسترد کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس طرح کی حکومت کا تصور صرف چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر ہو سکتا ہے نہ کہ مغل سلطنت پر جو ایک بہت بڑی حکومت تھی۔ مغل سلطنت میں نہ صرف شہزادوں کو بڑے بڑے عہدے دیے جاتے تھے بلکہ مختلف طرح کے لوگ جیسے علی مرداں خان، مرشد قلی خان، وغیرہ بھی بڑے عہدوں پر فائز تھے جب کہ ان کی مغل بادشاہوں کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔

10.4.5 جنگی ریاست (Martial State)

کچھ مورخین نے مغل ریاست کو جنگی ریاست کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ انہوں نے اپنی دلیل کچھ اس طرح پیش کی ہے کہ مغل سلطنت میں ہر معاملہ فوج کے ماتحت تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مغل سلطنت میں فوج کا اہم کردار ہے مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ یہ ایک جنگی یا فوجی ریاست تھی۔ کیونکہ مغل اقتدار میں بادشاہ ایک خود مختار حیثیت رکھتا تھا اور فوج پر اس کی بھرپور گرفت تھی۔

10.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مندرجہ بالا تجزیے سے ہم اس بات کا خلاصہ کرتے ہیں کہ تیموری خانوادے کی ترک و منگول اصل، مغل سلطنت کے منصب شاہی کے تصور پر اثر انداز ہوا۔ اقتدار اعلیٰ اور بادشاہت کے بارے میں بابر کے تصور کا قبائلی منگول روایت کے اصولوں کے ساتھ جس میں بابر نے پرورش پائی، بلا واسطہ تعلق تھا۔ اکبر نے معقول عنصر متعارف کرنے کے ذریعے اقتدار اعلیٰ کے مغل تصور میں ایجاد کی۔ مغل ریاست کی نوعیت کا تجزیہ کرنے کے سلسلے میں بعض مورخین نے اسے نہایت مرکزی سلطنت کے طور پر درج کیا۔ عرفان حبیب، مغل سلطنت کی نوعیت کی وضاحت کے سلسلے میں سلطنت کے نظم و نسق اور مالی وسائل پر زور دیتے ہیں۔ اسٹیفن بلیک اور پیرسن جیسے دانشوروں نے مغل اقتدار کو مطلق العنان ذاتی اور پدر افسر شاہی کے طور پر بیان کیا ہے۔ مظفر عالم اور سنجے سبرامنیم نے مرکزی طور پر عائد یکسانیت کے بجائے علاقائی تنوع اور فرق پر توجہ دلائی ہے۔ چیتن سنگھ بھی مغل ریاست کی انتظامی کارکردگی کی علاقائی بنیاد کی تائید کرتے ہیں۔

10.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

چغتائی : چغتائی سے مراد چنگیز کے دوسرے بیٹے چغتائی کی اولاد اور پیروکار

خلیفہ :اسلامی تاریخ میں خلیفہ مسلم قوم کا حکمراں ہوتا ہے۔

ماورائیت :انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوا فلسفہ جو سائنسی مادیت کی بجائے بدیہی، روحانی سوچ کو فروغ دیتا ہے۔

ظل الٰہی :اس کے لغوی معنی ہے زمین پر خدا کا سایہ۔ وسطی دور میں بہت سارے حکمرانوں نے اس لقب کو اپنایا۔

نظامِ ضبط : یہ زمینی محصول کا نظام تھا۔ جس میں مالیہ کا تعین زمین کی پیمائش سے کیا جاتا تھا۔

میر بخشی : میر بخشی مغل سلطنت میں فوجی انتظامیہ کا سر براہ تھا۔

جمودی نظام : یہ وہ نظام ہے۔ جس میں معیشت سستی کی حالت میں ہوتی ہے اور ترقی کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔

10.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

10.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغلیہ سیاست اور اقتدار اعلیٰ پر کس کا اثر تھا؟
2. میر بخشی کون تھا؟
3. "ٹریلوس ان دی مغل ایمپائیر" کس کی تحریر ہے؟
4. برٹن اسٹین کی قطعاتی نمونہ ریاست کو کس نے حدف تنقید بنایا ہے؟
5. مرکزی ریاست کا نظریہ کس مورخ نے پیش کیا ہے؟
6. مشرقی مطلق العنانی نظریہ کس مصنف نے متعارف کرایا؟
7. پدری افسر شاہی ریاست کا نظریہ کس نے دیا ہے؟
8. اکبر نامہ کس کی تصنیف ہے؟

10.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ایشائی طریقہ پیداوار سے کیا مراد ہے؟
2. مرکزی ریاست کا نظریہ کن وجوہات پر حدف تنقید بنایا گیا؟
3. ابوالفضل کی طرف سے پیش کردہ اقتدار اعلیٰ کے نظریہ پر تبصرہ کیجیے۔
4. لامرکزی ریاست نظریہ کے حق میں دلائل پر بحث کرے؟
5. مغل اقتدار اعلیٰ میں عنصرِ تقدس کا کیا کردار ہے؟

10.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل ریاست کی فطرت کی وضاحت مختلف مورخین کے نظریات کا حوالہ دیتے ہوئے کیجیے۔
2. مشرقی مطلق العنانی نظریہ پر بحث کریں؟
3. پدری افسر شاہی ریاست کے نظریہ پر تفصیل سے وضاحت کیجیے۔

10.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Kulke, Herman (eds.), *The State in India*, *1000-1700*. Delhi, Oxford University Press,1999.
2. Alam, M., and S. Subramanyam (eds.), *The Mughal State*, *1526-1750*. New Delhi, Oxford University Press,1998.
3. Richards, J.F., *The Mughal Empire* (*The New Cambridge History of India*). Vols. I–V, Cambridge, Cambridge University Press,1993.
4. Bayly, C.A., *Rulers*, *Townsmen and Bazaars*: *North Indian Society in the Age of British Expansion*, *1770-1870*, Cambridge Cambridge University Press,1983.
5. Moreland, W.H., *The Agrarian System of Moslem India*: *A Historical Essay with Appendices*, Allahabad, Central Book Depot,1929.
6. Habib, Irfan, *Agrarian System of Mughal India*, *1556-1707*, New Delhi, Oxford University Press,1999.
7. Moosvi, Shireen, *The Pre-Colonial State*, Sectional Presidential Address, *Proceedings of the Indian History Congress*, Medieval India, 2004.
8. Moosvi, Shireen, *The Economy of Mughal Empire*, *1595*: *A Statistical Study*, Delhi Oxford University Press,1987.

اکائی 11۔ مغل نظریہ بادشاہت

(Mughal Theory of Monarchy)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 تاریخی پس منظر

11.3 وسطی ایشیائی سیاست کی نوعیت: ترک اور منگول اثر

11.3.1 تورہ کا اثر

11.3.2 ترک و منگول بادشاہت کا تصوّر

11.3.3 سیاسی ساخت کی نوعیت

11.3.4 جانشینی کا رواج

11.3.5 مرکز اور ریاست کے درمیان تعلقات

11.3.6 امراء

11.4 مغل ریاست کا نظریہ اور اس کی ترقی

11.4.1 بابر اور ہمایوں

11.4.2 اکبر

11.4.3 جہانگیر

11.4.4 شاہجہاں

11.4.5 اورنگزیب

11.5 اکتسابی نتائج

11.6 کلیدی الفاظ

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.8 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

11.0 تمہید(Introduction)

ہندوستانی اور ایرانی سیاسی فکر کے ساتھ ساتھ ترک و منگول روایات نے مغل بادشاہت کے ادارے کو کافی متاثر کیا تھا۔ بادشاہت کو عہد وسطیٰ کی سیاست کا ایک بنیادی ڈھانچہ سمجھا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں، ابوالفضل لکھتے ہیں کہ 'اگر بادشاہت نہ ہوتی تو جھگڑوں کے طوفان اور خود غرضی کے عزائم کبھی بھی ختم نہ ہوتے۔ لاقانونیت اور ہوس کے بوجھ تلے دب کر انسانیت تباہی کے گڑھے میں دھنس جاتی۔' ریاست کی نوعیت اور سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کی رنگت کا تعین بڑی حد تک بادشاہت کے نظریے اور بادشاہ کی پالیسیوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے مغلیہ ریاست اور نظریۂ بادشاہت کی درست تفہیم کے لیے وسطی ایشیائی سیاسی نظریات اور اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ ضروری ہے۔

11.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل نظریۂ بادشاہت پر ایرانی، ترک اور منگول روایات کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- مغلوں کی آبائی سلطنت میں بادشاہت کا تصور اور سیاسی ساخت کی نوعیت کو جان سکیں گے۔
- مغل بادشاہت کا تصور اور ترک و منگول انتظامیہ کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مختلف مغل حکمرانوں کے تحت بادشاہت کے تصور کا ارتقا کا جائزہ لے سکیں گے۔

11.2 تاریخی پس منظر (Historical Background)

مغل خاندان وسطی ایشیا میں تقریباً دو صدیوں کی حکمرانی کا تجربہ رکھتا تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں نظم و نسق کے آزمودہ اصول قایم کئے تھے۔ سرزمین ہند میں اپنے قدم جمانے کے لیے، انہوں نے اپنے ارد گرد کی روایات کو قبول کیا، جس کی وجہ سے وہ ایک وسیع ذہنیت کے مالک بن گئے۔ اس لیے، ہندوستان کا انتظامی ڈھانچہ اور مغلوں کی پالیسیاں، ہندی اور اسلامی رجحانات کا مجموعہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے، وسطی ایشیائی ورثہ اور ترک و منگول میراث ہندوستانی روایات، اداروں اور اصطلاحات میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، چنگیزی اور تیموری سلطنت کے باقیات بھی مغل ہندوستان کے سیاسی ڈھانچے میں نمایاں ہیں۔

بابر اپنے آپ کو 'ترک' کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے جب کہ وہ ایک ترک و منگول تھے۔ دراصل، والد کی طرف سے بابر کا تعلق تیمور سے اور والدہ کی طرف سے چنگیز خان سے تھا۔ منگولوں کے خلاف غصے کے باوجود بھی، بابر نے چنگیز خان اور اس کے خاندان کو بہت عزت بخشی۔ اپنے اسلاف کے بارے میں اکبر کا رویہ ابوالفضل کے تبصروں سے ظاہر ہوتا ہے جس نے چنگیز خان کو 'عظیم آدمی' کے خطاب سے موسوم کیا ہے۔ منگولوں کو برتر و بالا بیان کر کے مغلوں نے ہندوستان میں اپنے خاندان کو وقار بخشنے کی کوشش کی۔ اس طرح، چنگیز خان اور تیمور کی نسل سے وابستہ ہو کر، مغلوں نے ہندوستان پر حاکمیت کا دعویٰ کیا۔ شجرۂ نسب اور عورتوں کے ذریعے چنگیز خان سے ان کے تعلقات کو نظر انداز کرتے ہوئے، ہندوستان میں بابر کے خاندان کو مختلف ناموں جیسے چغتائی، مغل اور قراوانہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس تعلق کی اہمیت کو نہ صرف محسوس کیا گیا، بلکہ مغل حکمرانوں، درباری مورخوں، متعدد سوانح عمری، تاریخی حوالوں، شاہی خطوط اور دیگر دستاویزات نے اس پر زور دیا ہے۔ شجرہ نسب کی بنیاد پر چنگیزی اور تیموری خاندانوں کے درمیان رشتہ داری نے مغلوں کو چنگیز خان کے ساتھ قریبی تعلق کا دعویٰ کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے ہندوستان میں حکومت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی میراث کو کافی حد تک محفوظ رکھا۔ علاوہ ازیں، ہندوستانی اور وسطی ایشیائی بہت ساری اصطلاحات اور اداروں میں موافقت نظر آتی ہے۔

11.3 وسطی ایشیائی سیاست کی نوعیت: ترک و منگول اثر

(Nature of Central Asian Politics: Turko Mongol Influence)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ وسطی ایشیائی سیاست کو مغلوں نے متعدد طریقوں سے اپنایا، جس میں ترک اور منگول خصوصیات موجود تھیں۔ لیکن اس معاملے میں اکثر ترک و منگول اثرات کی وسعت کے بارے میں تنازعہ موجود ہیں۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ منگول روایات غالب تھیں، جب کہ بعض دانشور لکھتے ہیں کہ ترکی اثر ور سوخ اتنا مضبوط تھا کہ منگول نظام واقعی میں تبدیل ہو گیا جسے بعد میں 'ترک و منگول' نظام کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ جب چنگیز خان وسطی ایشیا میں داخل ہوا تو ان کی فوج میں بنیادی طور پر ترک شامل تھے۔ متعدد ماخذات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ مقررہ اصولوں اور مغل رسم و رواج کی پیروی اکثر چنگیز خان کے انداز میں کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ، تیمور بھی برلاس (جو ایک ترک اور منگول قبیلہ تھا) قبیلے سے وابستہ تھا۔ الغرض، تیمور کی سلطنت بھی ترک اور منگول سیاسی اور فوجی نظام کا ایک منفرد مجموعہ تھا۔

11.3.1 تورہ کا اثر (Effect of the Turah)

ترک روایات کے علاوہ، وسطی ایشیائی انتظامیہ تورہ سے کافی متاثر تھی۔ تورہ وہ قوانین ہیں جو چنگیز خان نے اپنی تخت نشینی کے بعد وضع کیے تھے۔ تورہ کے لیے استعمال کئے جانے والے دیگر اصطلاحات میں یاسا، یوسن اور یاساق شامل ہیں۔ تورہ ایک ناقابل تغیر ضابطہ سمجھا جاتا تھا، جس میں کوئی مذہبی عنصر نہیں تھا، بلکہ یہ سیاسی، فوجی، انتظامی اصولوں کا ایک مجموعہ تھا۔ اکبر کو وسطی ایشیائی روابط اور روایات پر فخر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کے دور میں مغل سیاست اور انتظامیہ کے مختلف شعبوں میں وسطی ایشیائی اور ہندوستانی روایات کا ایک عمدہ امتزاج اسلامی

اصولوں کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جہانگیر نامہ میں بھی تورہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور جہانگیر کے کچھ سیاسی اقدامات میں تورہ کا اثر نمایاں ہے۔ تاہم، تورہ کے حوالہ جات شاہجہاں کے دور میں دھیرے دھیرے کم ہونے لگے اور آخر کار اورنگ زیب کے دور میں 'مذہبی احیاء پسندی' کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس کے باوجود، ہندوستانی تناظر میں تورہ کے اصول اور چغتائی روایات کی افادیت محدود تھی۔ متعدد ادبی ماخذات سے معلوم ہوتا ہے کہ تورہ پر وہ مغل شہنشاہ اور سیاست دان زور دیتے تھے جو ہندوستان کے سابق فاتحین چنگیز اور تیمور کے ساتھ اپنے روابط کو اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ تاہم، اس بات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے کہ تورہ کے روایات مغل سلطنت کی مختلف تقریبوں اور مجلسوں میں قائم رہے۔ اس کے باوجود، ابتدائی مغل ماخذات میں پائے جانے والے 'چغتائی روایات' کے حوالہ جات بعد کے دور میں واضح طور پر غائب ہیں۔

11.3.2 ترک و منگول بادشاہت کا تصوّر (Concept of Turko-Mongol Empire)

اگرچہ چنگیز خان نے خود مختاری کا نظریہ ایغوروں (Uyghurs) سے لیا تھا، پھر بھی منگولوں کو خان کی مطلق طاقت پر یقین تھا جو ایک منگول خان کے درج ذیل الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اگر آسمان میں صرف ایک سورج یا چاند ہو سکتا ہے، تو زمین پر دو مالک کیسے ہو سکتے ہیں۔" بہر حال، تمام تر سختیوں کے ساتھ انتظامیہ کو آسان بنانے اور شہزادوں کے درمیان حکمرانی کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے حکمراں کے بیٹوں کے درمیان سلطنت کی تقسیم منگول خود مختاری کا بنیادی اصول تھا۔ لیکن تیمور نے مطلق بادشاہت کے تصور کی پیروی کی، اور کہا کہ "دنیا کے آباد حصے کی پوری وسعت دو بادشاہوں کے لائق نہیں ہے۔ چونکہ خدا ایک ہے، اس لیے زمین پر خدا کا نائب بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ بابر بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ 'حکمرانی میں شراکت ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں کبھی نہیں سنا جاتا ہے۔'

ان مطالبات کے باوجود، مورخین کے درمیان تیمور کی مطلق بادشاہت کی روایت کے بارے میں بحث ہے۔ تیمور نے خود کبھی بھی امیر سے بڑا کوئی لقب استعمال نہیں کیا۔ اگرچہ تیمور کے جانشین شاہ رخ نے بادشاہ اور سلطان الاعظم کے القاب استعمال کئے، لیکن خان لقب کی برائے نام بادشاہت کا خیال ابو سعید مینا کے زمانے تک زندہ رہا۔ تاہم، کٹھ پتلی خانوں کا وجود تیمور کے لیے ایک سیاسی ضرورت تھی۔ چونکہ تیمور کا تعلق چنگیز خان کے شاہی خاندان سے نہیں تھا، اس لیے دیئے گئے صورت حال میں صرف چنگیز خان قبیلے کے مرد ہی خان لقب کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ اس طرح تیمور کی تخت نشینی کو منگولوں کی طرف سے چیلنج کا امکان تھا۔

ان خانوں کو ایک خاص علاقے تک محدود رکھا گیا تھا، اور ان کے نام شاہی منشور اور تیموری سکے ان کے چند اختیارات تھے۔ اس کے باوجود، تیمور نے خانوں پر اپنی بالادستی برقرار رکھی۔ مطلوبہ طاقت اور چغتائی امراء سے حمایت حاصل کر کے، انہوں نے 1370 میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور صاحب قران (یہ خطاب ایسے حکمراں کو دیا جاتا تھا، جس نے چالیس سال تک حکومت کی ہو) کا لقب اختیار کیا۔ تیمور کی تاجپوشی کی تقریب شاہی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوئی۔ مطلق العنانیت پر پختہ یقین رکھنے کی وجہ سے تیمور نے کبھی بھی مشاورتی مجلس (قرولتائی) کو غیر ضروری اہمیت نہیں دی۔ اس کے علاوہ، وہ اپنے آپ کو دنیاوی اور روحانی پیشوا بھی سمجھتے تھے۔ انہوں نے خود مختاری کے تصوّر کو منطقی انجام تک پہنچایا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ انہیں 'خدا کی طرف سے براہ راست انکشافات موصول ہوئے۔' اس طرح، ان کی

حیثیت کو الہامی تصدیق حاصل ہوئی۔' کٹھ پتلی خانوں کو نصب کرنے کا رواج محض ایک سیاسی کھیل تھا جو تیمور اور اس کے جانشینوں نے اپنی طاقت قائم رکھنے کے لیے اور منگول افواج کی حمایت کو متحرک کرنے کے لیے کھیلا تھا۔ بہر حال، 1402ء میں محمود کی وفات کے بعد، تیمور نے کسی بھی خان کو مقرر کرنے کی پرواہ نہیں کی۔

چغتائی فاتح بابر ایسے خیالات کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوا، جو دہلی کے ابتدائی ترک حکمرانوں یا افغانوں سے بالکل مماثلت نہیں رکھتے تھے۔ اپنے آپ کو چنگیز خان اور تیمور کی نسل سے وابستگی کا دعویٰ کرتے ہوئے، بابر نے ایسے نظام نظریات کا مطالبہ کیا جو مغل، ترک اور اسلامی ثقافتوں کی عکاسی کرتا تھا۔ ترک، ایرانی اور منگول کسی خود مختار حکمران کی حیثیت کو ایک لیڈر سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ چنگیز خان کے آباؤاجداد کی پیدائش کی کہانی ان کی شخصیت کی مافوق الفطرت ابتداء کے عنصر کی واضح نشاندہی کرتی ہے۔ روایات کے مطابق وہ نور کا بیٹا تھا۔ چنگیز خان کے خاندان کی نیم خداداد (semi-divine) ابتداء اور ان کی کامیابی کے بے پناہ وقار نے ان کے گھر کو حوصلہ افزائی اور خوف کا مرکز بنا دیا تھا، جس کی وجہ سے سولہویں صدی تک ان کے خاندان میں شاہی حکومت قائم رہی۔

مغل خان ایک عظیم خان تھا، جو اسلامی نظریۂ خلیفہ سے مختلف تھا۔ عظیم خان خالصتاً سیاسی اور فوجی رہنما ہوا کرتا تھا نہ کہ مذہبی۔ ان کا کام یہ نہیں تھا کہ وہ متعین ضابطہ الٰہی یا خدائی نظام نافذ کرے؛ جیسے خلیفہ کرتا تھا۔ چونکہ خلیفہ شریعت کا محافظ اور نافذ تصوّر کیا جاتا تھا، لیکن مغل بادشاہ پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں تھی اور وہ محض ایک سیاسی اور فوجی سربراہ تھے۔

مغل حکومت کی ایک اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ سلطنت کو شہزادوں کے درمیان علاقائی نہیں بلکہ قبائلی بنیادوں پر تقسیم کیا جاتا تھا۔ تاہم، نظریاتی طور پر، انہوں نے مغلستان (مغلوں کا وطن) میں مقیم 'عظیم خان' کی حاکمیت کو تسلیم کیا۔ یہ نظریہ اسلامی عقائد اور مغلوں کے درمیان رائج رسومات اور روایات پر بنیاد رکھتا تھا۔

تیمور کا عقیدہ تھا کہ 'خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، اس لیے خدا کی زمین کا نائب (بادشاہ) بھی ایک ہی ہونا چاہیے'۔ اس کے علاوہ، وہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ بادشاہ عوام کو یہ احساس دلائے کہ وہ کسی کے زیر اثر نہیں ہے۔ تاہم، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ طاقت کا بے دریغ استعمال کرے۔ اس نے خود اپنے امراء اور افسران کا کافی احترام کیا اور عقلمندوں سے مشورہ کرنے کی اہمیت پر زور دیا ہے جیسا کہ بلبن نے کیا تھا۔ لیکن حتمی فیصلہ بادشاہ کے پاس ہوتا تھا کہ وہ صلاح کار کی تجویز پر عمل کرے گا یا نہیں۔

تیمور الوہی بادشاہت کے تصوّر (Theory of Divine Kingship) پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے اس نظریہ کا ذکر اپنی سوانح عمری میں بھی کیا ہے، جس میں وہ لکھتا ہے کہ "جب بھی خدا تعالیٰ کسی شخص کو بادشاہی کے تخت پر فائز کرتا ہے، تو وہ اسے خاص وقار اور حکمت سے نوازتا ہے، جس کے ذریعے وہ بنی نوع انسان کو اپنا فرمانبردار بناتا ہے۔ یہ فضیلت خدا کے فضل کی ایک کرن ہے جو بادشاہ پر چمکتی رہتی ہے اور جب تک وہ احسان کا شکر ادا کرتا ہے اس کی قسمت اور غلبہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔" وہ مزید لکھتے ہیں کہ "عادل بادشاہ خدا کا سایہ ہوتا ہے جس کے ذریعے بنی نوع انسان محکوم اور تابعدار بن جاتا ہے؛ ان کے سائے کے خوف سے لوگ فرمانبردار بن جاتے ہیں اور ان کا اقتدار و

اختیار سلطنت پر مسلط ہو جاتا ہے۔" تیمور کو اس بات پر پختہ یقین تھا کہ انہیں خدا داد حمایت اور امداد حاصل ہے۔ان کی نسل بھی بادشاہت کے اسی نظریہ کی حامی رہی۔ مثال کے طور پر جب تیمور کے پوتے خلیل سلطان سے پوچھا گیا کہ "آپ کس حق سے سمرقند میں اپنے دادا کے جانشین مقرر ہوئے۔"تو انہوں نے جواب دیا کہ "جس خدا نے تیمور کو تخت اور بادشاہی دی ہے، اسی نے مجھے بھی اس نعمت سے نوازا۔" بہت جلد ان کے قابل اور پرجوش چچا، شاہ رخ تخت نشین ہو گئے، جنہوں نے کہا کہ "خدا لافانی ہے اور بادشاہی صرف اسی کی ہے۔ وہ (بادشاہت) دیتا ہے اور لے جاتا ہے جیسا کہ وہ چاہتا ہے۔"اس نظریہ کی تائید مذہبی دانشوروں نے بھی کی ہے، اور اس کو ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید کی درج ذیل آیت کا حوالہ دیا: 'کہہ دو اے اللہ تو جس کو چاہے ہیں بادشاہی عطا کرتا ہے، اور جسے چاہے ہیں بادشاہی چھین لیتا ہے اور جس کو چاہے عزت دیتا ہے، اور جس کو چاہے ذلت دیتا ہے۔'(آل عمران: آیت 26)

تیمور خالص فوجی اور سیاسی رہنما ہونے سے مطمئن نہیں تھا۔ ان کی پرورش اسلامی روایات میں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ شاہی عہدے کے بارے میں مذہبی نظریہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک عظیم عالم میر سید شریف کو دین محمد کے مجدد کا خطاب دے دیا۔ وہ ایسے مجددوں کی صف میں آٹھویں نمبر پر تھے۔ اس وقت تک ہر صدی میں ایک مجدد گزرا تھا۔ وقت کی ترتیب کے مطابق پچھلے سات مجددوں میں عمر عبدالعزیز، مامون، مقتدر باللہ، آزادالدّولہ، سلطان سنجر، غزن خان اور الجیتو خان شامل ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تیمور اور شاہ رخ مرزا نے سابقہ خلفاء کی طرح مسجد میں اپنے نام سے خطبہ پڑھایا۔

11.3.3 سیاسی ساخت کی نوعیت (Nature of Political Structure)

کیا وسطی ایشیا کے تیموری حکمرانوں کی سیاسی ساخت مرکزی نوعیت کی حامل تھی؟ کچھ دانشوروں کا خیال ہے اس میں مرکزی نوعیت کے غالب رجحانات پائے جاتے تھے۔ لیکن اس نظریہ کو دوسرے دانشوروں نے مسترد کیا ہے۔ مؤخر الذّکر بیان کرتے ہیں کہ منگول سیاست کے قبائلی کردار سے مطلق العنانیت کی ترقی ممکن ثابت نہ ہو سکی۔ چنگیز خان کی سلطنت کا تعلق حکمراں سے نہیں بلکہ حکمراں خاندان سے تھا۔ لیکن بعض دانشور لکھتے ہیں کہ جب تیموری ریاست زوال اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی، تب بھی اس میں مطلق العنان بادشاہت کی روایات جاری رہی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تیموری سیاست مطلق العنانیت سے متاثر تھی اور اس میں معمولی انحراف یا استثنیٰ اس کی بنیادی حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتی ہے۔

11.3.4 جانشینی کا رواج (Tradition of Succession)

جب چنگیز خان نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا، انہوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ بادشاہوں کے بیٹوں اور پوتوں میں سے کوئی بھی ان کا جانشین بن سکتا ہے بشرطیکہ ایسا شخص اس عہدے کے لائق ہو۔ خان کی طرف سے اہلیت یا قابلیت کی بنیاد پر نامزدگی کا یہ نظام تیموریوں تک جاری نظر آتا ہے۔ خان کی نامزدگی کا احترام ہمیشہ نہیں کیا جاتا تھا، لیکن کسی شخص کی اہلیت اسے ہمیشہ اس قابل بناتی تھی کہ وہ خود اپنی حیثیت برقرار رکھے۔ چونکہ تخت نشینی کے لیے قابلیت معیار بن گئی، اس لیے بہت سے شہزادے حکومت حاصل کرنے کی خواہش میں پرجوش

ہو گئے۔ نتیجتاً وسطی ایشیا اور مغل ہندوستان میں بھی خانہ جنگی، خواہر کشی اور بغاوت ایک معمول بن گئی۔ پرانے ترک اور منگول روایت کے مطابق بادشاہت صرف حکمراں کے بیٹوں کے لیے مخصوص نہیں تھی۔ بلکہ حکمراں کے پوتوں اور چچاؤں تک اس موقع کی فراہمی کے ساتھ ہی خواہشمندوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ اس طرح، قابل قدر شخصیت یا مقبول حمایت جانشینی کے مسئلے کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ پھر بھی جانشینی کے سوال کو قرولتائی (شہزادوں اور امراء کی مجلس) سے باضابطہ طور پر توثیق کرنی پڑتی تھی جو تمام معززین کی جانب سے رضامندی اور قبولیت کی یقین دہانی کی علامت ہوتی تھی۔

11.3.5 مرکز اور ریاست کے درمیان تعلقات (Relations between the Center and the State)

بادشاہ انتظامیہ کا محور تھا۔ سلطنت کے طول و عرض میں بادشاہ کے نام سے خطبہ پڑھا جاتا تھا اور ان کے نام پہ سکے اجرا کئے جاتے تھے۔ صوبائی حکمرانوں کی تقرری بادشاہ خود کرتا تھا۔ ان پر لازم تھا کہ وہ بادشاہ کے بنائے ضوابط اور احکامات کے مطابق کام کریں۔ صوبائی حکمرانی اور زمینی عطیات شاہی خاندان کے لیے آمدنی کے ذرائع کے طور پر کام کرتے تھے۔ اس کے باوجود، بنیادی اختیارات بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ صوبائی حکمرانوں کو بادشاہ کے محصولات کی وصولی میں مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ ان اہداف اور دیگر انتظامی مقاصد کے لیے، مختلف علاقوں میں خصوصی نائب مقرر کیے گئے تھے۔ کسی خاص وقت پر خان کے حکم کی تعمیل میں ناکامی اور فوجی یا مالی ذمہ داری انجام نہ دینا صوبائی حکمراں کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ انہیں بیرونی طاقتوں کے ساتھ سفارتی تعلقات رکھنے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن کچھ فیصلے جیسے جنگ کا اعلان یا معاہدے پر دستخط کرنا بادشاہ کے ہاتھ میں تھا۔ بادشاہ کو ریاستوں کے مابین جھگڑوں میں مداخلت کرنے اور نااہل صوبائی حکمراں منتقل یا معزول کرنے کا بھی اختیار تھا۔ اس طرح ایسا لگتا ہے کہ سلطنت کی تقسیم کاری انتظام کو آسان بنانے اور شہزادوں کے درمیان حکمرانی کے عزائم کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھا۔ ان تمام باتوں سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چنگیزی یا تیموری سلطنت کا بادشاہ سلطانوں میں سے ہی ہوا کرتا تھا۔

11.3.6 امراء (Nobles)

امراء کو بادشاہت کی طاقت کا اصل ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ نئے خان کی تخت نشینی کے وقت، امراء کو بادشاہ کے وفادار اور تابعدار رہنے کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔ تیمور کی وفات کے بعد متعدد تیموری امرا چونکا دینے والی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں کسی کو یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ تیموری نظام میں کچھ موروثی کمزوریاں تھیں، جس کی وجہ سے مرکزی ایشیا کے اقتدار میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی۔ ترک اور منگول سیاسی ڈھانچہ اس طرح قائم گیا تھا کہ امراء اپنی مشروط مراعات کے باوجود بھی خان کے تابع رہے۔ اس کے باوجود، بعض علماء کا خیال ہے کہ امراء کے ایک بڑے طبقے میں موروثی مراعات کے پھیلاؤ نے منگول سلطنت میں مطلق العنانیت کے فروغ کی حوصلہ شکنی کی۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ Transoxiana کے بہت سے حکمرانوں نے وقتاً فوقتاً اپنے پسندیدہ امیروں کو خصوصی حیثیت دی تھی، جن میں بعض کے مراعات موروثی تھے؛ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے مراعات صرف اور صرف باہمی طور پر امراء ہی حاصل کرتے تھے۔ کسی بھی خلاف ورزی کی صورت میں، یہ مراعات ہمیشہ واپس لیے جاتے تھے۔ ہر نیا بادشاہ اپنے پیشروؤں کی طرف سے دیئے گئے مراعات کی

تجدید کر سکتا تھا یا روک سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ چنگیز خان نے اپنے ضابطے میں ایک جملہ بیان کیا تھا جس کے تحت خصوصی حیثیت حاصل کرنے والے اشراف کو صرف نو جرموں کے لیے معاف کیا جا سکتا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ امراء پر اپنا مکمل اختیار استعمال کر سکتا تھا۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں جہاں امراء اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور موروثی مراعات سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے لیکن انہیں کبھی برطرف، پھانسی، سزا، جرمانہ یا ملک بدر بھی کیا جاتا تھا۔

11.4 مغل ریاست کا نظریہ اور اس کی ترقی

(Theory of the Mughal State and Its Development)

جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی اسلامی ریاستوں کے سیاسی نظام میں ایک اہم خامی تصوّر کی جاتی ہے۔ لہٰذا، جانشینی کے وقت اکثر تشدد اور خونریزی ہوتی تھی۔ اس کمی کی وجہ سے متعدد سیاسی نظریات کی ترقی ہوئی جو بادشاہت کے ادارے کو محفوظ اور برقرار رکھنا چاہتے تھے، اور اسے قانونی حیثیت دینے کی کوشش کرتے تھے۔ بادشاہت کے بارے میں نظریات کی اس طویل فہرست میں خلیفہ کے ادارے کو پہلی پیشرفت سمجھا جاتا ہے۔ تیرھویں صدی میں جب کئی اسلامی ریاستیں وجود میں آگئی، تو خلیفہ نے ان کے نام منشور اجرا کر کے ان کی سیاسی حیثیت کو تسلیم کیا۔ بالآخر اس عمل کے ذریعے خلافت کو موروثی ادارے میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ نصیر الدّین طوسی اور جلال الدّین دوانی جیسے دانشوروں نے نظریۂ ملوکیت کے ساتھ اقتدار، انصاف اور اسلام کی حمایت کو جائز عوامل کے طور پر پیش کیا۔

11.4.1 بابر اور ہمایوں (Babur and Humayun)

اس حصے میں ہم بابر اور ہمایوں کے دور میں مغل بادشاہت کے تصوّر کی ترقی پر روشنی ڈالیں گے: اگلے حصّے میں اکبر کے دور میں اس کے عروج کی وضاحت ہوگی؛ اور اس کے بعد جہانگیر سے لے کر اورنگزیب تک اس نظریۓ میں واقع ہوئی تبدیلیوں پر بحث کی جائے گی۔

بعض مورخین کا کہنا ہے کہ تیموری نظریۂ بادشاہت ترک اور منگول حکومت سے متاثر تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ تیموری حکمراں مطلق العنان تھے اور تیموری ریاست انتہائی مرکزی نوعیت والی ریاست تھی۔ وہ مغلوں سے زیادہ افغان حکومتی ڈھانچے کو برتر سمجھتے ہیں جس نے سلطنت کو مختلف علاقوں پر مشتمل ایک قبائلی وفاق میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن بعض لکھتے ہیں کہ یہ مطلق العنانیت اور انتہائی مرکزی نوعیت صرف ابتدا میں تھی جو بعد میں کم ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جہاں تک مغلیہ سیاست کی مطلق العنان نوعیت کا تعلق ہے، بابر کی تخت نشینی تک کسی تیموری حکمراں نے 'خاقان' کا لقب اختیار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ منگول نظریۂ بادشاہت کے مطابق سلطنت حکمراں کے بیٹوں کے درمیان تقسیم کی جاتی تھی۔ لیکن بابر نے کبھی بھی اس نظریہ کو منظور نہیں کیا۔ جب حسین مرزا کی وفات کے بعد ان کے دونوں بیٹوں نے خود مختار اختیارات کا اشتراک کیا، تو بابر نے اس پر حیرت کا اظہار کیا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے امراء کے ساتھ خود مختاری کا اشتراک کرنے کے خیال کو مسترد کر دیا۔

بابر کا نقطۂ نظر مذہبی سے زیادہ عملی اور سیاسی تھا۔ بابر خود بادشاہت کے موروثی حق میں یقین رکھتا تھا۔ سلطان سعید کے نام ایک خط میں بابر نے بدخشاں کی جانشینی کے حوالے سے 'وراثتی حقوق' پر زور دیا۔ انہوں نے بنگال کے اس رواج پر حیرت کا اظہار کیا جس کے مطابق کوئی بھی شخص جو حکمراں کو قتل کر سکتا ہے، وہ بادشاہ بن سکتا ہے۔ دہلی کے کچھ ترک سلطانوں کے برعکس، بابر سماجی تھا اور اپنے افسران کے ساتھ آزادانہ طور پر گھل مل جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے عہدیداروں کی سماجی دعوتیں بھی قبول کرتا تھا۔ 1529 میں ہمایوں کے نام لکھے گئے خط میں بابر نے نظریۂ بادشاہت کے بارے میں اپنی حتمی رائے کا خلاصہ پیش کیا کہ بادشاہ صلاح کاروں سے صلاح لیں، ہر بات کا تصفیہ کریں اور خیر خواہوں کے ساتھ مشورہ کریں۔ جہاں تک خود بابر کا تعلق ہے، وہ اختیارات کی تقسیم کا خیال پسند نہیں کرتے تھے۔

ابتدائی مرحلے میں مغلوں نے اپنے آپ کو منگول اثرات سے الگ تھلگ نہیں کیا۔ بے شک منگول نظریۂ بادشاہت کو بابر کی وفات کے فوراً بعد ہمایوں نے عملایا، لیکن یہ عمل ناکام ثابت ہوئی۔ 1556 میں اشتر گرام (Ushtargram) کی لڑائی میں اکبر اور کامران کی ایک بیٹی کو تخت پر بٹھایا گیا، لیکن یہ ایک قلیل المدت ہنگامی قدم تھا۔ بہر حال، دہلی میں اپنے قدم جمانے کے بعد بابر نے 'بادشاہ' کا لقب اختیار کیا، جو ایک ترک لقب ہے۔ اسی طرح، ہمایوں نے اپنی بادشاہت ایک دن کے لیے کسی آب بردار شخص (جس نے ہمایوں کی جان بچائی تھی) کے سپرد کی تھی۔ اس آب بردار شخص نے ہر ایک کو جو چاہا دیا اور متعدد تقرریاں عمل میں لائی۔ ہمایوں کی طرف سے شکر گزاری کے اس عجیب و غریب اظہار کا اسلامی قانون، تیموری اصول اور دہلی سلطانوں کے روایات میں کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ حالانکہ کامران نے اسے منظور نہیں کیا اور ہندل نے آب بردار کی عدالت میں حاضری نہیں دی، کیونکہ کامران بیمار تھے، ہندل الوار چلے گئے تھے اور غالباً اسکری نے دوسرے تیموری امرا کی طرح اس میں شرکت کی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغل بادشاہ بادشاہت کو ذاتی ملکیت سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ امراء کی نام نہاد موروثی مراعات کے لیے بھی حکمراں کی منظوری ہونی چاہئے۔ ایسے مراعات کی تجدید ہر نیا جانشین کرتا تھا۔ لہذا، یہ اندازہ لگانا درست نہیں ہے کہ امراء کے ایک بڑے طبقے میں موروثی مراعات کے پھیلاؤ نے ابتدائی مغل حکومت میں مطلق العنانیت کے فروغ کی حوصلہ شکنی کی۔ بعد میں، بابر اور ہمایوں دونوں نے چغتائی ضابطہ قوانین (تورا) کا احترام کیا جو ایک وقت میں ایک سے زیادہ حکمرانوں کے تصور کو ناپسند کرتا تھا۔

ہمایوں کے ذہن میں ایک صوفیانہ جھکاؤ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ غیر معمولی دنیا حقیقت کا صرف ایک سایہ ہے جسے انسانی آنکھ عام طور پر نہیں دیکھ سکتی ہے۔ وہ بھی بہت سے تیموریوں کی طرح علم نجوم پر یقین رکھتے تھے۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے وہ مانتے تھے کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے؛ اور اس لیے بادشاہ سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ رعایا کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرے، جیسا خدا اپنی مخلوق کے ساتھ کرتا ہے۔

الغرض، ہمایوں کے ذاتی عقائد نے ایک نظریہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا جس میں مختلف طریقوں سے اظہار خیال پایا گیا۔ وہ علویت اور علم نجوم میں دلچسپی رکھتے تھے اور ایک متقی مسلمان کی طرح بادشاہ کو 'زمین پر خدا کا سایہ' تصوّر کرتا تھا۔ وہ مانتے تھے کہ سورج طبعی دنیا کا محور ہے اور بادشاہ کو سورج سے موازنہ کر کے بتایا کہ وہ دنیائے فانی کا مرکز ہے۔ ہمایوں نے نئے عدالتی طریق کار اور تقاریب کا بھی تعین

کیا جس سے بادشاہ کی حیثیت میں اضافہ ہوا۔ یہ عقیدہ کہ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے خواندمیر کی تحریر کردہ اس دور کی سرکاری تاریخ میں ظاہر ہوتا ہے۔ مورخ اپنی کتاب میں ہمایوں کو بادشاہ، خدا کا سایہ اور حضرت بادشاہ ظل الٰہی کے القاب سے موسوم کرتا ہے۔ بادشاہت کے بارے میں ہمایوں کا تصور یہ تھا کہ بادشاہت بادشاہ کی 'ذاتی ملکیت' ہے جسے وہ جس کو چاہے عطا کرسکتا ہے۔ ہمایوں کے نظریۂ بادشاہت میں بادشاہ کی مرضی کے سامنے امراء کے سر تسلیم خم کرنے کی مثال بھی شامل تھی۔ تاہم، حقیقت میں ہمایوں اپنے امراء سے مکمل وفاداری اور تابعداری کا حکم دینے کے قابل نہیں تھا۔ اگرچہ ہمایوں کو 'روحانی اور دنیاوی بادشاہت کی شخصیت' کے طور پر سمجھا جاتا تھا اور مغل خود کو دیگر عصری سیاسی طاقتوں جیسے ازبک، صفوی، عثمانی، وغیرہ، سے برتر سمجھتے تھے؛ لیکن تیموریوں کے پاس کوئی خاندانی اور مذہبی نظریہ نہیں تھا جس کے ذریعے وہ عوام کو تخت وتاج کی مکمل تابعداری میں لاسکے۔

11.4.2 اکبر (Akbar)

ابوالفضل نے 'آئین اکبری' لکھتے ہوئے اکبر کے اعمال کو درست ثابت کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ بے شک ابوالفضل اور دیگر دانشوروں نے بادشاہت کے ادارے کا جواز پیش کیا، یہ ادارہ پہلے ہی اسلامی تہذیب میں داخل ہو چکا تھا۔ لیکن مذہب اسلام کے مطابق بادشاہت اللہ کی ہے اور حکمراں زمین پر اللہ کا بندہ ہوتا ہے۔ تاہم، ابوالفضل نے نظریۂ بادشاہت پر اپنی تازہ ترین تشریح دینے کی کوشش کی۔ ابوالفضل نے اپنی بحث کا آغاز بادشاہ کے وجود کی ضرورت سے شروع کیا۔ انہوں نے انسان کی شریر فطرت کو قیاس کیا اور کہا کہ لالچ، خود غرضی اور ہوس انسان کو بگاڑ کی طرف مائل کرتی ہے۔ چنانچہ ابوالفضل کے نزدیک بادشاہت ایک ضرورت ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اگر بادشاہت نہ ہوتی تو جھگڑوں کے طوفان کبھی تھمتے نہیں اور نہ ہی خود غرضی کے عزائم ختم ہوتے۔" انسانیت لاقانونیت اور ہوس کے بوجھ تلے دب کر تباہی کے گڑھے میں دھنس جاتی؛ اور یہ عظیم دنیا اپنی خوشحالی کھو دیتی اور پوری زمین بنجر میں تبدیل ہو جاتی۔ اس کے برعکس، بادشاہت ریاست کو امن اور استحکام فراہم کرتا ہے۔

یہاں ابوالفضل واضح طور پر اپنی تشریح مہابھارت سے اخذ کرتا ہے۔ مہابھارت میں بھیشم نے دور ماضی میں بنی نوع انسان کے درمیان نظم وضبط کی عدم موجودگی سے بادشاہی کی ابتداء کا پتہ لگایا۔ بغیر بادشاہت کے لوگ ایک دوسرے کی املاک کو ہڑپ کر کے تباہی سے دوچار ہوئے تھے، جیسے پانی میں طاقتور مچھلی کمزور کو کھا جاتی ہے۔ اس سلسلے میں لوگ اکٹھے ہوئے اور باہمی سمجھوتے کے ذریعے زیادتیوں کو روکنے کی کوشش کی۔ جب یہ کوشش ناکام ہوئی تو انہوں نے خالق کائنات برہما سے دعا کی کہ وہ ان کی حفاظت کرے۔ اس طرح ایک بادشاہ وجود میں آگیا جس نے بدکاروں کے دلوں میں دہشت پھیلا کر اور لوگوں کو دھرم کی پیروی کرنے پر مجبور کر کے نظم وضبط بحال کیا۔ اس طرح ابوالفضل کا نظریہ، کہ بادشاہت ایک ضرورت ہے اور ریاست کو امن اور استحکام بخشتا ہے، مہابھارت سے مماثلت رکھتا ہے۔

اسلام میں، حکمراں عوام کا مالک یا آقا نہیں ہوتا ہے، بلکہ صرف ایک امانت دار ہوتا ہے۔ تاہم ابوالفضل بادشاہ کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ "خدا کی نظر میں بادشاہت سے زیادہ کوئی وقار نہیں ہے، کیونکہ بادشاہت بغاوت کے جذبے کو کمزور

کرتی ہے ....۔'' لفظ بادشاہ کے معنی بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ 'پاد' کا مطلب 'استحکام' اور 'شاہ' کا مطلب 'بنیاد یا منبع' ہے۔ لہذا، لفظ 'بادشاہ' کا مطلب 'استحکام کی بنیاد' ہے۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ " بادشاہت خدا کی طرف سے نکلنے والی روشنی، اور سورج سے نکلنے والی ایک کرن ہے۔ جدید زبان اس روشنی کو فرّہ ایزدی (نور خدا) کہتی ہے اور قدیم زبان اسے کیان خورہ (پر جلال مقدس نور) کا نام دیتی ہے۔ یہ روشنی کسی کی مدد کے بغیر خدا کی طرف سے بادشاہ تک پہنچائی جاتی ہے۔ اس نور کے ذریعے، بہت سی عمدہ خوبیاں، مثلاً رعایا کے لیے پدرانہ محبت، خدا پر بھروسہ، دعا، عقیدت، وغیرہ، بادشاہ کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ "شاہی محراب کا شمسہ ایک خدائی روشنی ہے، جسے خدا براہ راست بادشاہوں کو منتقل کرتا ہے۔" اسی لیے، اللہ کی رضا کے مطابق بادشاہ مقرر ہوتا ہے، اس کی رہبری ہوتی ہے اور اسے تحفظ ملتا ہے۔ ابوالفضل کا خیال ہے کہ خدا بادشاہت ایک ایسے شخص کے سپرد کرتا ہے جو ہزار خوبیوں کا مالک ہو۔ ان کے نظریات ہندوستانی علم الاصنام (mythology) سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں اس کا اندازہ مہابھارت میں تفصیل سے دی گئی درج ذیل مثال سے کیا جاسکتا ہے۔ مہابھارت کی ایک کہانی کے مطابق پریتھو (Prithu)، جو حکمرانوں کی ساتھویں نسل سے تعلق رکھتا تھا، کے دور میں بادشاہت وجود میں آگئی۔ پریتھو کی بادشاہت اس وقت منظور ہوئی جب وشنو نے خود ان کی حیثیت قبول کی۔

لہذا، پریتھو کی طرح ابوالفضل کے بادشاہ کو بھی وہ خدائی عناصر مل گئے ہیں جن کی مدد سے رعایا پر اس کا اختیار حاصل ہو گیا۔ بادشاہت کی متعدد فطری خصوصیات ہیں جو خود بخود حکمراں میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے، ابوالفضل کے مطابق، بادشاہ نور الٰہی کی وجہ سے درج ذیل خصوصیات کا حامل ہوتا ہے:

- اپنی رعایا کے لیے بادشاہ کے دل میں پدرانہ محبت ہوتی ہے۔
- بادشاہ کا دل بڑا ہوتا ہے۔ مغل بادشاہ اکبر کہتے ہیں کہ ''ہم خدا کا سایہ ہونے کی وجہ سے کم لیتے ہیں اور رعایا کو بہت زیادہ فراہم کرتے ہیں۔ ہماری معافی میں انتقام کا کوئی سوال نہیں ہو سکتا۔
- بادشاہ کا خدا پر بھروسہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ جب وہ کوئی کام انجام دیتا ہے تو وہ خدا کو اس کا حقیقی کارساز سمجھتا ہے، تاکہ محرکات کا تضاد کوئی خلل پیدا نہ کر سکے۔
- نہ ان کے منصوبوں کی کامیابی اور نہ ہی کوئی مصیبت یا افتاد اسے خدا کو بھولنے اور انسان پر بھروسہ کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔

اس دور میں ابوالفضل اپنا نظریہ تحریرات کے ذریعے بیان کرتا رہا، جب اکبر کو یہ احساس ہوا کہ ہندوستان میں ایک کامیاب بادشاہ کو اپنی رعایا کی برابری تسلیم کرنی چاہیے اور ان کی سلطنت میں نسل اور مذہب کی ترجیح ختم ہو جانی چاہیے۔ ابوالفضل کے اس معیار نے ایک پیچیدہ مسئلہ کھڑا کیا۔ ایک طرف وہ اکبر کو راہ راست سے بھٹکے ہوئے شخص کے طور پر پیش نہیں کر سکتا تھا، اور دوسری طرف، ان کا مثالی بادشاہ کسی مذہب کی مقرر کردہ حدود کا پابند نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے، ابوالفضل نے یہ نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ بادشاہ کو دلیر، انصاف پسند، مہربان اور معاف کرنے والا ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی اختلافات سے بالاتر ہونا چاہیے۔ تمام لوگوں کو ان پر اعتماد اور بھروسہ کرنا چاہیے، تاکہ خُدا کا سایہ (بادشاہ) جلال حاصل کر سکے۔ ان کو اپنی رعایا کے ساتھ مسلسل بڑھتی ہوئی محبت کا اظہار کرنا چاہیے اور مناسب کام کرنے کے لیے غور و

فکر کرنا چاہیے۔ ان کو اندھی تقلید سے نفرت ہونی چاہیے۔ ان کے ذہن میں استفسار کی محبت ہمیشہ مقدم رہنی چاہئے، اور عقل اور دلیل پرستی ان کی رہنما ہونی چاہئے۔ اس طرح اسلام کے متعین حدود کو دھکیل کر بادشاہ کو مذہبی پابندیوں سے آزاد کر کے اس کی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کیا گیا۔ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ "ان خوبیوں کے باوجود بادشاہ اپنے بلند منصب کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا ہے اگر وہ عالمگیر امن (صلحِ کل) کا افتتاح نہ کر سکے اور انسانیت کے تمام حالات اور مذہب کے تمام فرقوں کو یکساں درجہ نہ دے سکے۔ انہیں کسی کی ماں اور دوسروں کی سوتیلی ماں نہیں بننا چاہیے ورنہ وہ اعلیٰ شان کے لائق نہیں ہوگا۔ چونکہ خدا تمام ارواح پر فضل اور کرم کرنے والا ہے۔ اس لیے یہ مناسب ہے کہ ظلِ الٰہی (خدا کا سایہ) سب کے ساتھ صلح کے اصول قائم رکھے۔

حقیقی بادشاہ کا مقصد ظلم ختم کرنا، ضروری چیزیں مہیا کرنا اور اپنے آپ کو مادیت کے لگاؤ سے دور رکھنا ہے۔ ایک سچے بادشاہ کے اس رویے کے نتیجے میں سماجی نظام میں سلامتی، صحت، عفت، عدل، شائستگی، وفاداری اور سچائی پھیل جاتی ہے۔ دوسری طرف، ایک خود غرض حکمراں بیرونی طاقتوں، باطل، لوگوں کی غلامی اور عیش و عشرت کی خواہشات کے ذریعے مضبوط بندھنوں میں جکڑا جاتا ہے۔ اس لیے ہر طرف عدم تحفظ، بدامنی، لڑائی جھگڑا، مخالفت اور لوٹ مار ظاہر ہوتا ہے۔ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ کسی مخصوص دور کی حالت کا انحصار بادشاہ کی اہلیت پر ہوتا ہے۔ یہ نظریہ مہابھارت کے زمانے میں 'راج کالسیا کرنم' کے نام سے ہندوستانی سیاسی فکر میں موجود تھا۔ 'راج کالسیا کرنم' سے مراد یہ ہے کہ کسی دور کی ترقی کا دار و مدار موجودہ حکمراں پر ہوتا ہے۔ سوکرانتیسارا (Sukrantisara) کے مصنف نے بھی اسی خیال کو "یوگپرورتکو راجا" (*Yugapravartako Rajah*) کے فقرے میں متعارف کیا ہے۔ چونکہ یہ دعویٰ کرنا جلد بازی ہوگی کہ ابوالفضل نے یہ خیال مہابھارت سے لیا ہے، مگر خیالات میں مماثلت اس سمت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ان کے خیالات کی حوصلہ افزائی کا ذریعہ کیا تھا۔

بادشاہ کی سرگرمیوں سے متعلق ابوالفضل کا نظریہ

اس کے علاوہ، ابوالفضل نے اس طریق کار کی بھی وضاحت کی جس سے بادشاہ اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ بادشاہ مطلوبہ مقاصد کو پانچ اقسام کے انسانی کردار کی صحیح تفہیم، چار حصوں میں تقسیم ریاستی ملازمین کا منصفانہ انتخاب اور چار حصوں پر مبنی سیاسی وجودوں کی تنظیم سازی میں مناسب توازن برقرار رکھ کر حاصل کر سکتا ہے۔

انسانی کردار کے پانچ اقسام

ابوالفضل بیان کرتے ہیں کہ سب سے زیادہ قابل ستائش انسان وہ ہے جو عقلمندی سے وہ کام کرتا ہے جو مناسب اور بالکل ضروری ہو۔ دوسرا نیک نیت آدمی ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہمدردی اور احترام کا اظہار کرنا مناسب ہو سکتا ہے، پھر بھی وہ اتنے زیادہ اعتماد کا مستحق نہیں ہے۔ تیسرا وہ سادہ آدمی ہے جو اپنے عمل کی آستین پر برتری اور بلندی کے نشان نہیں لگاتا، لیکن اپنے لباس کو برے اعمال کی دھول سے پاک رکھتا ہے۔ چوتھا وہ بے فکر اور بے پرواہ آدمی ہے جو دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی شوخی کے لیے اپنے گھر کو ضرورت کی چیزوں سے بھرتا ہے۔ اور سب سے آخری وہ برا انسان ہے، جس کے کالے کرتوت دوسروں کو ڈراتے ہیں اور پوری دنیا کو رنج والم میں ڈال دیتے ہیں۔

ابوالفضل کے مطابق، ایک حقیقی بادشاہ کو اپنی بصیرت سے لوگوں کے کردار سے آشنا ہونا چاہیے اور پھر اس کے مطابق ریاستی کاروبار کو منظم کرنا چاہیے۔

چار حصوں میں تقسیم ریاستی ملازمین

اس میں ریاست کے امراء، فتوحات کے معاون، حکمراں کے ساتھی اور ان کے نوکر شامل ہیں۔ ریاست کے تئیں عقیدت اور دشمنوں سے نمٹنے میں امرا کا موازنہ آگ (fire) سے کیا گیا ہے۔ فتوحات کے معاون محصولات جمع کرتے ہیں اور انتظامیہ میں ان کا موازنہ ہوا (wind) سے کیا گیا ہے۔ بادشاہ کے ساتھیوں کو ان کی حکمت کی روشنی، ان کی تیز نظر، ان کے علم، انسانی فطرت سے ان کی گہری واقفیت اور ان کی بے تکلفی کی وجہ سے دربار کی زینت سمجھا جاتا ہے۔ اپنے دانشمندانہ عزائم کی وجہ سے، وہ اپنی حکمت کی بارش سے غضب کی چنگاری کو بجھا دیتے ہیں، اس لیے ان کا موازنہ پانی (water) سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ، نوکر دربار میں اپنے فرائض انجام دیتے ہیں اور سیاسی وجود کے لیے شربت کی طرح کام کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا موازنہ زمین (earth) کے ساتھ کیا گیا ہے۔

سیاسی وجود کے چار اجزاء

ابوالفضل نے لوگوں کو ان کے پیشے کی بنیاد پر چار قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا طبقہ جنگجوؤں کا ہے جن کا سیاسی وجود میں آگ (fire) سے موازنہ کیا جاتا ہے۔ وہ اضطراب کے عالم میں ریاست کے لیے سکون اور آسائش کا چراغ جلاتے ہیں۔ دوسری قسم فنکاروں پر مشتمل تھی۔ وہ ریاست میں لوگوں کو سہارا دیتے ہیں، اس لیے ان کو ہوا (wind) سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تیسری قسم میں فلسفی، طبیب، ریاضی دان، ماہر ہندسہ اور ماہر فلکیات شامل ہیں جن کا موازنہ پانی (water) سے کیا گیا ہے۔ ان کے قلم سے خشک سالی کے دنیا میں حکمت کا دریا بہتا ہے، جس کی وجہ سے کائنات کے گلستاں کو سیرابی سے عجیب وغریب تازگی حاصل ہوتی ہے۔ چوتھی قسم کسانوں اور مزدوروں کی تھی جن کا موازنہ زمین (earth) سے کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی کوششوں سے ریاست میں کمال، طاقت اور خوشیاں لائی۔

اس لیے، ابوالفضل کے مطابق، ریاست ایک نامیاتی (organic) جسم کی مانند ہے اور چار عناصر پر مشتمل ہے جو جسم کی دیکھ بھال کے لیے یکساں طور پر اہم ہیں۔ انہوں نے تمام پیشوں کی برابری کو سامنے لایا، کیونکہ چاروں عناصر ضروری تھے اور چوتھے کی عدم موجودگی میں کوئی بھی فعال نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا بادشاہ پر واجب ہے کہ وہ ان میں سے ہر ایک کو صحیح مقام عطا کرے اور اپنی ذاتی صلاحیت کو دوسروں کے احترام کے ساتھ دنیا کو پھلنے پھولنے کا باعث بنے۔ یہاں ابوالفضل نے اکبر کو ایک مثالی حکمراں سمجھا جس میں انہوں نے ایک عادل اور سچے بادشاہ کے وہ تمام تقاضے دریافت کیے جو بادشاہ کی خداداد قابلیت کا ثبوت ہے۔

حکمراں کو ہر طبقے کے لوگوں پر مکمل اختیار دے کر اور حکمراں کے خدائی صفات کا پتہ لگا کر، ابوالفضل نے یقیناً اپنے بادشاہ کو مطلق العنان بنا دیا۔ لیکن انہوں نے کبھی اپنے مثالی بادشاہ کو اپنے خیالات اور ریاستی امور کے عمومی طرز عمل میں فرقہ وارانہ ہونے کا مشورہ نہیں دیا۔

وہ لکھتے ہیں کہ تمام مطلوبہ خوبیوں کے باوجود بادشاہ کے لیے موزوں نہیں ہے کہ وہ عالمگیر امن کا افتتاح اور تمام مذاہب کے ساتھ حسن سلوک نہ کرے۔

ہندو مصنفین کے برعکس، ابتدائی مسلمانوں نے کبھی کسی انسان میں خدائی عنصر کو تسلیم کرنے کی بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ اسلامی عقائد کے مطابق خلیفہ مسلم عوام کی مرضی کے مطابق ہی تخت پر فائز ہوتا ہے۔ لیکن ابوالفضل لکھتے ہیں کہ بادشاہ رضائے الٰہی سے اس عہدے پر فائز ہوتا ہے۔ اس لیے، حکمراں کی بادشاہت میں عظمت اور حکمرانی کا حق شامل ہے۔ اس طرح، ابوالفضل کا نظریہ مطلق العنان تھا، جب کہ اسلامی نظریۂ خلافت ایک جمہوری تصوّر ہے۔ خلیفہ کا مقصد پیغمبر اسلام کے پیغام کی تبلیغ کرنا تھا، لیکن ابوالفضل کے نظریۂ بادشاہت کا مقصد ان کے اقتدار میں موجود مختلف مذاہب اور عقائد کے درمیان خیر خواہی، ہم آہنگی اور امن کو برقرار رکھنا تھا۔ خلیفہ نے مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان ابدی فرق کو برقرار رکھنا تھا، لیکن ابوالفضل کا نظریۂ بادشاہت انہیں ایک ہی مقام دیتا ہے۔ لہذا، یو۔ این۔ ڈے کے مطابق، بظاہر یہ اختلافات اسلام مخالف لگ سکتے ہیں، لیکن صحیح معنوں میں وہ اسلام کے خلاف نہیں ہیں۔ کیونکہ اسلام کی تبلیغ کرتے وقت پیغمبر اسلام اپنے نقطۂ نظر میں اتنے قدامت پسند، فرقہ وارانہ اور تنگ نظر ثابت نہیں ہوئے جتنا کہ بعد میں علماء اور فقہاء نے اس کی تشریح کی۔ ابوالفضل نے بادشاہت کے لازمی اصولوں میں تقلید سے نفرت کی بات کی۔ انہوں نے مزید کہا کہ "تحقیق کی محبت ہمیشہ ان کے اعمال پر مقدم رہنی چاہئے اور ان کو ہمیشہ ثبوت کی تلاش میں رہنا چاہئے تا کہ وہ کثیر تعداد کے نقطۂ نظر کو دیکھ کر صحیح راستے سے ہٹ نہ جائے۔" ان کے ایسے بیان نے ابن حسن اور ترپاٹھی کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ ابوالفضل کا بادشاہ مذہبی قانون سے بالاتر تھا۔ چنانچہ ابن حسن کہتے ہیں کہ ابوالفضل کو مذہب کے بارے میں ایسا تحریر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ ان کو اقتدار کے زیر اثر نہ آکر تحقیق کرنی چاہئے اور وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ لہذا، اسلامی قانون اور حدیث دونوں ان کی حکومت کے ضابطے میں شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح، ترپاٹھی لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کے مذہبی قوانین پر ابوالفضل خدا کی مرضی کو فوقیت دیتا ہے جو بادشاہت کے اداروں میں ظاہر ہوتی ہے۔" الغرض، ایک قانون پر یقین رکھتا ہے جیسا کہ قرآن و حدیث اور دیگر ماخذات میں بیان کیا گیا ہے، جب کہ دوسرا خدا کے قانون پر ایمان رکھتا ہے جیسا کہ ایک حقیقی حاکم اس کو سمجھتا ہے۔

تاہم، یہ بتایا جاسکتا ہے کہ اکبر نے کبھی بھی قرآنی قوانین میں دیے گئے کسی حکم کی براہ راست خلاف ورزی نہیں کی۔ مظہر کے اعلان نے قرآن و حدیث سے افضل کوئی متبادل پیش نہیں کیا۔ ابوالفضل کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بادشاہ اپنے آپ کو علماء کے زیر تسلط نہ ہونے دے۔ دراصل ابوالفضل اسلامی قانون کی اصل روح کو سمجھ چکے تھے اور اسلام ان چیزوں کا مخالف تھا جو مذہب کے نام پر چل رہی تھیں۔ جہاں تک خدائی عنصر کا تعلق ہے یہ ابوالفضل کے نظریہ کے آنے سے پہلے ہی اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ عباسی دور میں جب خلیفہ کی سیاسی طاقت کمزور ہو چکی تھی، تو انہوں نے بلند مذہبی القاب کا استعمال کر کے وقتی اقتدار میں ہونے والے نقصان کی تلافی کی کوشش کی۔ لیکن عباسی خلافت کے انحطاط سے پہلے خلیفہ کو زمین پر خدا کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد طاقتور بادشاہوں اور شہنشاہوں نے بلند مذہبی القاب کا استعمال

کرنا شروع کیا۔ اس لیے ابوالفضل کے مطابق، چند راسخ العقیدہ سنی علماء کے بغیر دیگر مسلمانوں کے لیے شاید ہی یہ نظریہ ناگوار گزرا ہو۔ الغرض، ابوالفضل کا نظریۂ بادشاہت مغل، مسلمان اور ہندو تصوّرات کا مجموعہ تھا۔

اس طرح بادشاہت ایک خدائی تحفہ ہے۔ چونکہ حاکم کسی پر ماتحت نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ علماء کی طرف جواب دہ ہوتا ہے، پھر بھی ہر شخص کو ان کے تابع رہنا پڑتا تھا۔ یہ نظریہ قبل از اسلام ایرانی ساسانی تصوّر پر مبنی تھا، جسے بلبن نے بھی اپنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ابوالفضل نے اس پرانے تصوّر کو متعدد مسلم اور ہندو نظریات کے ساتھ جوڑ دیا۔ دراصل، نظریۂ بادشاہت شاہی درباروں میں بادشاہ کے اختیارات پر ناجائز تجاوز کے خلاف دفاعی طریقہ کار کے طور پر تیار کیا گیا تھا۔ 'فرۂ ایزدی' اور 'کیان خورہ' کے تصورات کا فلسفہ بادشاہ کے اختیارات میں کسی بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ حصّہ داری سے بچنا مقصود تھا۔ علاؤالدین خلجی نے 'مفاہمت کے قانون' پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی تھی۔ اکبر نے مظہر کے ذریعے (شیخ مبارک اور ان کے دو بیٹوں کی طرف سے تیار کردہ) بادشاہ کو ایک عادل حکمراں کے طور پر پیش کیا اور اسے مجتہد کا درجہ دیا؛ بلکہ اسے مجتہد سے افضل قرار دیا۔ اس طرح، عادل بادشاہ کی عقل کو قانون سازی کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

ابوالفضل کے تصوّر ریاست اور بادشاہت کو سماجی، مذہبی اور روحانی تصورات کے تناظر میں بھی دیکھا جانا چاہیے۔ قدیم ہندو روایات کی پیروی کرتے ہوئے اور جلال الدّین داوانی جیسے مسلم مفکرین سے بھی متاثر ہو کر، ابوالفضل نے انسانوں کو چار زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے زمرے میں جنگجو، دوسرے میں دستکار اور سوداگر، تیسرے میں عالم اور چوتھے میں کسان اور مزدور شامل ہیں۔ علماء یعنی مذہبی دانشوروں (براہمن اور علما) کو تیسرا درجہ دے کر، ابوالفضل نے انتہائی مغرور اور خود خیال طبقوں کا مرتبہ کم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی فکر کو موجودہ سماجی حقیقت کے مطابق بیان کیا۔ ابوالفضل نے قدیم یونانی روایت کا بھی حوالہ دیا ہے کہ انسانوں کو ان کی خصوصیات کی بنیاد پر تین حصوں (امراء، نچلا اور درمیانی طبقہ) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ امراء طبقے میں وہ بزرگ شامل تھے جو عقل، نظم و نسق، فصاحت اور بلاغت کے ذریعے مختلف ریاستی کاموں میں شرکت کرتے تھے۔ نچلے طبقے میں حجام، مسخرا، چمڑا رنگنے والے، ناچنے والے، جھاڑو دینے والے، قصاب اور ماہی گیر شامل ہیں۔ انہیں شہر کے الگ الگ مقاموں میں رہنے کے لیے جگہ دی جاتی تھی۔ درمیانی زمرے میں کاشتکار، لوہے کا کام کرنے والے، وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ، درمیانی زمرے میں وہ لوگ بھی تھے جو حسن سلوک کی وجہ سے اچھے خیالات کے حامل تھے، اور جو تمام لوگوں کے لیے سخاوت کی باتیں کرتے تھے۔

نچلے طبقے (جو جاہل کہلائے جاتے ہیں) کے بارے میں ابوالفضل کا تصوّر یہ ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر عصری اعلیٰ طبقات کے تعصبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نچلے طبقوں کو ریاستی اقتدار میں حصہ لینے کی خواہش نہیں رکھنی چاہیے اور ریاستی نظم و نسق کا کام اعلیٰ خاندانوں اور اعلیٰ ذاتوں سے تعلق رکھنے والوں کے پاس ہونا چاہیے۔ معاشرے میں برے طبقوں کا پھیلاؤ شاہی استبدادیت کا جواز تھا، کیونکہ صرف بادشاہت ہی ان طبقات کو قابو کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ، 'فرۂ ایزدی' بادشاہ کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ فرقہ وارانہ ماحول کی حوصلہ شکنی کرے اور سماجی استحکام قائم کرے۔

درجہ بندی پہ پختہ یقین کے باوجود، ابوالفضل مختلف سماجی پس منظر کے لوگوں کی قابلیت کو سراہتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکبر عمر کے جذبے سے متاثر ہوا تھا اور صلاحیت کی قدر کرتے ہوئے مختلف طبقوں کے لوگوں کو فوج میں تقرریوں کے ساتھ نوازتا تھا، اور انہیں ایک عام سپاہی سے بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرتا تھا۔ ان خیالات کا اعادہ اکبر نے شہزادہ دانیال کو اس وقت دیا تھا جب انہیں 1597-98 میں الہ آباد بھیجا گیا۔

ابوالفضل کا بنیادی تصوّر یہ تھا کہ آزاد خیال مطلق العنان حکمراں اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی خوبیوں سے مالا مال ہونا چاہئے تاکہ وہ قانونی حیثیت کے لیے کسی بھی مذہبی رہنما کے تابع نہ رہے۔ اگرچہ ابوالفضل نے ریاست اور بادشاہت کے اس تصور کو ایرانی روایات کے لحاظ سے پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سیکولر کثیر مذہبی ریاست ایک ایسی مثال تھی جو اس وقت ایشیا اور یورپ میں بھی رائج نہیں تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابوالفضل نے اپنے زمانے کی سیاست کو بیان کرنے کے لیے کہیں بھی دارالاسلام یا دارالحرب کے الفاظ استعمال نہیں کیے، کیونکہ اس طرح کے امتیازات معنی خیز نہیں رہ چکے تھے۔ جزیہ کے خاتمے کے لیے یہ ان کی طرف سے پیش کردہ جوازوں میں سے ایک ہے۔ ابوالفضل اس بات کا قائل تھا کہ اکبر کی فتوحات کی بنیاد ترقی کے جذبے پر نہیں تھی، بلکہ یہ ایک وسیع تر منصوبہ بندی کا حصہ تھا جس کی بنیاد انصاف اور رواداری پر مبنی کل ہند حکومت تھی، یا دوسرے لفظوں میں ایک ایسی ریاست جسے دارالصلح کہا جا سکتا ہے۔

جہاں تک علامتی کارروائیوں کا تعلق ہے، دارالخلافہ کی منتقلی نے اس بات کو یقینی بنایا کہ کوئی خاص جگہ بادشاہت کے لیے قانونی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ بکتر بند آدمیوں کا ایک گروہ محض شاہی محل پر قبضہ کر کے اور عوام کی حمایت حاصل کر کے تخت حاصل نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ بادشاہت شہنشاہ کے ساتھ رہتی ہے۔ فتح پور سیکری کو ایک نئے سیاسی ڈھانچے کے طور پر کھڑا کیا گیا تھا، جہاں رعایا کے داخلے پر پابندی عائد کی گئی، جب کہ شہنشاہ آزادانہ طور پر نقل و حرکت کر سکتا تھا۔ فتح پور سیکری کا انتخاب بذات خود بادشاہ کے صوفیانہ وابستگیوں نے تشکیل دیا تھا۔ اس میں مسجد، درگاہ اور عبادت خانہ جیسی عمارتیں اکبر کے راسخ الاعتقاد عناصر کے تسلط کو توڑنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ فتح پور سیکری سے اچانک دارالخلافہ کی منتقلی نے اس حقیقت کو مزید تقویت بخشی کہ بادشاہ اور سلطنت بنیادی طور پر ایک ہیں۔

11.4.3 جہانگیر (Jahangir)

حکمرانی کے بارے میں جہانگیر کا تصوّر بھی اپنے والد کے مطابق تھا۔ انہوں نے کہا کہ "بادشاہت اور عالمی حکمرانی ایسی چیزیں نہیں ہیں جو ناقص عقلوں کی فضول کوششوں سے ترتیب دی جائیں۔ وہ عادل خالق انہیں عطا کرتا ہے جسے وہ مہربان اور اعلیٰ مقام کے لیے موزوں سمجھتا ہے۔ انہیں 'دیکھے جانے کے قابل خدا' کہہ کر مخاطب کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے۔

چونکہ قانون سازی، انتظامیہ اور عدلیہ میں کوئی فرق نہیں تھا، اس لیے تمام افعال بادشاہ کے ذریعے انجام دیے جاتے تھے۔ وہ قانون سازی، انتظامیہ اور عدلیہ میں بالادست اور صاحب اقتدار تھے۔ انہیں کسی کے مشورے اور رضامندی کی ضرورت نہیں تھی، حالانکہ وہ اس کے لیے پوچھ سکتا تھا۔ جہانگیر کے بارہ احکام اور فتاویٰ عالمگیری خود بادشاہوں کے کارنامے تھے اور ان میں کسی اور کا ہاتھ نہیں تھا۔ جہانگیر کے

بارہ احکام جیسے مجرموں کی رہائی، مقررہ دنوں میں جانوروں کے ذبح کرنے پر پابندی، اسپتالوں اور سرائیوں کی تعمیر، تمغہ اور میر بحری پر پابندی وغیرہ نے اس بات کی نشاندہی کی کہ وہ لوگوں پر صحیح طریقے سے حکمرانی کرنا چاہتے تھے۔ یہ احکام انہیں ایک آزاد خیال حکمراں ثابت کرتے ہیں۔ بادشاہ نہ صرف اعلیٰ ترین انتظامی تھا بلکہ فوج کا جنرل اور امن کا محافظ بھی تھا۔ سپریم جج کی حیثیت سے، وہ نظریاتی طور پر ہر کسی کے لیے قابل رسا نہیں تھے۔

11.4.4 شاہجہاں (Shah Jahan)

راسخ العقیدہ مسلمانوں کے جذبات کو تسکین بخشنے کے لیے شاہجہاں نے شہنشاہ کے سامنے سجدہ کے عمل کو ختم کر دیا۔ شاہجہاں نے خانزادگی کے نظریے کو بھی فروغ دیا۔ خانزادگی کے تصوّر کے مطابق شاہی خاندان سے وابستہ شہزادوں کو اہم عہدوں پر فائز کیا جانے لگا۔ جیسا کہ رچرڈز نے ذکر کیا ہے کہ خانزادگی نے شاگردی (Discipleship) کے زیادہ تر اجزاء کو برقرار رکھا۔ شہنشاہ کی خدمت میں وفاداری، عقیدت اور قربانی شاگردی کے تصوّر کی اہم خصوصیات تھیں۔ لیکن خانزادگی میں مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ شدید جذباتی پہلو بھی شامل کیا گیا۔ تعلقات کی نوعیت میں اس تبدیلی کو شاید اس طرح سے وضاحت کی جاسکتی ہے کہ اس وقت تک مغل سلطنت نسبتاً مستحکم ہو چکی تھی اور اب شہنشاہ کے لیے غیر معمولی عقیدت کی ضرورت نہیں رہی، جیسا کہ اکبر کے دور میں تھی۔

11.4.5 اورنگزیب (Aurangzeb)

شہنشاہ اورنگزیب کے دور حکومت نے اکبری بادشاہت کے تصورات کو ترک کر دیا۔ اورنگزیب ایک مذہبی آدمی تھا اور وہ اپنے کردار کو صرف اسلامی تناظر میں سمجھتا تھا۔ انہوں نے بادشاہت خداوندی کے نظریے کو ترک کیا اور اپنے آپ کو تیموری نسل کے ہندوستانی مسلمان فاتحوں کی صف میں تصوّر کیا۔ اورنگزیب نے اپنے آپ کو ایک مسلمان کے طور پر دیکھا، اور اس لیے انہوں نے خالصتاً مسلم القاب کا استعمال کیا۔ اگرچہ پہلے مغل بادشاہ خود کو اپنے دائروں میں خلیفہ اور اپنے آپ کو عثمانی خلفاء سے بھی برتر سمجھتے تھے، لیکن اورنگزیب نے سرکاری طور پر تمام ریاستی دستاویزات پر 'امیر المومنین' یعنی 'وفاداروں کے سپہ سالار' کا لقب استعمال کرنا شروع کیا۔ اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خلیفہ تصوّر کیا اور اس بات پر زور دیا کہ وہ لوگوں کے دنیوی اور روحانی حکمراں ہے۔

اگرچہ اورنگزیب اپنے آپ کو مسلمان اور پیغمبر اسلام کا ایک عاجز بندہ کہتا تھا، لیکن وہ کبھی اپنے آپ کو خدا کا برگزیدہ اور لوگوں کے فائدے کے لیے پیسے کا امانت دار سمجھنے سے باز نہیں آیا۔ انہوں نے اپنے ہر عمل کو مذہب سے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن ان کے ہر عمل کے پیچھے اس کا اصل مقصد آسانی سے نظر آجاتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے شاہجہاں کو ایک خط کے ذریعے اطلاع دی کہ "آپ نے لکھا ہے کہ دوسرے کی جائیداد پر قبضہ کرنا مسلمانوں کے عقیدے کے خلاف ہے۔ جان لو کہ شاہی جائداد اور خزانے لوگوں کی بھلائی کے لیے ہوتے ہیں۔ اور بادشاہت کوئی موروثی نجی ملکیت نہیں ہوتی ہے۔" اس کے علاوہ، اورنگزیب اقتدار سے اتنا لگاؤ رکھتا تھا کہ وہ اس کی جھلک بھی کسی دوسرے کے ساتھ نہیں بانٹتا تھا۔ انہوں نے سب کو اقتدار سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ شہزادوں کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

11.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

درحقیقت، مغل بادشاہت بنیادی طور پر ترک و منگول روایات سے متاثر تھی جو وسطی ایشیا میں خاص طور پر چنگیز خان کے دور کے بعد وجود میں آگئی۔ اس میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ حکمراں کی حیثیت کیا تھی۔ کیا وہ مطلق اقتدار کی خواہش رکھتا تھا؟ کیا وہ دوسروں کو اپنا اقتدار اور اختیارات بانٹنے کی اجازت دینے کے لیے تیار تھا؟ دراصل حکمراں دوسروں کو اختیار اور اقتدار سونپتا تھا، لیکن وہ تفویض شدہ اختیار اور اقتدار ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر، متعدد مغل شہزادوں کو مختلف علاقوں کے حکمرانوں یا گورنروں کے طور پر مقرر کیا جاتا تھا۔ اس عمل کو کسی بھی طرح سے 'بادشاہت کے اشتراک' سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ بالکل ایک مختلف چیز تھی۔ اس طرح، ترک و منگول اور مغل حکمرانوں مطلق العنان بادشاہت کے اس بنیادی اصول پر سمجھوتہ کرنے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں تھے۔

مزید یہ کہ بادشاہت کے تصور میں خدائی عنصر ابتدائی زمانے سے موجود تھا۔ اس سلسلے میں اسلامی ثقافت کے لحاظ سے حکمراں کو 'ظل اللہ فی الارض' (زمین پر خدا کا سایہ) سمجھا جاتا تھا جسے بابر نے بھی اپنایا۔ لیکن اکبر نے اس نظریہ کو فرۂ ایزدی (یعنی پر جلال مقدس نور) میں بدل دیا۔ 'ظل اللہ' اور 'فرۂ ایزدی' کے نظریات میں بہت بڑی فرق ہے۔ 'خدا کا سایہ' فطری طور پر 'خدا کے نور' سے کمتر ہے۔ 'خدا کا نور' بادشاہ کو براہ راست خدا سے جوڑتا ہے، بلکہ وہ خدا کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس طرح اکبر کا نظریۂ بادشاہت ادراک کا وہ کلس یا مقام عروج تھا جہاں تک مسلم ذہن جاسکتا تھا۔ یہ مسلمان حکمراں کے لیے ایک حد تھی، جو اکبر نے پار کردی۔

درحقیقت، مغل نظریۂ بادشاہت عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے لیے واضح طور پر فائدہ مند ثابت ہوا۔ اگرچہ مغل بادشاہوں کا اقتدار مطلق تھا، پھر بھی مغل حکومت نے علاقے کے باشندوں کے قدیم حقوق کی خلاف ورزی نہیں کی۔ مغل بادشاہت مجموعی طور پر شاندار اور اچھی طرح سے ترتیب دی گئی تھی۔ اس کے شاندار اور مضبوط ڈھانچوں کی وجہ سے یہ سلطنت اتنی دیر تک برقرار رہی۔ اگرچہ عملی طور پر اس کی بنیاد استبدادیت پر تھی، لیکن اس کی معروف احسان مندی اور فلاحی نوعیت نے اس کے جابرانہ کردار کو کمزور کردیا۔

11.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

آئین : اس سے مراد قواعد ہیں۔ ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں اکبر کی سلطنت کے اصول یا قواعد پیش کیے ہیں۔ یہ قواعد شاہی خاندان، منصب دار، شاہی فوج، اشیائے خوردونوش، شاہی اصطبل، نظام محصولات، وغیرہ کا حوالہ دیتے ہیں۔

آئین رہنمائی : ابوالفضل بادشاہ کو لوگوں کے روحانی رہنما کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

خطبہ : جمعہ کے دن مساجد میں پڑھا جانے والا خطبہ جس میں حاکم کا نام شامل کیا جاتا ہے۔

مظہر : (ایک فرمان) اکبر نے 1580 میں مظہر کا مشہور فرمان جاری کیا جس کا مسودہ شیخ مبارک نے تیار کیا تھا۔ اس فرمان نے مجتہدوں (ترجمان قانون) پر سلطان کے اعلیٰ مقام کو تسلیم کیا۔

صاحب قران(Sahib-i-Qiran): (ایک خوش قسمت اور ناقابل تسخیر بہادر) یہ تیمور کا لقب تھا۔ یہ لقب اس بادشاہ کو دیا جاتا تھا جس نے چالیس سال تک حکومت کی ہو۔

سٹپی(Steppe): چین کے شمال اور بیکال جھیل کے مشرق میں ایک علاقہ۔ منگول اس خطے کے اصل باشندے تھے۔

ایغور : ایک وسطی ایشیائی قبیلہ۔

11.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

11.7.1 انتہائی مختصر جواب طلب سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغل سلطنت کس نے قائم کی؟
2. آئین اکبری کس کی تصنیف ہے؟
3. بابر کا خاندان ہندوستان میں کن ناموں سے جانا جاتا تھا؟
4. تزک جہانگیری کس نے لکھی ہے؟
5. مغلستان سے کیا مراد ہے؟
6. ہندوستان میں ایرانی نظریۂ بادشاہت کو سب سے پہلے کس نے لاگو کیا ہے؟
7. لفظ خلیفہ سے کیا مراد ہے؟
8. ظل اللہ اور فرۂ ایزدی کا مفہوم بیان کیجیے۔
9. عبادت خانہ کب قائم کیا گیا؟
10. خانزادگی سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

11.7.2 مختصر جواب طلب سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بابر اور ہمایوں کا نظریۂ بادشاہت بیان کیجیے۔
2. مغل نظریۂ بادشاہت میں جانشینی کے تصوّر پر روشنی ڈالیے؟
3. مغل نظریۂ بادشاہت میں تورہ کے اثر کو بیان کیجیے۔
4. ترک و منگول نظریۂ بادشاہت پر ایک نوٹ تحریر کریں؟
5. شاہ جہاں اور اورنگزیب کے نظریۂ بادشاہت میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئی؟

11.7.3 تفصیلی جواب طلب سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغلوں کے نظریۂ بادشاہت پر ایک تفصیلی نوٹ تحریر کریں؟

2. ترک ومنگول بادشاہت کے نظریہ پر بحث کریں؟
3. ابوالفضل کے نظریۂ بادشاہت پر تفصیل سے روشنی ڈالیے؟

11.8 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Satish Chandra, *Medieval India*: *From Sultanate to Mughals*, Har-Anand Publications, New Delhi, 1999.
2. John F. Richards, *The Mughal Empire*, Cambridge University Press, 1993.
3. John F. Richards, "The Formulation of Imperial Authority under Akbar and Jahangir", *Kingship and Authority in South Asia* (1998).
4. Harbans Mukhia, *The Mughals of India*, Blackwell Publishing, USA, 2004.
5. Irfan Habib, "A Political Theory for Mughal Empire – A Study of the Ideas of Abul Fazl", *Proceedings of the Indian History Congress*. Vol. 59, Indian History Congress, 1998.
6. U. N. Day, *Some Aspects of Medieval Indian History*, Kumar Brothers, New Delhi, 1971.
7. Muzaffar Alam and Sanjay Subramaniam (eds.), *The Mughal State*, *1526-1750*, Oxford University Press, Delhi,1998.
8. Ram Prasad Khosla, *Mughal Kingship and Nobility*, The Indian Press, Allahabad, 1934.
9. Sri Ram Sharma, *The Religious Policy of Mughal Emperors*, Agra, 1972.

اکائی 12۔ مغل طبقہ امراء

(Mughal Nobility)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 مختلف حکمرانوں کے تحت مغل امراء کی آمیزش
12.2.1 بابر اور ہمایوں کے دور میں طبقہ امراء
12.2.2 اکبر کے دور میں طبقہ امراء
12.2.3 جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں طبقہ امراء
12.2.4 اورنگ زیب کے عہد میں مغل طبقہ امرا
12.3 مغل امراء کی ترکیب اور نظام منصب داری
12.4 امراء کی نوعیت
12.5 امراء کا کردار
12.6 اکتسابی نتائج
12.7 کلیدی الفاظ
12.8 نمونہ امتحانی سوالات
12.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
12.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

12.0 تمہید (Introduction)

یہ بار بار دہرایا جانے والا مشہور مقولہ ہے کہ ہندوستانی تاریخ نویسی میں رعایا کو نظر انداز کیا گیا ہے۔تاہم یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ حکمرانوں کی طرف بھی خاصی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ہمارے پاس بلاشبہ شاہی خاندانوں کی تواریخ اور ہندوستانی حکمرانوں کے بارے میں بہت سے متاثر کرنے والے تذکرے موجود ہیں۔لیکن سلاطین، چاہے وہ کتنے ہی مُطلق العِنان کیوں نہ ہوں اور چاہے اُن کے دعوے کتنے ہی پُر شکوہ کیوں نہ ہوں، وہ صرف ایک طبقہ کی نمائندگی کرتے تھے، اگرچہ وہ حکمراں طبقے کا ایک اہم حصّہ ہی کیوں نہ ہوتا۔باقی ماندہ ممبر طبقہ جو عموماً بادشاہوں کے کارندوں یا امیر زادوں پر مشتمل تھا، وہ بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

اَمارت مغلیہ کے موضوع نے حالیہ برسوں میں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ لکھنے والوں کی خاصی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے اور بنیادی طور پر تین اہم کتابیں یعنی ایم۔اطہر علی کی 'اورنگ زیب کے دور میں مغل امراء'، ستیش چندر کی 'مغل دربار میں گروہ بندیاں اور سیاست(1707۔1740)' اور اقتدار عالم خان کی 'ایک مغل امیر زادہ کی سیاسی سرگذشت(منعم خان، 1497۔1545)' زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔یہ کتابیں ہمیں مغل امراء سے متعلق ایک اہم بصیرت عطا کرتی ہیں۔موجودہ اکائی میں ہم مغل بادشاہوں کے دورِ حکومت میں حکمراں طبقے کی ابتدا اور ترقی کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مختلف مغل بادشاہوں کے دورِ حکومت میں حکمراں طبقے کی ابتدا اور ترقی کے بارے میں جانیں گے۔
- حکمراں طبقے یا امراء کی نسلی ساخت کو سمجھ سکیں گے۔
- امراء کی تنظیم سازی کا جائزہ لے سکیں گے۔
- مغل امراء کی ترکیب اور منصبداری نظام کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- امراء کے طرز زندگی سے واقف ہو سکیں گے۔
- امراء کی نوعیت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مغل حکمراں طبقے کی سماج میں رول کے بارے میں جانیں گے۔

12.2 مختلف حکمرانوں کے تحت مغل طبقہ امراء کی آمیزش

(Mixture of Mughal Nobility under Different Rulers)

طبقہ امراء ایک اہم ادارہ تھا جسے مغل بادشاہوں نے استعمال کیا تھا۔اس کی بنیاد کا پتہ مغربی ایشیا میں سیاسی صورتِ حال کے وقوع

پذیر ہونے سے لگایا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغل حکومت کا وجود اس ادارے کی مناسب کارکردگی پر منحصر ہے۔ مغل امراء کثیر نسلی، کثیر مذہبی اور کثیر علاقائی تھے۔ وہ سبھی ایک منصب پر کام کرتے تھے اور ان کی تنخواہ نقد یا جاگیر کی صورت میں دی جاتی تھی جہاں سے وہ مالیہ جمع کرتے تھے۔ لہٰذا منصب داروں کی تعداد نہ صرف سیاست اور انتظامیہ پر اثر ڈالتی تھی بلکہ حکومت کے معاشی حالات پر بھی ان کا خاصا اثر پڑتا تھا۔

12.2.1 بابر اور ہمایوں کے دور میں طبقہ امراء (Nobility under Babur and Humayun)

بابر کے امیر یا بیگ بالخصوص وسطِ ایشیا کے باشندے تھے، سوائے چند ایرانیوں کے جنھوں نے اس کی نوکری ہرآت میں تیمور کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ اختیار کی۔ ہندوستان کو فتح کرنے سے پہلے وہ ایسا طبقہ امراء قائم نہ کر سکا جو نظم و ضبط کی حامل اور اس کی تابع ہو۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد حکمراں طبقے میں افغان اور ہندوستانی اُمرا کی شرکت سے طبقہ امراء کے ڈھانچے میں تبدیلی ہوئی۔ جس کی وجہ سے بابر ہندوستان میں ایک پائیدار حکومت قائم کر سکا۔ بابر نامہ جاگیروں کی شکل میں وسائل اور ہندوستانی امراء بشمولِ وسط ایشیائی امراء کو دی جانے والی خدمات کے بارے میں کئی حوالہ جات دیتا ہے۔ ایسا بھی لگتا ہے کہ بابر نے مقامی سرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی شروعات کی۔ نئے امراء کی یک جہتی کی یہ کوشش اس لیے کی گئی تاکہ امراء کے تئیں حکمرانوں کی برتری کو مضبوط کیا جا سکے۔ تاہم افغان جو ہندوستانی امراء میں سب سے بڑی جماعت تھے، انہیں مکمل طور پر مدغم نہیں کیا جا سکا۔

بابر کے انتقال کے بعد اور ہمایوں کے ابتدائی ایام میں طبقہ امراء کے مسائل نے نیا موڑ لیا۔ امراء نے یہ دعویٰ کیا کہ سلطنت حکمراں کی نہیں بلکہ حکمراں کنبہ کی ہے۔ مزید برآں ہمایوں افغان کی بڑھتی ہوئی مزاحمت، افغان امراء کے حجم اور تورانی طبقہ امراء کی جتھا بندی سے نمٹنے کے لیے نااہل تھا۔ گجرات کی فتح، شیر شاہ سوری کی جیت اور اس کے مقابلے میں مغل فوج کی شکست کسی فوجی کمزوری کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ہمایوں اور اس کے امراء کے درمیان رابطہ کا فقدان اور بھروسہ کی کمی تھی۔

1540 سے 1555 کے درمیان ہمایوں کی شکست اور اس کی جلاوطنی کے دوران مغل طبقہ امراء کی ساخت، ایرانی امراء کی شمولیت کی بنا پر دوبارہ تبدیل ہونے لگی۔ ان حالات میں پرانا تورانی طبقہ امراء غائب ہونے لگا اور نئے تورانی امراء کی ایک بڑی تعداد جو نچلے درجے پر فائز تھی انہیں اونچے درجے پر لایا گیا، اور انہیں اہم عہدوں سے نوازا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایرانی امراء کو بھی ترقی دی گئی اور انہیں مختلف مرکزی دفاتر مثلاً دیوان، وزیر، میر سامان، مشرف دیوان وغیرہ میں تعینات کیا گیا۔ دوبارہ فتح کے بعد ہمایوں نے مقامی لوگوں کو ازدواجی رشتے کے ذریعے حکمراں طبقے میں شامل کرنے کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کیا۔ نئے طبقہ امراء پر حکمراں کے انحصار اور ان کو عطا کردہ مراعات نے بہت جلد مغل طبقہ امراء میں تناو پیدا کر دیا۔ حکمراں طبقے میں چُغتائی امراء کا ایک بااثر گروہ تھا، جو انتظامیہ میں طبقہ امراء کے نئے گروہ کی شمولیت اور اس کی برتری کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ امراء بنیادی طور پر اقتدار کی مرکزیت کے خلاف تھے۔ اگرچہ ہمایوں نے ایرانیوں اور متوسط طبقہ تورانیوں کو اونچے درجے پر فائز کیا تاکہ وہ ایک ایسا طبقہ تیار کرے جو اُس کو ہندوستان دوبارہ فتح کرنے میں مددگار ثابت

ہو، تاہم اس کام میں کامیاب نہ رہے۔ پس بابر اور ہمایوں کے دور اقتدار میں طبقہ امراء ابھی تشکیلی صورت میں تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ حکمراں طبقہ ابھی اتنی تربیت یافتہ نہ تھا کہ بڑی مشکلات کا سامنا کرسکے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابھی تک ایک وفادار امراء کا طبقہ وجود میں نہ آیا تھا۔

12.2.2 اکبر کے دور میں طبقہ امراء (Nobility during the Reign of Akbar)

حکومت کی تمام دوسری اقسام کی طرح ریاست کو ملوکیت کے تحت بھی کئی اذہان کے امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جولیس سیزر اور نپولین بوناپارٹ جیسے ذہین لوگ بھی تنِ تنہا ریاست کے مسائل کو حل نہ کرسکے۔ شمالی ہندوستان میں بلبن اور علاءالدّین خلجی جیسے بادشاہ، جو تمام طاقت کو ایک ہی ہاتھ میں مرکوز کرنے پر یقین رکھتے تھے اور انتظامی نظام کو بہ نفسِ نفیس خود کنٹرول کرتے تھے انہیں بھی وزرا کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور اُن کے تئیں عزّت کا برتاو کرتے تھے۔

اکبر کے دور حکومت میں بھی ایرانی اور تورانی امراء کو بالادستی حاصل تھی۔ بیرم خان کی برخواستگی کے بعد مغل دربار میں ایک بڑا بحران پیدا ہوا جس کا نتیجہ تورانی امراء کی بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس مشکل کا سامنا کرنے کے لیے اکبر نے مغل طبقہ امراء میں دو نئے طبقوں کو روشناس کرایا۔ جن میں ہندوستانی مسلمان اور راجپوت امراء شامل تھے۔ ایرانی امراء کو بھی اونچے درجے پر لایا گیا، کیونکہ انہوں نے بحران کے وقت شہنشاہ اکبر کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ ان ایرانیوں کے علاوہ جو اکبر کے دور سے پہلے ہندوستان میں موجود تھے، بہت سارے ایرانیوں نے مغل دربار کا رُخ کیا تاکہ وہ بحیثیت امراء کام کریں اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ایران میں شعیہ سلطنت نے سنی مسلمانوں پر ظلم ڈھائے تھے اور وہ ہندوستان کے خوشگوار ماحول میں کام کرنا چاہتے تھے۔ ان میں بہت سارے باصلاحیت اور تربیت یافتہ تھے جو ایران کے بڑے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اکبر نے ہندوستان میں خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور انہیں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا اس طرح ایرانی امراء کی حیثیت و مرتبہ مغل دربار میں کافی اہم ہوگیا تھا۔

بیرم خان کی برخواستگی کے بعد 1561ء سے اکبر نے راجپوتوں اور شیخ زادوں کو بھرتی کیا۔ ان گروہوں کے افراد کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اکبر نے بہت سارے قدم اُٹھائے۔ مثال کے طور پر اس نے راجپوتوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کیے، تیرتھ یاترا کا ٹیکس 1562ء میں معاف کرایا اور 1564ء میں جزیہ ٹیکس جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا منسوخ کیا گیا۔ اس طرح اکبر نے مغل دربار میں مختلف امراء کو بغیر کسی مذہبی و ملی تفریق کے کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اکبر کے تحت مغلوں کا حکمراں طبقہ ایک بین الاقوامی حکمراں طبقہ تھا اور اس کی بھرتی کے لیے قومیت کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ان میں جو اہمیت کے حامل تھے وہ تورانی، ایرانی، افغانی، شیخ زادے، راجپوت، خان زادے، اور دکنی لوگ تھے۔ ابوالفضل کے مطابق تقریباً ستر فی صد اکبر کے امراء (یعنی تورانی اور ایرانی) اصلاً پردیسی تھے۔ اس طرح طبقہ امراء مغلیہ میں بڑا تنوع تھا اور طبقہ امراء کے مختلف فرقوں میں ایک طرح کی رقابت تھی۔

12.2.3 جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں طبقہ امراء

(Nobility during the Reigns of Jahangir and Shah Jahan)

مغل بادشاہ جہانگیر اور شاہِ جہان کے دور میں طبقہ امراء نے قابل ذکر استحکام پایا۔ انہوں نے طبقہ امراء (منصب داری نظام) کی تنظیم، مناسب ترقیوں، نظم وضبط اور شاہی نوکری میں قابل لوگوں کی بھرتی کی طرف ذاتی اور خاص توجہ دی۔ فرانسیسی سیاح برنیر کے بقول مغل طبقہ امراء غیر ملکیوں پر مشتمل تھی جو ایک دوسرے کو دربار کے لیے ورغلاتے تھے۔ تاہم جدید تحقیق نے اس غلط ثابت کر دیا ہے۔

جہانگیر اور شاہجہاں کے دورِ حکومت میں اکثر امراء وہ تھے جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں افغانوں ٬ہندوستانی مسلمانوں (ہندوستانیوں)٬ اور ہندوؤں کا تناسب مسلسل بڑھتا رہا۔ جہانگیر وہ پہلا مغل بادشاہ تھا جس نے یہ محسوس کیا کہ دکن میں مراٹھے اہمیت کے حامل تھے اور اس لیے انہیں قائل کرنے کی کوشش کیں۔ یہ پالیسی اس کے بیٹے شاہجہاں نے جاری رکھی۔ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں ہندو، طبقہ امراء میں تقریباً چوبیس فی صد کے برابر تھے۔

خانزادے جو قدیم منصب دار کے وارث تھے انہیں بھی مغل دربار میں ترجیح ملتی تھی۔ دربار میں ان کی تعداد لگ بھگ نصف تھی۔ دوسری ریاستوں کے امراء اور بڑے افسر وتجربہ کار اعلیٰ رتبہ اور اثر ورسوخ کی وجہ سے مغل دربار کا حصہ بنتے تھے۔ دشمن ریاستوں کے فوجی کمانڈروں کو بھی بڑے منصبوں سے نوازا جاتا تھا۔ کھاتے دار ملازم جیسے کھتری (Khatris) اور کایستھ (Kayasthas) بھی مغل امراء میں شامل ہوتے تھے۔ ان کو زیادہ تر محکمہ مالیات میں نچلے طبقے پر رکھا جاتا تھا مگر وہ بھی کبھی کبھی اپنی ذہانت کی وجہ سے بڑے عہدے تک پہنچ سکتے تھے جس کی مثال اکبر کے دور میں راجا ٹوڈر مل اور اورنگ زیب کے دور میں راجار گوناتھ ہیں یہاں تک کہ ان کو دیوان کا منصب دیا گیا تھا۔

مفکّر، بزرگ، پیر، صوفی، عالم دین وغیرہ کو بھی مغل دربار میں بڑے عہدوں سے نوازہ جاتا تھا ابوالفضل اکبر کے دور میں، سعد اللہ خان اور دانشمند خان شاہجہاں کے دور میں اور حکیم عبد الملک تونی فاضل خان اورنگ زیب کے دور حکومت میں اسی طبقے میں آتے ہیں۔ افغانوں کی بے اعتمادی کی وجہ سے مغل دربار میں ان کو کچھ دیر تک دور رکھا گیا۔ تاہم جہانگیر نے ان کو بڑے منصب دیے، جیسے خان جہان لودی کو بڑے عہدے پر مامور کیا گیا تھا۔ لیکن ان کی بغاوت کی وجہ سے شاہجہاں کے دور میں افغانوں کو نظر انداز کیا گیا۔ بہر حال اورنگ زیب نے دوبارہ افغانی امراء کو مغل دربار میں موقع دیا۔

12.2.4 اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء

(Mughal Nobility during the Reign of Aurangzeb)

اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں امرا کی ساخت کسی حد تک ایک جیسی رہی۔ لیکن اس کے دور میں امرا کی جماعت میں ہندوئوں کی تعداد بڑھ گئی۔ ہندوستانی مسلمانوں (شیخ زادوں) نے ہمدردی کھو دی۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی نے مغل انتظامیہ میں ہندوئوں کی حصہ

داری پر کوئی اثر نہیں ڈالا باوجود اس کے کہ علماء کے طبقہ نے بار بار احتجاج کیا۔ اکبر کے دور میں ہندو، مغل امراء 22.5 فیصد تھے۔ اورنگ زیب کی حکومت کے ابتدائی بیس برسوں میں یہ 21.6 فیصد رہا۔ جب کہ 1670 اور 1707 کے درمیان ہندوؤں کی شرح میں اضافہ ہو ااور وہ امرا کی جماعت کا 31.6 فیصد ہو گئے۔ ہندوئوں کے طبقے میں راجپوتوں، مراٹھوں اور دوسری ذاتوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ وہ نہ صرف انتظامیہ میں تعینات کیے گئے تھے بلکہ انہیں بڑے بڑے منصب بھی دیے گئے تھے۔ قنوجی، دکنی اور یشونت رائو جیسے مراٹھا بالتّرتیب پانچ اور چار ہزار کا منصب رکھتے تھے۔ شیواجی کے بیٹے شاہو کو سات ہزار کا منصب دیا گیا تھا۔ مختلف قبیلوں کے راجپوت بھی اونچے منصب کے حامل تھے۔ مارواڑ کے جسونت سنگھ آمبیر کے جے سنگھ جیسے لوگ سات ہزار کے منصب رکھتے تھے۔ جب کہ میواڑ کے راج سنگھ کا رتبہ چھ ہزار تھا۔ حتیٰ کہ ایرانی، شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اورنگ زیب کے زمانے میں اچھی حالت میں تھے۔ تیئیں (23) ایرانی 5000 اور اس سے اوپر کا درجہ رکھتے تھے۔ مندرجہ ذیل نقشہ میں مغل امراء کی تعداد مختلف بادشاہوں کے دور میں دکھائی گئی ہے۔

حکمراں	اورنگزیب (1679-1707)	اورنگزیب (1658-78)	شاہجہاں (1628-58)	اکبر (1595)
کل منصب دار	575	486	437	98
ہندو	182	105	98	22
ہندو منصب داروں کا فیصد	31.6	21.6	22.4	22.5

ماخذ: ایم۔ اطہر علی، ''اورنگ زیب کے دور میں مغلیہ طبقہ امراء''

12.3 مغل امراء کی ترکیب اور نظام منصب داری

(Composition of Mughal Nobility in the Masabdari System)

مغل منصب داری نظام منگولوں کے طرز پر قائم کیا گیا تھا۔ منصب کے معنی ہیں رینک یعنی رتبہ۔ اکبر نے نظام منصب داری کی شروعات کی جس نے ریاستی نظام مراتب میں امراء کی حیثیت کو مستحکم بنادیا۔ اس منصب نظام کے تحت رتبوں کو عددی اصطلاح میں ظاہر کیا گیا ۔آئین اکبری میں ایسے 66 رتبے درج ہے لیکن عملی طور سے صرف 33 کا استعمال کیا گیا تھا۔

10 کے سب سے نیچے رتبے سے شروع کرتے ہوئے 5000 ہزار کے بلند ترین رتبہ تک جاتے ہوئے، بلا لحاظ عہدہ اور کام ریاستی عہدیداروں کا پورا نظام اس طرز کے تحت لایا گیا۔ 5000 ہزار سے اوپر اور 7000 ہزار تک کے رتبے شاہی گھرانوں کے شہزادوں کے لیے مختص تھے۔ اگرچہ پچھلے زمانوں میں بھی عددی رتبوں کا حوالہ ملتا ہے لیکن ان میں کوئی مغل منصب کی برابری نہیں کرتا۔ دور سلطنت میں رتبوں کا اظہار عہدوں سے کیا جاتا تھا جو کہ فوجی اور دیوانی (شہری) عملی کے لیے الگ الگ ہوتے تھے۔ اپنی افواج کے ساتھ نچلے درجے کے کمانڈر اعلیٰ درجہ کے کمانڈر کے ساتھ شامل تھے۔ مغل حکمرانوں کے تحت ہر منصب دار (رتبے دار) فوج کی منظور شدہ تعداد اور اس کا حصاب

کتاب رکھتا تھا اور ہر ایک کو ادائیگی تنخواہ کے ضابطے (شیڈول یا فہرست) کے مطابق کی جاتی تھی۔اب تک فوجی دستوں کے لیے ادائیگی کی مقررہ پہلے تین نیرخ (67-2566) میں ختم کیے گئے اور فوج کا ہر ممبر، بلالحاظ اعلیٰ یا ادنیٰ درجہ منصب دار مساوی تنخواہ پاتا تھا۔جو 8000 دام سالانہ (سوار کے فی اکائی) طے کی گئی تھی۔اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ہر منصب دار نے اپنی نگرانی میں فوجیوں کی منظور شدہ تعداد رکھی ہے، اس کے مکمل ساز و سامان کے ساتھ باقائدگی سے ہونے والے معاینے کے لیے پیش کرنا کو کہا جاتا تھا۔بخشی ہر منصب دار کی انفرادی فوجیوں اور جنگی نقل و حمل میں استعمال ہونے والے داغ شدہ جانوروں کا حلیہ بیانیہ رجسٹر میں درج کرتا تھا۔بدایونی ہم کو ایسے متعدد منصب داروں کے بارے میں بتاتا ہے جنہوں نے معائنے کے وقت غیر تربیت یافتہ لوگوں کو کرائے پر لے کر اور معائنے کے بعد آزاد چھوڑ کر محکمہ خزانہ کو دھوکہ دیا۔تقریباً 40 ویں سنہ جلوس تک منصب کے لیے صرف ایک ہی رتبے کا استعمال ہوتا تھا۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کا رتبہ اور مقدار ایک ہی تھا۔

جن پُر فریب طریقوں کا مشاہدہ بدایونی نے کیا، غالباً مغل انتظامیہ نے بھی ان کو بھانپ لیا تھا۔40 ویں سنہ جلوس سے کے بعد، تدارکی اقدامات کی حیثیت سے منصبوں کا اظہار ذات اور سوار کی اصطلاح میں ہونے لگا۔ذات کسی عہدیدار کا انفرادی رتبہ پر کرتی تھی۔جب کہ سوار منصب داروں کے ذریعہ رکھی ہوئی افواج کی مقدار بتاتی تھی۔افواج کی طاقت پر منحصر ہوتے ہوئے منصب داروں کو تین زمروں میں رکھا گیا۔پہلے زمرے میں وہ منصب دار جن کا ذات اور سوار رتبہ برابر ہوتا تھا۔دوسرے درجہ میں وہ منصب دار تھے جن کا سوار کا رتبہ ذات کے رتبہ سے آدھا تھا۔تیسرے زمرے میں وہ منصب دار تھے جن کا سوار کا رتبہ ذات کے رتبہ کے نصف سے بھی کم تھا۔اس کے مطابق ذات کی تنخواہ مختلف ہوتی تھی۔

ان تبدیلیوں کے بعد آئین اکبری میں منصب داروں کی تنخواہوں کا گوشوارہ دوبارہ تیار کیا گیا۔آئین میں منصب داروں کے تحت جنگی اور نقل و حمل کے جانوروں کی نسل اور ان کی تعداد بھی درج کی گئی ہے۔وہ ترتیب جو چالیسویں سنہ جلوس کے بعد دیکھنے کو ملتی ہے منصب داری نظام کی ایک کلاسک شکل سمجھی جاتی ہے۔ان جانوروں کی دیکھ ریکھ اور انتظام کا خرچ منصب دار اپنی ذات کی تنخواہ سے برداشت کرتے تھے۔

1600ء کے آس پاس منصب داروں دی گئی تمام تفویضات کا مغل سلطنت کے کل محاصل کا تقریباً 75 فیصد تھا۔اس نظام نے پیشہ ورانہ میدان اور کسی بھی قسم کی نسلی یا مقامی ملاحظات دونوں جانب شفافی ظاہر کی۔منصب نظام کی اہم ترین کامیابی یہ تھی کہ اس نے طبقہ امراء کا مقدار ضرورت کے مطابق کر دیا اور حکمراں واحد ثالث بن کر اُبرا۔

بایں ہمہ، وہ نظام اور ادارے جو اکبر نے کافی جان فشانی سے قائم کیے تھے بدلتے زمانے اور حالات کے چلینج کا مقابلہ کرنے کے لیے ان میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔پوری سترہویں صدی کے دوران مالی حالات کے تخمینہ کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔17 صدی کے مختلف سالوں میں ہم کو جمع کے اعداد و شمار نہیں ملتے۔اگر ہم 1595ء کو بنیادی سال مان لیں تو 1628ء میں درج کی گئی جمع میں 81 فیصدی کا اضافہ تھا۔جو 1656ء کے اس پاس 251 فیصدی تک جا پہنچی۔ہر لحاظ سے یہ کثیر اضافہ تھا۔جو صرف قیمتوں میں اضافہ، کسانی میں توسیع اور بہتر

فصلوں کی کاشت میں قابل ذکر اضافے کی وجہ سے تھی۔تاہم ہم کو ان میں سے کسی کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں ہے۔اس کے برعکس شاہجہاں کے دور حکومت میں مختلف علاقوں کی تخمیناً قیمت کی شناخت مدت کے پیمانے کی اصطلاح کی گئی ہے۔اس کے مطابق جاگیرداروں کو سہ ماہی یا شش ماہی کا نام دیا گیا تھا۔اندازہ لگائے گئے جمع اور حاصل کے درمیان فیصلہ برابر کرنے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔مالیہ کے تخمینے کے حساب سے رتبے سپُرد کیے جاتے تھے۔جب اصل وصولی اندازے سے کم ہوتی تھی۔

اکبر کے جاں نشینوں کے زمانے میں منصب داروں کی ذمہ داریوں میں تبدیلیاں ہوئی۔جہانگیر نے سوار کے رتبے میں ایک معاہدہ کا آغاز کیا۔اس کے مطابق کچھ منصبداروں کے سوار رتبے کے ایک حصے کا نام دواسپہ،سہ اسپہ رکھا گیا۔اس حصہ کے لیے 8000 دام فی سوار کی اسی شرح کے حساب سے اضافی ادائیگی منظور کی گئی اسی طرح کے سوار کا رتبہ 4000 تھا جس میں 1000 دواسپہ،سہ اسپہ تھا۔اس طریقہ کار سے منصب داری میں کافی کمزوریاں آئیں۔اورنگ زیب کے دور حکومت میں دکنی امراء کی تعداد بڑھ گئی جس سے منصب داری پر برا اثر پڑا ۔منصب داری اور جاگیرداری مغل حکومت میں امرا کی تنظیم کو واضح کرتے ہیں منصب دار اپنی تنخواہ نقد یا جاگیروں کی شکل میں حاصل کرتے تھے باوجودیکہ ان میں سے بیشتر جاگیردار تھے۔

12.4 امراء کی نوعیت (Nature of Nobility)

امراء کی نوعیّت سے متعلق علماء کی متضاد رائے ہے۔کچھ مورخ مثلاً آر۔پی کھوسلا (R.P. Khosla) کی رائے ہے کہ مغل دور میں امرا کی تنظیم جاگیردارانہ نوعیت کی تھی۔اُن کا کہنا ہے کہ امرا کو اُن کی خدمت کے عوض جاگیریں دی گئی تھیں۔لہذا اُن کا کہنا ہے کہ یہ جاگیردارانہ نوعیّت کی تھی۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان امراء کو اس جاگیر پر صرف ریاست کا حصّہ دیا گیا تھا۔علاوہ ازیں یہ جاگیریں قابل انتقال اور غیر موروثی تھیں۔اس وجہ سے مغل امراء کی تنظیم جاگیردارانہ نوعیّت کی نہ تھی۔ستیش چندرا اور ان جیسے دیگر مورخوں کا ماننا ہے کہ مغل حکومت میں امراء کی تنظیم نوکر شاہی نوعیّت کی تھی۔یہ اُمراء حکومت کی خدمت کرتے تھے اور اس کے عوض حکومت انہیں جاگریں اور منصب عطا کرتی تھی۔وہ مغل حکومت کے وفادار رہتے تھے نہ کہ کسی خاص شخص کے۔لہذا مغل طبقہ امراء نوکر شاہی نوعیّت کی تھی۔

12.5 امراء کا کردار (Role of the Nobles)

مغل حکمراں بابر سے لے کر اورنگ زیب تک کے تمام اُمراء شاہی فرمان کے حامل تھے۔حکمراں کی پالیسیاں صرف ان کے ذریعے عمل میں لائی جاتی تھیں۔اس طرح اُمراء کے آرا اور مفادات بلا واسطہ اور بالواسطہ طور پر کارکردگی میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔یہ رائیں ہمیشہ ایک جیسی نہیں ہوسکتی تھیں اور نا ہی تمام امراء کے مفادات یکساں ہو سکتے تھے۔مختلف پالیسیوں کے نفاذ میں اور اہم مسائل پر امراء اکثر آپس میں گروہوں اور ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔چونکہ مغل امرا کی تنظیم مختلف نسلی اور مذہبی عناصر پر مشتمل تھی،یہاں ہمیشہ مختلف گروہوں کے لیے ایک سازگار ماحول موجود تھا۔اس طرح وہ امراء جو کبھی دیانت داری،ایمان داری او وفاداری کے ساتھ ساتھ ذہین لوگ ہوا کرتے تھے،وہ بھی رفتہ رفتہ خود غرض اور مکار بن گئے۔وہ مذہب،وطن اور قبیلے کے امتیازات کی بنا پر مُنقسِم ہوگئے تھے۔اور ہر گروہ اپنا ہی ایک الگ

زُمرہ بناتا تھا۔

چونکہ مغل امراء کافی مال دار تھے اس وجہ سے نہایت ایک ٹھاٹھ باٹھ اور شان وشوکت کی زندگی گزارتے تھے۔ان کے یہاں حرم میں کئی بیویاں، نوکر چاکر، مال بردار اور سواری کے لیے گھوڑے اور دوسرے جانور مہیا تھے۔ وہ بڑے بڑے محلوں میں رہتے تھے۔ان چیزوں کے علاوہ وہ رفاہ عامہ کے لیے بھی بہت کام کرتے تھے۔ تعمیرات کے کام میں دل چسپی لیتے تھے۔ مرتضٰی خان بخاری نے اکبر کے دور حکومت میں احمد آباد میں سرائیں، مسجدیں اور بہت عمدہ عمدہ عمارتیں بنوائیں۔ مغل عہد میں بہت سی مثالیں ملتی ہے کہ امراء نے بڑے پیمانے پر مسافر خانے، حمام، کنویں، حوض، تالاب، سڑکیں، بازار و باغات تعمیر کروائے تھے۔

علاوہ ازیں ہمارے پاس بے شمار تاریخی وسائل موجود ہیں جن میں مذہبی عمارتوں کا ذکر موجود ہے جیسے مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں ، مقبرے اور مندر وغیرہ۔ مقبرہ تعمیر کرنا مغل امراء کے لیے ایک عام بات تھی کئی امرا نے تو صوفی بزرگوں کے بھی مقبرے تعمیر کروائے۔ مغل امراء نے بہت شہروں کی داغ بیل بھی ڈالی۔ جب بھی کوئی قصبہ یا شہر وجود میں آتا تھا وہاں زندگی کی تمام تر سہولیات مہیار کھی جاتی تھی۔ مغل امراء نے اپنی عیش و عشرت کی تمام چیزوں کو بنانے کے لیے مختلف کارخانوں کی بنیاد بھی ڈالی۔ وہاں قالین، ریشمی گل کاری، چکن دوزی اور بہت ساری قیمتی اشیا بنتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ بہت ساری قیمتی چیزیں باہر کے ملکوں سے درامد بھی کرتے تھے۔امراء کے مشغلوں میں شکار کرنا، کھیل کود، تیوہاروں میں شرکت کرنا، شادی بیاہ میں شمولیت اختیار کرنا شامل تھا۔

12.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں ہم نے مغل امراء کے ارتقاء اور ترقی کو مختلف مراحل گزرتے ہوئے دیکھا۔ شروع میں یہ ایک تورانی غلبہ والے طبقے کے طور پر ابھرا لیکن بعد میں سیاسی ضرورتوں کے نتیجے میں ایرانیوں، ہندوستانی مسلمانوں، راجپوتوں، مراٹھوں اور افغانوں کو بھرتی کیا گیا۔ اس طرح سے یہ متفاوت heterogenoeous حکمراں طبقہ بنا۔ بابر سے لے کر اورنگ زیب کے زمانے تک مغل امراء کافی حد تک حکمرانوں کے ذریعے قابو کیے جاتے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے انتقال کے بعد یہ امرا کھلم کھلا سازشیں رچنے لگے۔ اب وہ بادشاہ گر کا رول نبھانے لگے۔ وہ پُر تکلف زندگی بسر کرنے لگے اور اپنی خود کی حکومت کے بارے میں سوچنے لگے۔ اس طرح طبقہ امراء (امرا کی تنظیم) میں یہ عدم استحکام بھی مغل سلطنت کے زوال کی ایک اہم وجہ بن گیا تھا۔

12.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

تورانی : وہ امراء جن کا تعلق وسطی ایشیا اور ترکی نسل سے تھا انہیں تورانی امراء کہا جاتا تھا۔

مطلق ملوکیت : یہ تصور نظریے کے طور پر مطلق العنانیت ہے۔ یہ بادشاہت کا ایک رُوپ ہے جس میں بادشاہ اپنے بل بوتے پر حکومت کرتا ہے

شیخ زاد : وہ مسلمان امراء جو ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے شیخ زادہ کہلاتے تھے۔

جزیہ : تاریخی طور پر ایک قسم کا ٹکس جو غیر مسلم آبادی اپنے مسلم حکمراں کو ادا کرتی ہے۔

کتھری : شمالی ہندوستان کی ایک ذات جن کا تعلق تجارت کے کاروبار سے تھا۔

کایستاز : ایک اعلا ہندو ذات کا رُکن جن کا پیشہ کلرکوں، مصنیفین اور اکاونٹنٹ کا ہے۔

دو اسپہ،سہ اسپہ : یہ منصبداری نظام میں شہنشاہ جہانگیر نے ایک ترمیم کی تھی۔ جس کے تحت منتخب امراء کو ان کے ذات عہدے میں اضافہ کیے بغیر فوجیوں کا ایک بڑا کوٹہ برقرار رکھنے کی اجازت دی جاسکتی تھی۔

12.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

12.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بابر کے امراء کا تعلق زیادہ تر کس علاقے یا ملک سے تھا۔
2. ہمایوں نے کس طبقے کے امراء کو اپنے حکومت میں ترجیح دی۔
3. کس کے دورِ اقتدار میں مغل امراء بین الاقوامی حکمرانی طبقہ بن گیا۔
4. راجپوت اور شیخ زادوں کو کس شہنشاہ نے اپنی امراء میں شامل کیا۔
5. تیرتھ یاترا ٹکس اور جزیہ ٹکس کس مغل حکمراں نے ختم کیا۔
6. کتھری اور کایستاز کو مغل سلطنت کے کس محکمہ میں تعینات کیا گیا۔
7. ذات اور سوار سے کیا مراد ہے۔
8. کس مغل بادشاہ کے دور میں ہندو امراء تعداد میں زیادہ تھے۔
9. منصب سے کیا مراد ہے۔
10. جزیہ کا ٹکس کن لوگوں سے وصول کیا جاتا تھا۔

12.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغل امراء طبقہ کی نمایاں خصوصیات کیا تھی؟
2. مغل حکمراں طبقے پر مشتمل مختلف گروہوں پر تذکرہ کیجیے۔
3. مغل امراء طبقے نے آمدنی کے بے تحاشا وسائل کو کس طرح سے استعمال کیا؟
4. منصب داری نظام سے کیا مراد ہے؟
5. مغل سلطنت کی تشکیل میں امراء کے کردار پر بحث کیجیے۔

12.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. بابر، ہمایوں اور اکبر کے دور میں مغل حکمراں طبقے کے ارتقاء پر تفصیلی بحث کیجیے۔
2. مغل حکمراں طبقے کی تنظیم پر تفصیل سے وضاحت کیجیے۔
3. مغل انتظامیہ کا ایک اہم ستون مغل امراء تھیں۔جواز پیش کیجیے۔

12.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

---

1. Ali, M. Athar, *The Mughal Nobility under Aurangzeb*, Bombay, Oxford University Press, 1970.
2. Khan M. Afzal, *The Ruling Elite*: *Iranian Nobility under Shah Jahan and Aurangzeb*, New Delhi, Viva Books, 2016.
3. Chandra, Satish, *Parties and Politics at the Mughal Court*, 1707-1740. Delhi, Haranad Publications, 1979.
4. Khan, Iqtidar Alam, *The Mughal Nobility*: *Two Political Biographies*, New Delhi, Permanent Black, 2016.
5. Qureshi, Ishtiyaq Husain, *The Administration of Mughal Empire*, Delhi, Low Price Publications,1973.
6. Anwar, Firdos, *Nobility under the Mughals* (*1628-1685*), Delhi, Manohar, 2001.

اکائی 13۔ مغل نظم ونسق

(Mughal Administration)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 مغل نظریہ بادشاہت

13.3 مغل مرکزی نظم ونسق

13.3.1 وکیل

13.3.2 دیوان

13.3.3 میر بخشی

13.3.4 میر سامان

13.3.5 صدر الصدور

13.3.6 قاضی القضاۃ

13.3.7 مغل انتظامیہ کے دیگر افسران

13.4 مغل صوبائی نظم ونسق

13.4.1 صوبیدار

13.4.2 صوبائی دیوان

13.4.3 صدر

13.4.4 قاضی

13.4.5 میر عدل

13.4.6 بخشی

13.4.7 کوتوال
13.4.8 دیگر انتظامی محکمہ جات
13.5 مقامی نظم ونسق
13.5.1 سرکار
13.5.2 پرگنہ
13.5.3 گاؤں
13.6 اکتسابی نتائج
13.7 کلیدی الفاظ
13.8 نمونہ امتحانی سوالات
13.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
13.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
13.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

13.0 تمہید (Introduction)

1526ء میں مغل سلطنت کی بنیاد ظہیر الدین محمد بابر (1526تا1530) نے رکھی۔ اس کے جانشیں ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب نے اس پروان چڑھایا۔ اکبر سے اورنگ زیب تک تمام مغل حکمرانوں نے مغل سلطنت کو ایک بہتر نظم ونسق فراہم کیا اور اسے استحکام بخشا۔ اس اکائی میں ہم مغلوں کے مرکزی نظام حکومت کی نوعیت، مغل نظریہ بادشاہت اور مرکزی ڈھانچے کے تحت ان محکموں اور افسروں کے بارے میں جانکاری حاصل کریں گے جن کی موجودگی سے مغل سلطنت کا مرکزی نظام بحسن خوبی چل رہا تھا۔

مذکورہ انتظامی ڈھانچے میں کسی طرح کی یکسانیت نہیں تھی۔ جہاں تک صوبوں یا ولایتوں کا سوال ہے وہاں کا سب سے بڑا افسر ناظم ہوا کرتا تھا۔ اس کا کام مرکزی حکومت کی طرف جاری کیے گئے اصول وضوابط اور احکام وہدایت کو تسلیم کرنا تھا۔ نظم ونسق، امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام کے ساتھ ہی زراعت کو فروغ دینا، شاہراہ عام کی حفاظت، فوجی نظم ونسق اور شعبہ مالیات کی نگرانی کرنا تھا۔ ہر صوبہ میں فوجی نظم ونسق کے لیے صوبائی بخشی ہوا کرتے تھے۔ ٹیکس اور مال گزاری سے متعلق امور کی دیکھ بھال کے لیے دیوان ہوا کرتے تھے۔ صوبے شق یا سرکاروں میں منقسم ہوا کرتے تھے۔ کئی گاؤں کو ملا کر پرگنہ بنتا تھا اور کئی پرگنوں سے ایک سرکار بنتی تھی۔ بابر اور ہمایوں کو صوبائی نظم ونسق

میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے یا نئی روایت قائم کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔شیر شاہ کے عہد میں سلطنت مختلف صوبوں میں منقسم تھی اس کے عہد کے اہم صوبوں میں بنگال، مالوہ، راجپوتانہ اور ملتان وغیرہ تھے۔

صوبائی نظم و نسق کو نئی شکل دینے اور اس کو اچھی طرح عمل میں لانے کا سہرا اکبر اعظم (1556تا1605)کے سر بندھتا ہے۔اکبر نے 1576ء میں خالصہ زمین (جس میں بنگال، بہار اور گجرات شامل تھے) کو مال گزاری وصول کرنے کے لیے 182 اکائیوں میں تقسیم کیا۔اس نے ہر ایک اکائی کی مال گزاری ایک کروڑ دام متعین کی۔وہاں عامل (مال گزار افسر) اور ایک کروڑی کی تقرری کی، مگر یہ تجربہ ناکام رہا۔جنوری 1580 میں اس نے اپنی سلطنت کو 12 صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ان صوبوں سے اکبر کو 90744000 روپئے مال گزاری ملتی تھی۔اکبر نظم و نسق میں یکسانیت لانا چاہتا تھا جس کے باعث اس نے اپنی سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا اس کے عہد کے صوبے درج ذیل ہیں۔الٰہ آباد، آگرہ، اودھ، اجمیر، احمد آباد (گجرات)، بہار، بنگال، دلی، کابل، لاہور، ملتان اور مالوہ

اکبر نے جب برار، خاندیش اور احمد نگر فتح کیا تو تین اور صوبے بنائے۔اس طرح اکبر کے عہد میں کل صوبوں کی تعداد 15 ہو گئی۔قندھار، کشمیر، ٹھٹہ اور اڑیسہ کی فتح کے بعد اس نے کشمیر اور قندھار کو صوبہ کابل، ٹھٹہ کو صوبہ ملتان اور اڑیسہ کو صوبہ بنگال میں۔اس سے صوبوں کی تعداد 15 ہی رہی۔جہانگیر کے عہد میں اڑیسہ اور ٹھٹہ نئے صوبے بن گئے۔اس طرح جہانگیر کے عہد میں کل سترہ صوبے تھے۔شاہجہاں کے عہد میں صوبوں کی تعداد بائیس ہو گئی۔اس میں سے قندھار 1648 میں ہاتھ سے نکل گیا۔دکن میں فتح حاصل کرنے کے بعد دکن کے صوبوں دولت آباد، احمد نگر، تلنگانہ، خاندیش اور برار کے نظم و نسق کو اورنگ زیب نے اپنی صوبیداری کے عہد میں بہتر کیا۔ان صوبوں کی راجدھانی پہلے دولت آباد تھی بعد میں اورنگ آباد میں قائم کی گئی۔اورنگ زیب کے عہد حکومت میں خصوصاً اس کی وفات کے وقت صوبوں کی تعداد 21 تھی۔صوبائی نظم و نسق مرکزی انتظامیہ کی ایک چھوٹی شکل تھی۔صوبائی نظم و نسق یا انتظامیہ میں جو اعلیٰ افسر ہوتے تھے ان میں ناظم یا صوبیدار، دیوان، بخشی، صدر اور کوتوال وغیرہ اہم تھے۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل سلطنت کے مرکزی نظم و نسق کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔
- مغلوں کے نظریہ بادشاہت سے واقف ہو سکیں گے۔
- مرکزی نظام حکومت کی نوعیت اور اس کے ڈھانچہ کے بارے میں علم حاصل کر سکیں گے۔
- بادشاہ کے فرائض اور رعایا کے ساتھ اس کے طریقہ کار و طرز عمل کے بارے میں جان سکیں گے۔
- نظام عدل و انصاف سے متعلق معلومات فراہم کر سکیں گے۔
- صوبائی نظم و نسق کی جانکاری حاصل کر سکیں گے۔

- مقامی انتظامیہ کے شعبہ جات اور اس کے اعلیٰ افسران کے فرائض و اختیارات کا علم حاصل کر سکیں گے۔
- سرکار، پرگنہ، اور گاؤں سطح کے بڑے اور چھوٹے افسران کے بارے میں علم حاصل کر سکیں گے۔

13.2 مغل نظریہ بادشاہت (Mughal Theory of Monarchy)

مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر نے مغل بادشاہت کی بنیاد منگول نظریہ بادشاہت پر رکھی جس میں کچھ عنصر ترک نظریہ حکومت سے لیے اور کچھ منگول نظریہ بادشاہت سے۔ ترک سلاطین سے لیکر اورنگ زیب تک سبھی مطلق العنان فرنروا تھے لیکن دونوں (سلاطین دہلی اور مغل بادشاہ) میں جو ایک نمایاں فرق فرق نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ مغلوں نے سلاطین دہلی کی طرح خلیفہ کو تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ مغل سمجھتے تھے کہ اقتدار اعلیٰ ان کو حاصل ہے۔ اس لیے انہوں نے سلطان کے بجائے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ مسلم دور حکومت میں جو نظام رائج تھا وہ شخصی حکومت واقتدار کا مظہر تھا۔ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے اپنے طور پر ایسے نظام تجویز کیے تھے جن سے ان کی مطلق العنانی بھی قائم رہ سکتی تھی اور وہ ظالم بھی نہیں کہے جا سکتے تھے۔ پوری سلطنت میں کسی مفتی اور عالم کو یہ اختیار نہ تھا کہ بادشاہ کے فیصلہ کے خلاف کوئی قدم اٹھالے۔ اگر علماء بادشاہ کے کسی فیصلے کے خلاف آواز اٹھاتے انہیں جلاوطنی کی سزا دی جاتی۔ اکبر تو مذہبی معاملات میں آخری حجت تسلیم کیا گیا تھا۔ بادشاہ ہر قانون سے مستثنیٰ تھا۔ تمام سیاسی افکار اور ریاست کے فرائض بادشاہ میں مرکوز سمجھے جاتے تھے۔

مغل نظریہ بادشاہت جو ترک منگول نظریہ بادشاہت پر مشتمل تھا اس میں فرمانروا ایک عام رہنما سے زیادہ اعلیٰ و برتر سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہت کا مطلب ہوتا تھا طاقت، عام طور پر روز مرہ کی زندگی میں شریعت کو عام قانون سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھیں۔ مغل بادشاہوں نے ہندوستان سے باہر کسی بھی طاقت کی فکری اور عملی اعتبار سے تسلیم نہیں کیا۔ بابر سے اورنگ زیب تک سبھی نے یہ تسلیم کیا کہ بادشاہت عطیہ خداوندی ہے۔ مغل نظریہ بادشاہت بھی خدائی نظریہ پر قائم تھا۔ انہوں نے بھی ظل اللہ کا لقب اختیار کیا لیکن یہ نظریہ بادشاہت جو فرایزدی پر قائم تھا شاہجہاں کے دور تک چلا۔ شاہجہاں کی نظر میں بادشاہت کا مطلب ان لوگوں کی زندگی کو آسان اور آرام دہ بنانا ہے جو خدا کی امانت اور دولت ہیں۔ بادشاہ کو اپنی ساری دولت کمزوروں کی بہتری اور خدا کے بندوں کے لیے صرف کر دینی چاہئے۔ ابوالفضل نے مغل نظریہ بادشاہت کی تفصیل درج ذیل لفظوں میں بیان کی ہے۔

'بادشاہت خدا کا نور پر اور آفتاب کی ضیاء ہے۔ زمانہ حال کی اصطلاح میں ہم اسے فرایزدی کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں اسے پر عظمت حلقہ انور کہتے تھے۔ یہ روشنی براہ راست خدا کی جانب سے بادشاہوں کو ودیعت کی جاتی ہے اور انسان اس کو دیکھ کر ان کی بارگاہ میں اپنا سر عقیدت سے خم کر دیتا ہے۔'' شاہجہاں، عادل خاں کے نام ایک فرمان میں اپنے آپ کو سایہ خداوندی قرار دیتا ہے 'سایہ خدائیم'۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ بادشاہت خدا کا عطیہ ہے جو اس وقت تک کسی کو ودیعت نہیں کیا جاتا جب تک اس میں ہزاروں اوصاف جمع نہیں ہو جاتے۔ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ بادشاہ کو مذاہب سے متاثر نہیں ہونا چاہئے۔ اسے تقلید کے بجائے تحقیق سے کام لینا چاہئے۔ جہانگیر بھی بادشاہت کو عطیہ خداوندی سمجھتا ہے۔ شاہجہاں اور جہانگیر دونوں نے اکبر کے ذریعہ نافذ کیے گئے اصول سیاست اور نظم حکمرانی کو اہمیت دی اور اس کی

پیروی بھی کی۔

اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت اپنے سے پہلے کے حکمرانوں 202 سے متاثر تھا وہ خود اس پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ اپنے بیٹوں کو بھی اس طرح کی تلقین کرتا رہتا تھا اس کی شہادت اورنگ زیب کے وہ رقعات ہیں جو اس نے اپنے بیٹے سلطان محمد اعظم کے نام تحریر کیا ہے۔

'ایک روز سعد اللہ خان شاہجہاں کی خدمت میں دیر سے حاضر ہوئے اعلیٰ حضرت نے سبب پوچھا اس نے عرض کیا کہ ایک بیاض میں چند فقرے نظر آئے تھے انہیں نقل کر رہا تھا تاکہ خدمت والا میں عرض کردوں کہ سلطنت کی بنیاد کا قیام انصاف سے ہے، ملک ومال کی زیادتی بہادری اور سخاوت سے ہے۔ عالموں اور فاضلوں کے ساتھ صحبت رکھنا اور جاہلوں سے پرہیز کرنا عقل مندی کا نشان ہے۔ عقیدوں پر عمل کرنا عین مصیبت کی حالت میں مستقل مزاج رہنا، دنیا کے کاموں میں کوتاہی نہ کرنا، تربیر سے خوش اور تقدیر پر شاکر رہنا، خاندان کے دائمی قیام کی بنیاد یتیموں پر رحم کرنے اور محتاجوں کی حاجت روائی سے گریز نہ کرنے پر ہے، ملکی کام وزراء کے صلاح ومشوروں سے انجام پاتے ہیں اور فتح وکامرانی فقیروں کی دعا سے، اور تندرستی دردمندوں کا درد دور کرنے سے نصیب ہوتی ہے، مجرموں کے گناہ معاف کرکے خدا کی جانب سے رحمت کی امید رکھنی چاہئے۔'

اس خط میں پورا نظریہ بادشاہت اور حکمرانی کے تمام اصول موجود ہیں۔ انہیں خطوط پر اس نے اپنی سیاسی زندگی گزارنے کی کوشش کی۔ اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت یہ تھا کہ بادشاہ کو لطف وقہر کے معاملہ میں جادہ اعتدال پر رہنا چاہئے۔ اس نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ بادشاہت کا مطلب ہے کہ لوگوں کو ظلم وزیادتی سے محفوظ رکھنا، عوام کی سرپرستی کرنا اور عیش وعشرت کی زندگی سے بچنا چاہئے۔ اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت اپنے پیشرو حکمرانوں سے ضرور مطابقت رکھتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اس نے کچھ مذہبی نظریات کو بھی ترجیح دی ہے۔ اس نے جہاں مغل بادشاہت اور شاہی طور وطریق کو تسلیم کیا وہیں وہ فرایزدی کا کہیں قائم نظر نہیں آتا بلکہ اس کے نظریات قرآن کے سیاسی اصول پر مبنی تھے۔ بحیثیت حکمراں دیگر مغل بادشاہوں کی طرح اس کا یقین تھا کہ بادشاہ بنانے کا اختیار اللہ کو حاصل ہے۔ اوپر ابوالفضل کے الفاظ اور اورنگ زیب کے خطوط سے جس نظریہ بادشاہت کو ظاہر کیا گیا ہے وہی دراصل مغلوں کا نظریہ بادشاہت تھا۔

13.3 مغل مرکزی نظم ونسق (Central Administration under the Mughal)

مرکزی نظام حکومت میں اگرچہ بادشاہ ہی سب سے اہم ہوتا تھا اور حکومت کے سارے معاملات اسی کے ارد گرد ہوتے تھے پھر بھی مرکز کے سارے معاملات کی نگرانی کرنا تنہا بادشاہ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ حکومت کے نظم ونسق کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے ایک مجلس وزارت ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ کتنا ہی لائق، مطلق العنان، اور قابل ہو لیکن بغیر وزیروں وعہدیداروں کی مدد کے وسیع وعریض سلطنت پر کنٹرول ممکن نہیں تھا۔ سیاسی مفکرین نے بادشاہ کے لیے وزیروں وصلاح کار کی ضرورت پر خاص زور دیا جاتا ہے اور کہا ہے کہ ان کی ذمہ داری اور فرائض میں سے ہے کہ وہ بادشاہ کی مدد کریں اور نظم ونسق کے سلسلے میں اسے مشورہ دیں اور اس کے کاموں کو عملی جامہ پہنائیں۔ مغل انتظامیہ میں وزیروں کی حیثیت حکمرانوں کے ساتھ بدلتی رہتی تھی۔ بابر نے مہدی خواجہ کو اپنا وزیر اور زین الدین کو اپنا صدر بنایا تھا۔ مگر

ہمایوں کے عہد میں کسی کو بھی سکریٹری سے زیادہ کی حیثیت نہیں دی گئی۔ وزیروں کی تعداد ہمیشہ غیر متعین رہتی تھی۔ وزراء کی مدد سے بادشاہ حکومت کیا کرتے تھے۔ مغل انتظامیہ میں سب سے اہم عہدہ ویل یا وزیر کا ہوتا تھا۔ عملاًوہ انتظامیہ کا مالک و مختار ہوتا تھا۔ بادشاہ برابر اس سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ اکبر کا پہلا وکیل بیرم خان تھا۔ مغل انتظامیہ کا مرکزی ڈھانچہ درج ذیل محکموں پر مشتمل تھا۔

1. وکیل (وزیر اعظم)
2. دیوان (وزیر مال گزاری و خزانہ)
3. میر بخشی (وزیر عساکر)
4. میر سامان (وزیر کارخانہ و ذخائر سلطنت)
5. صدرالصدور (وزیر انصاف و امور مذہبی)
6. قاضی القضاۃ
7. اس کے علاوہ محتسب، میر آتش، داروغہ ڈاک چوکی، مستوفی، ناظر بیوتات، میر بر اور داروغہ ٹکسال جیسے عہدے بھی تھے۔

13.3.1 وکیل (وزیر اعظم)

مرکزی حکومت بلکہ پوری سلطنت میں اعلیٰ ترین افسر وکیل ہوتا تھا۔ وہ انتظامیہ کا مالک و مختار ہوتا تھا۔ اس کے خیالات لامحدود ہوتے تھے۔ اس کو وکیل/وزیر اعظم کہا جاتا تھا۔ وہ تمام شاہی اختیارات کا استعمال کرتا تھا۔ امور خانہ داری سے لیکر شعبہ انتظامیہ تک اس کے دائرہ اختیار میں تھے۔ اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ تمام کاروائیوں سے بادشاہ کو باخبر رکھے۔ وہ کسی افسر کو مقرر یا برخاست کر سکتا تھا۔ بادشاہ برابر اس سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ بابر اور ہمایوں ایک وزیر رکھے جانے کی روایت پر قائم تھے۔ ان میں بابر کے تحت نظام الدین خلیفہ اور ہمایوں کے تحت امیر واعظ اور ہندو بیگ کو یکساں درجہ حاصل رہا۔ ان کو سارے فوجی اور غیر فوجی اختیارات حاصل تھے۔ شیر شاہ سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ اس کے عہد میں بادشاہ پردے کے پیچھے تھا اور حکومت وکیل (بیرم خان) کی تھی۔ بیرم خان نے اپنی مرضی سے جاگیریں تقسیم کیں۔ وہ ہفتہ میں دو مرتبہ دیوان خاص میں بیٹھتا اور فوجی وغیرہ فوجی امور کی مناسب طور سے انجام دیتا تھا اور اس کی اطلاع بہ کمال ادب بادشاہ کو بھیج دی جاتی تھی۔ وہ بادشاہ کے ذاتی معاملات میں مداخلت بھی کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر نے بیرم خان کے اختیارات سلب کر لیے اور اسے معزول کر دیا۔

بیرم خان کے بعد سیاسی و مالی امور شہاب الدین گورنر دہلی کے سپرد کر دیے گئے تھے اور بعد میں ماہم انگہ بھی اس کی شریک کار بنا دی گئی۔ بیرم خان کا علم، طبل اور تمن، شمس الدین اتکہ خان کو عطا کر دیا گیا۔ منعم خان کو خانخانان کا خطاب عطا کیا گیا اور منصب وکالت سے بھی نوازا گیا۔ اس طرح بیرم خان کے اختیارات اور اعزازات تین اشخاص کے درمیان تقسیم کر دیے گئے۔ اکبر نے منعم خان کو وسکیل بنایا لیکن اسی کے بعد اکبر نے آہستہ آہستہ وکیل کے اختیارات اور طاقت کو کم کرنے کی بھی کوشش کی۔ اس مقصد سے اکبر نے دیوان یا وزیر کے

اختیارات میں اضافہ کردیااور مستقبل میں وکیل کے عہدے کی اہمیت کم ہوگئی۔ منعم خان کے بعد سال سال تک اس عہدے پر کسی کا تقرر نہیں ہوا۔اکبر نے اپنے جلوس کے انیسویں سال مظفر کو اس خدمات کے اعتراف میں منصب وکالت پر سرفراز کیا۔اسے بیک وقت دیوانی اور وکالت دونوں عہدے تفویض کیے گئے لیکن کچھ ہی دنوں میں اسے وکالات سے برطرف کردیا گیا۔اس کے بعد بالترتیب عبدالرحیم خانخانان تین سال اور خان اعظم دس سال منصب وکالت پر فائز رہے۔اکبر کے جانشیوں کے عہد میں کسی بھی وکیل کو وہ اختیارات حاصل نہ ہوسکے جو ایک شاہی حکومت میں ایک وکیل (وزیراعظم) کو حاصل ہوتے ہیں۔

جہانگیر (1605تا1627) کے عہد میں منصب وکالت پر شریف اور آصف خان کا تقرر ہوا دونوں کو دکن روانہ کردیا گیا اور انہیں دارالسلطنت آنے کا موقع نہیں ملا۔اس لیے وکیل ہوتے ہوئے بھی انہیں اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع نہیں مل سکا۔ تخت نشین کے چوتھے سال جہانگیر نے امور سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اکیس سال تک کسی وکیل کا تقرر نہیں کیا۔اپنے عہد حکومت کے آخری سال میں جہانگیر نے اعتمادالدولہ کے لڑکے آصف خان کو اپنا وکیل مقرر کیا اس طرح جہانگیر کے بائیس سالہ عہد حکومت میں کل تین شخص صرف پانچ سال تک وکالت کے فرائض انجام دیے۔

شاہجہاں (1627تا1658) نے وکیل کے اہم عہدہ پر آصف خان کا تقرر کیا اور ملکہ کی سفارش پر مہر ازک یا مہر اعظم بھی اسی کے سپرد کردی تھی۔ آصف خان نے شہنشاہ شاہجہاں کی تخت نشینی کے پندرہویں سال وفات پائی اور اس کے بعد شاہجہاں کے عہد میں کسی نئے وکیل کی تقرری عمل میں نہیں آئی۔وکیل کے ذمہ جو کام تھے اس میں اتکہ خان اور منعم خان نے سیاست اور مال گزاری سے متعلق سارے امور انجام دیے۔اسی طرح مظفر اپنے منصب وکالت کے دوران انتظام سلطنت میں پوری طرح دخیل تھا۔جہانگیر کے عہد میں آصف کو قطعی طور پر یہ حکم تھا کہ وہ دیوان میں بیٹھے اور سیاست و مالیات سے متعلق معاملات کو سلجھائے۔وکیل حیثیت اور رتبے کے لحاظ سے سلطنت کے اعلیٰ ترین فرد سمجھے جاتے تھے! اس طرح ان کا مقام و مرتبہ دیوان سے کہیں زیادہ بلند تھا۔انہیں اعزاز و وقار حاصل تھا مگر اختیار نہیں حاصل تھے۔

13.3.2 دیوان (وزیر مالیات)

مغل سلطنت میں دوسرا اہم عہدیدار، وزیر تھا جسے دیوان کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔دیوان یہ ایرانی لفظ ہے اس کا تعلق دبیر بمعنی تحریر کنندہ سے ہے اور یہ سریانی لفظ 'دیپ' سے متعلق ہے جس کے معنیٰ جمع خرچ کے ایسے رجسٹر کے ہیں جن میں ابتدائی فتوحات کے زمانے میں اندراجات کیے جاتے تھے۔ابن خلدون کا کہنا ہے 'دیوان لفظ اس رجسٹر کے لیے استعمال ہوتا تھا جس میں مال گزاری اور مالیات کے افسروں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً بنائے گئے قواعد وضوابط کا اندراج ہوتا تھا'۔ بعد میں اس کا استعمال ان افسروں اور ان کے بیٹھنے کے ایوان کے لیے بھی ہونے لگا۔ مغل عہد میں یہ مال گزاری اور مالیات کے سربراہ کے لیے مخصوص ہوگیا۔اکبر کے عہد میں دیوان لفظ کا استعمال ہوا ہے، جب کہ جہانگیر کے عہد میں لفظ دیوان کی جگہ وزیر کا استعمال زیادہ ملتا ہے اور شاہجہاں کے عہد میں وزیر کو دیوان کل، دیوان اعلیٰ اور اس کے شرکائے کار کو دیوان کہا جانے لگا۔وکیل کے بعد سب سے بااختیار افسر دیوان تھا جو وزیر یا دیوان کل بھی کہلاتا تھا۔اکبر کے عہد میں اس

شعبے کے لیے کبھی کبھی وزیر اور عام طور پر دیوان لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں دیوان یا وزیر شاہجہاں کے عہد میں دیوان کل یا دیوان اعلیٰ اور اورنگ زیب کے عہد میں وزیر، وزیر اعظم جیسے الفاظ کا استعمال شعبہ مالیات کے وزیر کے لیے ہوتا تھا۔ دراصل دیوان ہی شعبہ مال اور مال گزاری کا اہم وزیر ہوتا تھا مگر سبھی دیوان وزیر نہیں ہوتے تھے۔

دیوان شعبہ مالیات کا مستقل صدر ہوتا تھا۔ وہ جملہ انتظامی شعبہ جات کی باقاعدہ کارکردگی کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ اس کی تقرری بادشاہ کے حکم سے ہوتی تھی۔ ابوالفضل کے مطابق مال سے متعلق تمام معاملات میں وہ بادشاہ کا نائب ہوتا تھا۔ وہ ہر اہم وضروری کاغذ پر دستخط کرتا تھا۔ وہ مال گزاری کی تشخیص وتعیین اور اس کی وصولی کا نظم کرتا تھا اور ان کاموں سے متعلق بادشاہ کی رائے بھی لیا کرتا تھا۔ شعبہ وہ شعبہ مال گزاری کے اہم عہدیدار ہونے کی وجہ سے اس کا تعلق سبھی سرکاری عملے سے تھا جو کہ نقد تنخواہ یا جاگیر حاصل کرتے تھے۔ اس کی نیابت میں نائب نائب دیوان ہونے تھے۔ ایک 'دیوان تن' کہلاتا تھا جو جاگیرات کا انتظام کرتا تھا اور دوسرا 'دیوان خالصہ' کہلاتا تھا جو شاہی املاک کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ تیسرا 'دیوان بیوتات' کہلاتا تھا جس کا کام مختلف کارخانوں کی آمد وصرف کا بیورا رکھنا ہوتا تھا۔ مرکزی شاہی خزانے کی دیکھ بھال کے لیے 'مشرف خزانہ' نامی عہدیدار ہوتا تھا جو دیوان کے ماتحت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دیوان وزارت میں واقعہ نویس اور دوسرے عہدیدار بھی ہوا کرتے تھے۔ حسب ذیل عہدیدار براہ راست وزیر (دیوان) سے متعلق تھے۔

1. **مستوفی یا محاسب اعلیٰ:** یہ سلطنت کی آمدنی اور خرچ کی دیکھ بھال کے لیے مامور تھا۔ اس کو اختیار تھا کہ اخراجات کی مد کم کردے۔ شعبہ جات مال گزاری کے جملہ کاغذات پر اس کے دستخط ہوتے تھے۔
2. **صاحب توجیہہ:** تنخواہ تقسیم کرنے والا، اس کی ذمہ داری صرف دارالسلطنت کے ملازمین کی تنخواہ بانٹنا تھا۔ معماروں اور دستکاروں کی فرد حساب پر پہلے وہ دستخط کرتا تھا۔ تب مستوفی کے پاس کاغذات جاتے تھے۔

حسب ذیل عہدیداروں کا تقرر دیوان کے ذریعہ ہوتا تھا۔

1. صدر، صوبیدار، فوجدار، دیوان، کروڑی، امین اور داروغہ
2. صوبائی، مشرف، تحویلداران دیہات (جو دفتر خزانہ میں تعینات رہتے تھے) خزانچی اور خزانے کے داروغہ اور دفتر خزانہ کے کاتبین۔
3. سزاول: وہ اشخاص جو اہم اور ضروری کاموں کی عمل درآمد کرانے کی خدمات پر مامور ہوتے تھے۔
4. امین اور کروڑی
5. تحصیل دار بقایہ جات کی وصولی کے لیے مقرر کیے جاتے تھے۔
6. زمین دار، مال گزاری وصول کرنے والے ایجنٹ تھے۔

اکبر کے دیوان میں مظفر خان، ٹوڈرمل اور شاہ منصور جہانگیر کے دیوانوں میں اعتمادالدولہ اور خواجہ ابوالحسن اسی طرح شاہجہاں اور اورنگ زیب کے وزیروں میں بالترتیب سعد اللہ خان اور اسد خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

13.3.3 میر بخشی (وزیر عساکر)

مغل سلطنت میں بخشی اعلیٰ عہدے پر فائز عہدیدار ہوا کرتا تھا جس کے ذمہ فوجیوں کی بھرتی اور ان کی تنخواہ دینے کا کام سپرد تھا۔ میر بخشی کا منصب ہندوستان میں مغل بادشاہوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ مغل سلطنت میں میر بخشی کو محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے وہ تمام اختیارات حاصل تھے جو ولی سلطنت میں دیوان عرض کو حاصل تھے۔ اس کے اختیارات مرکزی حکومت کے تمام شعبے تک پھیلے ہوئے تھے۔ محکمہ فوج کے سربراہ کی حیثیت سے اس کا ہر منصب دار سے تعلق تھا۔ سپاہیوں کی بھرتی کا جائزہ اور دوسرے عسکری معاملات کا نگران بھی تھا۔ اس کی مدد کے لیے ایک نائب بخشی بھی رہتا تھا جس کو بخشی دوم کہا جاتا تھا۔ نئے سپاہیوں اور منصب داروں کے گھوڑوں کو داغ و نشانی کے بعد بخشی بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اسی طرح مستقل عہدیداروں کے سپاہیوں اور گھوڑوں کو بھی مقررہ وقفہ کے بعد وہی بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ محکمل کے سربراہ کی حیثیت سے وہ صوبوں سے آنے ولے تمام عہدیداروں کو بادشاہ کے حضور پیش کرتا تھا۔ میر بخشی غسال خانے (خلوت خانہ) میں بھی بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس طرح سلطنت کے تمام اہم معاملات سے اس کا تعلق ہوتا تھا۔

فوج کے ہر شعبے کا ایک علاحدہ بخشی ہوا کرتا تھا۔ اکثر وقائع نویسی کے فرائض وہی انجام دیا کرتا تھا۔ میر بخشی اور اس کے رفقاء کار خود میدان جنگ میں سرگرمی سے حصہ لیتے اور دوسرے عہدیداروں کی طرح جنگ کرتے۔ میر بخشی اور اس کے شریک کار روزانہ کے دفتری کام بھی انجام دیا کرتے تھے۔ میر بخشی کی غیر موجودگی میں بخشی دوم دربار میں حاضر ہو کر رہنے والے منصب داروں کی فہرست تیار کرتا تھا لیکن اس کی غیر موجودگی میں جاری ہونے والے تمام احکام اس کے سامنے اس کے دفتر میں پیش کیے جاتے تھے جہاں تک منصب داروں کی تنخواہوں کے حساب کا تعلق تھا میر بخشی اپنے دفتر میں وہ تمام کاغذات محفوظ رکھتا تھا جن پر اس کی مہر لگتی اور اس کے دستخط ہوتے تھے۔ لیکن تنخواہ پر اثر انداز ہونے والی رخصت اور غیر حاضری کے کاغذات بخشی دوم کے دفتر میں رکھے جاتے تھے۔

میر بخشی شہزادوں اور بڑے بڑے امراء کا کام انجام دیتا۔ بخشی دوم اس سے کچھ کم درجہ کے منصب داروں کے کام انجام دیتا اور بخشی سوم کے ذمہ منصب داروں سے متعلق کوئی کام بھی نہیں ہوتا تھا وہ صرف یومیہ داران کے تقرر اور ان کی تنخواہوں میں ترقی سے متعلق کام انجام دیا کرتا تھا۔ میر بخشی اختیارات، حیثیت اور اثر ورسوخ میں دیوان اعلیٰ کا ہم پلہ تھا۔ میر بخشی کو عموماً فوجوں کی تنخواہ تقسیم کرنے والا عہدیدار سمجھا جاتا تھا لیکن یہ اس کے روزمرہ کے مستقل فرائض میں داخل نہیں تھا۔

13.3.4 میر سامان (سرکاری ساز وسامان کا نگران)

میر ساماں کا عہدہ بڑی ذمہ داری کا تھا، صرف ان کو دیا جاتا تھا جو باصلاحیت اور قابل اعتماد ہوں۔ چنانچہ افضل خان، سعد اللہ خان اور فاضل خان اس عہدہ پر کام کر چکے تھے اور بعد میں وزرائے سلطنت ہوئے۔ اس محکمہ کے عہدیدار دربار میں بادشاہ کے سامنے تمام اہم معاملات اور بڑے بڑے کاموں کے خرچ کے تخمینے پیش کرتے تھے۔ یہ محکمہ مصنوعہ سامان بادشاہ کے سامنے نمائش کے لیے رکھتا اور متعلقہ دستکار کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا۔

میر ساماں کے محکمہ کو کارخانہ جات کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ یہ محکمہ ان گوداموں اور کارخانوں پر مشتمل تھا جنہیں مرکزی حکومت نے سرکاری اغراض سے قائم کرر کھا تھا۔ اس کا تعلق ہیرے جواہرات، تلواروں، بندوقوں اور قیمتی پتھروں سے ہوتا تھا۔ یہ محکمہ فوج کے لیے گھوڑے اور ہاتھی، نقل و حمل کے لیے بار برداری کے جانور اور شاہی شکار کے لیے دوسرے جانوروں کا انتظام رکھتا تھا۔ میر ساماں لفظ کا استعمال اکبر کے زمانے میں نہیں ملتا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں میر ساماں اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ شاہجہاں کے زمانے میں تقررات اور دربار شاہی کے دوروں کے سلسلے میں جہاں کہیں بھی اس کا ذکر آیا ہے تمام ہم عصر مورخین نے میر ساماں ہی کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن وہ آئین وضوابط جن کا تعلق اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے ہی ان میں زیادہ تر "خان سامان" ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ میر ساماں کا لفظ صرف ایک دستور میں ملتا ہے جو اس میں خان ساماں ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

میر ساماں اپنے محکمہ کا سب سے بڑا انتظامی عہدیدار ہوتا تھا جو محکمے کی عام نگرانی اور اس کی کامیاب کارکردگی کا ذمہ دار ہوتا تھا اس کے ماتحت جو دوسرے عہدیدار تھے ان کے نام ہیں۔ دیوان بیوتات، مشرف کل و جزء، داروغہ، تحویل دار، مستوفی، داروغہ کچہری، ناظر وغیرہ۔ مغل انتظامیہ میں داروغہ اور تحویل دار کا ذکر جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں اکثر ملتا ہے لیکن ناظر محکمہ کا ذکر نہیں ملتا۔ میر ساماں صدر محکمہ کی حیثیت سے انتظامی امور انجام دیا کرتا تھا اور ہر شعبے کی عام نگرانی بھی کرتا تھا۔ وہ تمام امور اور تجارتی معاملات کی طرف بادشاہ کی توجہ مبذول کراتا اور بقیہ کام خود ہی انجام دیا کرتا تھا۔ شاہی کارخانے اور بھنڈار اسی کے ماتحت ہوتے تھے۔ وہ مختلف چیزوں کی پیداوار اور ان کی فراہمی کے لیے بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ بادشاہ کے لیے اسلحہ وغیرہ کا بھی انتظام کرتا تھا۔ اسے دیوان عام و خاص کا انتظام، کارخانوں کا انتظام وانصرام، اشیاء، شاہی اصطبل کے جانوروں اور لائق صنعت کاروں کے بارے میں بھی بادشاہ کو اطلاع دینی ہوتی تھی اور ششماہی بجٹ بنا کر بھی دینا ہوتا تھا۔ بادشاہ تین طرح سے میر ساماں کے محکمہ پر کنٹرول رکھتا تھا۔

1. وہ ہر چھ مہینہ پر اس محکمہ کے حساب کی جانچ کرتا تھا اور اس کے معاشی انتظام کے لیے حکم دیا کرتا تھا۔
2. وہ دربار میں اس محکمہ کے کام کی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا، اشیاء کی قیمتیں متعین کرتا تھا اور احکام صادر کیا کرتا تھا۔
3. وہ شاہی کارخانوں میں تیار کی گئی اشیاء کی خرید و فروخت کی جانچ کرتا تھا اور اچھے و قابل صنعت کاروں کو انعامات سے نوازتا تھا۔

13.3.5 صدر الصدور

صدر بادشاہ اور رعایا کے درمیان بیچ کی ایک کڑی، شریعت کا محافظ اور علماء کی نقیب ہوتا تھا۔ مرکزی حکومت میں صدر الصدور کا عہدہ بڑا اہم ہوتا تھا۔ وہ محکمہ عدل وانصاف، خیرات اور مذہبی امور کا سربراہ ہوتا تھا۔ وہ صدر معاش میں دی جانے والی زمینوں کا منتظم تھا اور یہ زمین کس دی جائے اس کا فیصلہ بھی کرتا تھا۔ نئی گرانٹ کے لیے درخواستوں کی چھان بین کرنا اس کے فرائض میں تھا۔ وہ بادشاہ کو مذہبی معاملات میں مشورے بھی دیا کرتا تھا۔ خیرات و مدد معاش میں دی جانے والی زمین کا تقسیم کار بھی تھا۔ چیف قاضی کی شکل میں مقدمہ کی سماعت کر کے فیصلے بھی دیتا تھا۔ وہ صوبائی اور مقامی قاضی کے فیصلوں کے خلاف اپیل کی سماعت کرتا اور فیصلے بھی دیا کرتا تھا۔ عدل وانصاف کے میدان میں بادشاہ کے بعد اسے دوسرا اہم مقام حاصل تھا۔ وہ صوبائی اور مقامی قاضیوں کی تقرری کے لیے بادشاہ سے سفارش بھی کیا کرتا تھا۔

اکبر کے ابتدائی دور حکومت میں صدر کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ صدر الصدور کی تقرری بادشاہ کیا کرتا تھا۔ اکبر کے اولین صدر شیخ گدائی کے متعلق بدایونی کہتا ہے کہ وہ قدیم خاندانوں کی مقبوضہ اراضی ضبط کر کے ان لوگوں کو عطا کرتا تو جو جو کی خوش آمد کرتے تھے جب کہ لائق اور اچھے خاندان کے افراد کو ہر طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی تقرری بیرم خان نے 59-1558 میں کی تھی اس کے بعد خواجہ محمد صالح ہردی صدر بنے۔ بحیثیت صدر خواجہ محمد صالح ہردی کو بھی یہی اختیارات حاصل تھے۔ اس کے بعد 1565 میں شیخ عبد النبی کو صدر الصدور کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اپنے اختیارات کا استعمال پوری آزادی سے کیا اور بڑی بڑی آراضی مستحقین کو عطا کیں۔ اکبر نے انہیں خرد برد میں ملوث ہونے کے باعث 1579 میں ہٹادیا اس کے بعد سلطان خواجہ اس عہدے پر تقرری ہوئی۔ 1581 میں اکبر نے 9 صوبوں میں صدر کی تقرری کی جس سے صدر الصدور کے اختیارات کم ہوئے۔

مرکزی حکومت کے دسرے محکموں کی طرح صدر کا محکمہ بہت بڑا نہیں معلوم ہوتا۔ آئین اکبری سے پتہ چلتا ہے کہ اہم فرائض کی انجام دہی میں ایک ممتاز کلرک بشکچی صدر کی مدد کرتا تھا جو دیوان سعادت کہلاتا تھا۔ وہ تمام امور صدر کے احکام کے مطابق انجام دیتا تھا۔ محکمے سے مدد معاش سے متعلق جو حکم یا صداقت نامہ جاری ہوتا تھا اس پر صدر کی مہر ضروری ہوتی تھی۔ اکبر کے عہد میں شیخ گدائی کنبوہ، خواجہ محمد صالح، شیخ عبدالنبی، سلطان خواجہ، میر فتح اللہ شیرازی، اور میران صدر جہاں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز رہے۔ اسی طرح جہانگیر کے عہد میں میران صدر جہاں تاحیات صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہا اس کے بعد موسوی خان صدر الصدور بنا۔ شاہجہاں کے ابتدائی عہد میں موسوی خان پندرہ سال تک اس عہدہ پر مامور رہا 1642 میں بادشاہ کی غیر اطمینان بخش کردار کی بنا پر برخاست کر کے اس کی جگہ پر سید جلال الدین گجراتی کا تقرر کر دیا اس کے بعد سید ہدایت اللہ 2 سن جلوس سے اختتام حکومت تک صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہا۔ اورنگ زیب نے اپنے عہد میں آٹھ صدر الصدور کی تقرری کی۔ شاہجہاں کے عہد میں سید جلال الدین تمام صدور میں بہترین تھا اور اپنی علمی فضیلت، دیانت ،ایمانداری اور بے لوثی کے لیے مشہور تھا اور محترم تھا۔

13.3.6 قاضی القضاۃ

مغلوں کا محکمہ عدل اپنی تنظیم، حیثیت اور عظمت میں مرکزی حکومت کے دوسرے شعبوں سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔ اس محکمہ کا سربراہ قاضی القضاۃ ہوتا تھا۔ وہ سلطنت میں محکمہ عدل و انصاف کا اعلیٰ افسر ہوا کرتا تھا۔ وہ عدل و انصاف سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار اور جوابدہ ہوتا تھا۔ وہ فوجداری اور دیوانی دونوں طرح کے مقدمات کی شنوائی کرتا اور فیصلے صادر کرتا تھا اس کی مدد کے لیے بہت سے مفتی اور افسر ہوتے تھے۔ مغل عہد میں قاضی صرف شہروں ہی میں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں بھی مقرر کیے جاتے تھے۔ جج ہونے کے ساتھ قاضی اپنے علاقے کے تمام اوقات کا متولی بھی ہوتا تھا۔

بادشاہ عدل سے متعلق امور میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ روزانہ دربار میں معمولی مقدمے کی سماعت ہوتی ہے۔ اہم مقدمات ہفتہ میں ایک بار، ایک دن صرف عدالتی کاموں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ بادشاہ کے سامنے زیادہ تر فوجداری مقدمے پیش ہوتے تھے۔ دیوانی کے مقدمات بھی پیش ہوا کرتے تھے۔ اکبر نے پنج شنبہ، جہانگیر نے سہ شنبہ اور شاہجہاں نے چہار شنبہ اس کام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اکبر کے

بارے میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ "وہ باب عدل کھولتا ہے اور ایک عام دربار منعقد کرتا ہے۔اس کی عدالت میں صداقت و انصاف کا بول بالا ہے اس کام کے لیے وہ ساڑھے چار گھنٹے صرف کرتا ہے۔وہ کسی شخص کی شہادت اور قسم پر اعتبار نہیں کرتا۔'' ہاکنز یہی باتیں جہانگیر کے لیے لکھتا ہے۔" بادشاہ اس جگہ تمام مقدمات کی سماعت کرتا اور روزانہ تقریباً دو گھنٹوں تک دادرسی کے بیٹھتا" ڈیلائٹ لکھتا ہے۔" جہانگیر ہفتے میں ایک دن سہ شنبہ کو کرسی عدالت پر بیٹھتا ہے اور پیش کیے جانے والے تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات پورے سکون کے ساتھ سنتا ہے اور اپنے فیصلے صادر کرتا ہے جو آخری اور قطعی ہوتا ہے۔'' لاہوری کے مطابق "شاہجہاں چہارشنبہ کو جھروکہ درشن کرتا سے اٹھ کر دولت خانہ خاص میں بیٹھا کرتا تھا۔اس روز متصدیان عدالت دادخواہوں کے یکے بعد دیگرے پیش کرتا بادشاہ توجہ سے ان کی باتیں سنتا اور نرمی سے ان پر جرح کرتا اور وہاں موجود علماء کے تفوے کے مطابق فیصلہ صادر کرتا۔

مغل بادشاہوں کا نظام عدل بالکل اسی نہج پر تھا جسے سلاطین دہلی نے شمالی ہندوستان میں قائم کیا تھا۔بادشاہ ایک قاضی القضاۃ کا تقرر کرتا تھا جسے ایک جج کے اختیارات حاصل ہوتے۔ قاضی القضاۃ کو سلطنت میں ماتحت قاضیوں کو مقرر کرنے کا اختیار حاصل تھا لیکن بادشاہ کی منظوری ضروری تھی۔چھوٹے چھوٹے علاقوں، قصبوں اور پرگنوں میں بھی قاضی مقرر کیے جاتے تھے۔ قاضیوں کی نقد تنخواہ ملتی اور ملازمت کی مدت تک کے لیے آراضی مدد معاش عطا کی جاتی۔ہر پرگنے کی بازاروں کے صحیح نرخ کی تصدیق قاضی کیا کرتے تھے جسے دارالحکومت میں بطور اطلاع بھیج دیا جاتا تھا۔مغلوں کے نظام عدل کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ سختی کے ساتھ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔کسی کے ساتھ کسی طرح کی رورعایت روا نہیں رکھتے اور قانون کی نگاہ میں سب کو برابر سمجھتے تھے۔

13.3.7 مغل انتظامیہ کے دیگر افسران

مذکورہ عہدیداران کے علاوہ دوسرے افسران بھی تھے جو اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ان میں قابل ذکر درج ذیل ہیں۔

1. محتسب: یہ عوام کے اخلاق و کردار سے متعلق شعبہ کا اعلیٰ افسر تھا اس کا کام لوگوں کو بااخلاق بنائے رکھنا تھا۔محتسب یہ دیکھتا تھا کہ مسلمان شریعت کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں یا نہیں۔عوام کے اخلاق کو درست بنائے رکھنے کے لیے اکبر نے شہروں میں شراب کی خرید و فروخت اور طوائفوں کی رہائش کو ممنوع قرار دیا تھا۔
2. مستوفی (چیف آڈیٹر): یہ کارخانہ جات کے حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔پورا حساب تیار کرتا۔مستوفی تحویلدار کی نگرانی میں رہنے والے ہر محکمے کی آمد و خرچ کے گوشوارے تیار کرتا تھا۔
3. میر آتش: یہ داروغہ توپ خانہ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔یہ مغل فوج میں توپ خانے کا اہم افسر ہوا کرتا تھا۔اس کے ذمہ توپ خانے کا نظم و نسق ہوتا تھا۔
4. داروغہ ڈاک چوکی: یہ محکمہ ڈاک و خفیہ شعبہ کا اعلیٰ افسر ہوتا تھا وہ اپنے ماتحت عملہ کے تعاون سے سلطنت کے مختلف حصوں میں وقوع پذید

ہونے والے حادثات وواقعات کی جانکاری اکٹھا کرتا تھااور اس کی اطلاع بادشاہ کوارسال کرتا تھا۔ سلطنت کے مختلف مقامات پر ڈاک لے جانے کا نظم وہی کرتا تھا۔اس کام میں اس کی مدد کے لیے واقعہ نویس، سوانح نگار، خفیہ نویس اور ہرکارے ہوا کرتے تھے۔

13.4 صوبائی نظم ونسق (Provincial Administration)

صوبائی انتظامیہ مرکزی نظم حکومت کی ہم شکل تھا۔اکبر نے ملک کو چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تقسیم کرنے کے بجائے بڑے بڑے صوبے میں تقسیم کرکے منظم و مستحکم کیا۔اس طرح اس نے سارے ملک میں دارالحکومت کے زیراثر یکساں نظام اور ادارے قائم کیے۔اکبر نے ہر صوبے میں ایک سپہ سالار،دیوان،بخشی،میر عدل،صدر،کوتوال،میر بر،میر بحر اور واقعہ نویس مقرر کیے۔صوبوں میں خانساماں اور بیوتات نہیں ہوتے تھے۔نظام مال گزاری کی نگرانی کے لیے عامل، بتکچی،فوطہ دار، یاخزانہ دار، قانون گو اور پٹواری ہوتے تھے اور گاؤں کی سطح پر مقدم اور چودھری ہوتے تھے۔خفیہ نظام کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے واقعہ نویس ہوتے تھے۔صوبے کے اہم شہروں میں پولیس کوتوال کے ماتحت ہوتی تھی۔ان سبھی افسروں کی تقرری مرکزی حکومت کیا کرتی تھی۔اگرچہ کہ تمام افسران، صوبیدار یاحاکم کے زیر نگرانی کام کرتے تھے مگر وہ مرکزی حکومت کے سامنے جوابدہ ہوا کرتے تھے۔صوبے کے اہم افسر کو ناظم،سپہ سالار،صوبیدار،صاحب صوبہ یاولی کہتے تھے۔اس کی تقرری بادشاہ کرتا تھا۔ مسلم فقہاء نے دوطرح کے ناظم یاصوبے دار کی بات کی ہے۔

1۔لامحدود اختیار والے ناظم　　　　2۔محدود اختیار والے ناظم

13.4.1 صوبیدار (Governor)

صوبیدار،صوبہ میں بادشاہ کا نمائندہ اور صوبہ کا اہم افسر ہوتا تھا۔اسے ناظم کہا جاتا تھا۔مغل حکمراں چونکہ مرکزیت میں پورا یقین رکھتے تھے اس لیے وہ صوبیداروں کو بہت زیادہ اختیار دینے کے حق میں نہیں تھے۔صوبیدار کے اختیارات اور فرائض پوری طرح متعین تھے۔انہیں ان کے عہدہ کے مطابق منصب اور اعزازی نشانات انعامات کے ساتھ ہی عہدے کے مطابق انہیں یہ ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری اور فرائض منصبی بحس وخوبی انجام دیں گے۔

ابوالفضل کے مطابق صوبیدار رعایا کا اتالیق و نگران ہوتا ہے۔رعایا کی بھلائی اس کے عدل پسند نظام پر منحصر ہوتی ہے۔اسے سماج کے سبھی طبقوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہئے اور کمزور طبقوں پر ہونے والے ظلم کو اسے روکنا چاہئے۔اسے ہدایت تھی کہ وہ ہمیشہ اسلحہ کا استعمال کرتا رہے۔گھڑ سواری اور شکار کرتا رہے تاکہ وہ چاق و چوبند رہے اور ہمہ وقت اپنے فرائض کے تئیں بیدار رہے۔اس کے اختیارات کو محدود رکھنے کے لیے یہ بھی ہدایات تھیں کہ وہ شان وشوکت میں بادشاہ کے دربار کی نقل نہ کریں۔مجرموں کی کھال کھنچوانے،انہیں ہاتھی کے پیروں تلے روندوانے کی کوشش نہ کرے۔جو بھی صوبیدار ان ضابطوں کی خلاف ورزی کرتا تھا اسے سزا دی جاتی تھی۔

صوبے کے صوبیداروں کا انتخاب ان فوجی افسروں میں سے ہوتا تھا جن میں انتظامی امور کی سبھی خداداد صلاحیت ہوتی۔امید کی جاتی کہ وہ صاحب کردار وایمان دار ہونگے۔شاہجہاں صوبیداروں کی نااہلی یاصوبہ جات کی بدنظمی گوارانہ کرتا تھا۔ بادشاہ تک جس کی شکایت پہنچتی

اسے برطرف کرنے میں وہ کبھی دریغ نہ کرتا اس کی مثال اعظم خان اور شائستہ خان ہیں۔ان دونوں کو گجرات کی صوبیداری سے برطرف کر دیا اس لیے کہ یہ لوگ نااہل تھے اور تربیت خان کو کشمیر کی صوبیداری سے اس لیے برخاست کیا کہ لوگوں نے اس کی شکایت کی تھی۔ برخلاف اس کے ظفر خان کو کشمیر کا صوبیدار اس لیے بنایا گیا کہ لوگ اس کو چاہتے تھے۔صوبیدار کی برطرفی کی ایک اور مثال وزیر خان کی ہے وہ پنجاب کی صوبیداری سے اس لیے برطرف کیا گیا کہ ظلم کرتا تھا۔صوبیداروں کے اختیارات درج ذیل تین شعبہ جات پر مبنی ہے۔

1۔شہری 2۔عدالتی 3۔فوجی

بحیثیت شہری افسر کے وہ پوری انتظامیہ کے نظم و نسق کا سربراہ تھا۔بحیثیت حاکم عدل وانصاف وہ قاضی و میر عدل کے فیصلوں کی اپیل سنتا تھا۔اور بہ لحاظ فوجی افسر اپنے صوبے کے مخصوص عسکری حصہ پر حکمرانی کرتا اور اس کی داشت کا ذمہ دار ہوتا۔وہ اپنے ماتحت افسروں کو برطرف کر سکتا تھا بجز ان لوگوں کے جو براہ راست شہنشاہ کے زیر اثر ہوتے تھے۔وہ کسی کو پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا تھا بجز ان لوگوں کے جن کی سزائے موت کی اجازت مرکز سے حاصل کر لیتا۔وہ لوگوں کے شہری حقوق کا نگران ہوتا اس سے امید کہ جاتی کہ وہ اپنے ماتحتوں کے مشورہ سے انتظامی امور فیصل کرے گا۔صوبیدار کو اپنے پاس فوج رکھنی پڑتی تھی اس فوج کا وہ سربراہ ہوتا تھا۔اس کا کام مقامی بغاوتوں کو فرو کرنا۔ڈاکوؤں کے خلاف مہم چلانا۔صوبے میں امن و آشتی قائم کرنا اور خراب عناصر کی بیخ کنی کرنا تھا۔صوبیدار کی مدت ملازمت کا دار و مدار بادشاہ کی مرضی پر تھا۔اس کے لیے کوئی اصول متعین نہیں تھا۔

13.4.2 صوبائی دیوان

وزارت مال کے براہ راست نمائندے کی حیثیت سے "صوبائی دیوان" کے عہدے کا قائم کرنا اکبر کا کام تھا۔صوبائی دیوان بشمولیت دیگر افسران کے ہر صوبے میں چوبیسویں سال جلوس مقرر کیا گیا۔اکبر کے چالیسویں سال جلوس تک صوبائی دیوان کا اقتدار اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ صوبیدار سے آزاد ہو گیا تھا۔وہ دیوان اعلیٰ کے ذریعہ بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھا اور اپنے کاغذات براہ راست وزیر کو پیش کرتا تھا۔صوبائی دیوان کو صوبائی انتظام میں ایک اہمیت حاصل تھی اور اس کا اختیار و اقتدار صوبے کے انتظامی اور مالی معاملات تک وسیع تھا۔اس کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ زیر کاشت رقبے کی توسیع کے سلسلے میں اقدامات کرتا رہے۔خزانے کا تحفظ اور نگرانی اس کے اہم امور میں شامل تھے۔دیوان کے ذمہ یہ بھی تھا کہ کوئی غیر قانونی رقومات جو حکومت کی طرف سے ممنوع یا معاف کر دی گئی ہے وصول نہ کرے۔دیوان مالیات کا افسر خاص ہوتا تھا۔ نظریاتی اعتبار سے وہ صوبیدار کا ماتحت ہوتا مگر عملی اعتبار سے مرتبہ میں اس کا ہم پایہ ہوتا۔اس کا تقرر براہ راست بادشاہ کرتا اور اس سے امید کی جاتی کہ وہ صوبیدار پر بھی نظر رکھے گا۔ مغل عہد میں صوباجاتی دیوان بیک وقت مقتدر عہدوں پر مامور ہوتا۔ محمد وارث نے شیخ موسیٰ گیلانی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ وہ شاہجہاں کے سن جلوس کے اکیسویں سال میں دیوان،امین اور فوج دار کے مختلف عہدوں پر ملتان میں بیک وقت کام کرتا رہا۔اس قسم کی اور بھی مثالیں موجود ہیں۔صوبائی دیوان صرف مالیات کا خاص افسر ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ مرکزی نظام مالگزاری کے شعبہ کا صوبہ میں نمائندہ ہوا کرتا تھا۔اس کا عہدہ صوبیدار کے بعد تھا۔اکبر کے عہد میں اس عہدہ کی تشکیل ہوئی۔دیوان مرکزی حکومت کے تئیں جوابدہ ہوتا تھا۔ وہ مرکزی سرکار کے دیوان اعلیٰ کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا اور اس کے لیے وہ برابر خط و کتابت کیا کرتا تھا۔وہ

صوبیدار کے دربار میں ضرور حاضر ہوتا تھا مگر اس کا عہدہ صوبیدار کے عہدہ کے برابر ہوتا تھا۔ دیوان کی تقرری کے وقت مرکز سے کچھ خاص ہدایات ملتی تھیں وہ زیر کاشت زمین کی توسیع کرے اور زراعت کو فروغ دے۔ ایمان دار، تجربہ کار اور لائق عامل کی تقرری کرے تاکہ وہ کسانوں کو پر امن طریقے سے مال گزاری ادا کرنے کے لیے تیار ہو سکے۔ دیوان کے محکمے میں دو طرح کے افسر ہوتے تھے:

ا۔ مرکزی دیوان کے ذریعہ مقرر کیے گئے افسر ۲۔ صوبائی دیوان کے ذریعہ مقرر کیے گئے افسر

اس شعبہ میں پیش کار اور داروغہ مرکزی دیوان کے ذریعہ مقرر کیے جاتے تھے۔ بقیہ افسران و عملہ مثلاً منشی، حضور نویس اور محرر وغیرہ کی تقرریاں وہ خود کرتا تھا۔ یہ تمام لوگ اس کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ صوبائی دیوان کے کام درج ذیل تھے۔

- خالصہ محالوں سے مال گزاری وصول کرنا۔
- وصول شدہ بقایا مال گزاری کا حسان رکھان
- مدد معاش میں دی گئی زمینوں کی تفصیل کا تعین رکھنا
- صوبوں میں تعینات افسروں کے کام کے مطابق ان کی تنخواہ متعین کرنا اور ادا کرنا
- خالصہ علاقوں میں دی گئی جاگیروں کا انتظام کرنا
- زراعت کو فروغ دینا
- خزانہ داروں پر نظر رکھنا
- عاملوں کے حساب کی جانچ کرنا اور خراب عاملوں کو عہدے سے ہٹانے کی سفارش کرنا
- بقایہ مال گزاری و نقادی وصول کرنا
- مختلف شعبوں کے خرچ پر کنٹرول رکھنا اور صوبائی ٹکسالوں نظم کرنا وغیرہ

صوبائی دیوان کے دفتر میں مال گزاری سے متعلق آمد و صرف کے تمام حساب کتاب محفوظ رہتے تھے۔ یہیں حساب کی جانچ ہوتی تھی اور اس کی تلخیص تیار کر کے مرکز کو ارسال کر دی جاتی تھی۔ اسے مہینہ میں دوبارہ دیوان اعلیٰ کے پاس صوبہ میں ہونے والے واقعات و حادثات اور خزانہ میں نقد مال کی اطلاع ارسال کرنی پڑتی تھی۔ صوبائی دیوان مال گزاری سے متعلق مقدمات کو بھی فیصل کرتا تھا۔ سرکاری پرگنوں کی مال گزاری سے متعلق مقدموں پر ہوئی اپیل کی سماعت کرتا تھا اور فیصلے بھی دیتا تھا۔ دیوان کے ذریعہ دیے گئے فیصلوں کی اپیل مرکز میں دیوان اعلیٰ کے حضور پیش کی جاسکتی تھی۔

13.4.3 صدر

مرکزی صدر الصدور کی سفارش پر بادشاہ صوبائی صدر کی تقرری کرتا تھا۔ صوبائی صدر مرکزی صدر کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا۔ اس کا دفتر مستقل نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے افسروں کی طرح اس کا بھی تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کا کام صوبہ میں مسلمانوں کے مذہبی امور سے متعلق بھی تھا۔ وہ سیورغال اور مدد معاش گرانٹ جیسے اہم کام کی نگرانی کرتا تھا۔ علماء اور دانشوروں کو دیے جانے والے وظائف کا انتظام کرنا

اور کن لوگوں وظائف، پنشن یا مدد معاش دی جاتی ہیں ان کے ناموں کی سفارش بھی کرتا تھا۔ وہ اپنے پاس دانشوروں، علماء اور مذہبی شخصیات کی فہرست بھی رکھتا تھا۔

13.4.4 قاضی

ہر صوبہ میں ایک قاضی جسے قاضی صوبہ کہتے تھے کی تقرری مرکزی حکومت کے قاضی القضاۃ کی سفارش پر بادشاہ کیا کرتا تھا۔ اسے دیوانی اور فوجداری دونوں طرح کے مقدمات سننے اور فیصلہ دینے کا اختیار تھا۔ وہ مسلمانوں کی شادی وغیرہ کے مراسم ادا کراتا۔ املاک وغیرہ سے متعلق مقدمات کا فیصلہ بھی کرتا تھا۔ عدل وانصاف سے متعلق کاموں میں اس کی مدد میر عدل، مفتی، قاضی، محتسب اور داروغہ عدالت کیا کرتے تھے۔ اس کی سفارش پر سرکاروں کے قاضی کی تقرری بھی ہوتی تھی۔

13.4.5 میر عدل

اس کا کام گواہوں کی گواہی کی جانچ پڑتال کرنا تھا۔ قاضی کی عدالت میں مقدمہ پہنچنے سے پہلے وہ گواہی کی جانچ کر کے اس پر اپنی رپورٹ دیا کرتا تھا جس کی بنیاد پر مقدمے کا فیصلہ ہوتا تھا۔

13.4.6 بخشی

مرکزی حکومت کی انتظامیہ کی طرح صوبہ میں بھی ایک بخشی ہوتا تھا۔ یہ صوبہ میں ان تمام امور کا ذمہ دار ہوتا تھا جو مرکزی حکومت کی انتظامیہ میں بخشی ہوتے تھے۔ میر بخشی کی سفارش پر صوبائی بخشی کی تقرری بادشاہ کیا کرتا تھا۔ صوبہ میں فوج کا انتظام کرنا اس کی اہم ذمہ داری تھی۔ وہ صوبائی فوج کی صلاحیت بنائے رکھنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ بخشی اپنے صوبے میں خفیہ محکمہ کے ذمہ دار کی حیثیت سے بھی کام کرتا تھا اور صوبہ کی تمام سرگرمیوں کی اطلاع مرکز کو بھیجتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مرکز کی مدد کے لیے صوبائی فوجیوں کو بھی بھیجتا تھا۔ فوجیوں کی بھرتی، رہن سہن، ڈسپلن، نظم وضبط اور ان کے فوجی ساز وسامان کا انتظام بھی کرتا تھا۔ فوجیوں کا حلیہ رکھنا اور میر بخشی کے حکم سے فوجیوں اور گھوڑوں کی سالانہ جانچ بھی اسی کے ذمہ تھی۔ باغی اور نافرمان زمین داروں ودیگر سرکش عناصر کے خلاف صوبیدار کی مدد بھی کرتا تھا اور خود بھی حکومت کے مفاد کے تحفظ کے لیے فوجی مہم کی نمائندگی کرتا تھا۔ بخشی صوبیدار کے ماتحت کام کرتا تھا۔ منصب دار کی وفات ہو جانے پر بخشی اس کی جاگیر کو اپنے قبضے میں کر لیتا تھا اور اس کی اطلاع اعلیٰ افسران کو بھیج دیتا تھا۔ بخشی مہینہ میں دوبار اہم اطلاعات بادشاہ کو بھیجتا تھا۔ ان میں مال گزاری کی وصولی، صوبائی امن وامان اور فوجی نظم ونسق کی خبریں ہوا کرتی تھیں۔

13.4.7 کوتوال

ہر صوبے کے ہیڈ کوارٹر پر ایک کوتوال ہوتا تھا جو شہر کوتوال کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ کوتوال کے امور، اختیارات اور فرائض منصبی کا علم ہمیں "مرآۃ احمدی" سے ہوتا ہے جس میں کوتوال کے امور سے متعلق اکبر کی ہدایات درج ذیل ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ "کوتوال

کلرک کے تعاون سے اس جگہ کے مکانوں، عمارتوں اور اس میں رہنے والوں کی فہرست تیار کرے گا اور اس بات کا بھی ذکر کرے کہ وہ کس طرح کے لوگ ہیں۔ ان میں سے کتنے لاوارث ہیں، کتنے کاریگر ہیں، کتنے فوجی ہیں اور کتنے درویش ہیں" اس کے علاوہ کوتوال کے فرائض میں سے درج ذیل چیزیں بھی آتی ہیں۔ یومیہ (روز و شب) جاسوس کوتوال کے دفتر میں محلے میں ہونے والے واقعات و حادثات کے اسباب و علل کو درج کرائیں۔ ایک مہمان کی آمد چاہے وہ قریبی ہو، تعلقاتی ہو یا اجنبی اس کی اطلاع اس محلے کے مکھیا کو ہو جانی چاہئے۔ کوتوال کی ہر آدمی کی آمد و صرف کے بارے جانکاری ہونی چاہئے کیونکہ جب ایک آدمی اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا ہے تو یہ یقینی ہے کہ وہ کرپشن میں ملوث ہے۔ کوتوال کو بازاروں میں اشیاء کی قیمتیں متعین کر دینی چاہئے۔ کوتوال کو اپنے علاقہ میں شراب نوشی اور اس کی آمد و فروخت پر بھی پابندی لگا دینی چاہئے۔

مذکورہ اقوال کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ کوتوال صوبہ کی راجدھانی کا اہم پولیس افسر ہوتا تھا۔ اس کا کام عوام کی نگرانی اور حفاظت کے ساتھ امن و امان قائم کرنا ے تھا۔ وہ رات کو شہر کا گشت لگاتا۔ خفیہ شعبہ میں کام کرنے والوں کی تقرری کرتا۔ گھروں اور سڑکوں کی فہرست تیار کرتا۔ آلہ ناپ و تول کی جانچ کرتا۔ شہر شہر میں آمد و رفت رکھنے والے مسافروں پر نظر رکھتا۔ چوری اور ڈکیتی کو روکنا، چوروں پر کنٹرول رکھنا، شراب بنانے اور بیچنے پر پابندی عائد کرنا۔ لاوارث جائداد کی فہرست تیار کرنا وغیرہ اس کے اہم امور تھے۔ اس کے علاوہ کوتوال سزا دینے والا افسر بھی ہوتا تھا۔ شہر میں پکڑے جانے والے مجرم کو کوتوال کے سامنے پیش کیا جاتا۔ ابتدائی جانچ پڑتال کے بعد جس نوعیت کا معاملہ ہوتا مقدمہ اس نوعیت کی عدالت میں بھیج دیتا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ 'کوتوال کا دفتر ایک طرح کی چوکی تھی جہاں وہ سزا دینے والے افسر کی حیثیت سے مقامی تنازعات و مقدموں کو فیصل کرتا۔'

13.4.8 دیگر انتظامی محکمہ جات

اوپر زیر بحث آئے شعبوں اور عہدیداروں کے علاوہ محتسب، میر بحر اور واعہ نویس کے نام کے افسر بھی ہوا کرتے تھے جو اپنے سے اوپر کے عہدیداروں کا انتظامی امور میں تعاون کیا کرتے تھے۔

1. **محتسب:** ہر صوبے میں ایک محتسب ہوتا تھا اس کی تقرری بادشاہ کرتا تھا۔ یہ صدر الصدور کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس عہدے پر صوبائی صدر بھی کام کرتا تھا۔ محتسب کا کام عوام کے اخلاق و کردار کو بنائے رکھنا تھا۔ شریعت (اسلامی قوانین) کے متعلق مسلم عوام کو زندگی گزارنے کی تلقین کرنا اور ممنوع (حرام) چیزوں سے بچانا اس کے فرائض منصبی میں داخل تھا۔
2. **میر بحر:** صوبے میں میر بحر کا کام فوج کو ندی پار کرنے کے لیے پل کی تعمیر اور کشتیوں کا انتظام کرنا تھا۔ بدرگاہوں اور ندیوں کی جنگی وغیرہ کا کام بھی اسی کے سپرد تھا۔
3. **واقعہ نویس:** ہر صوبہ میں ایک واقعہ نویس ہوا کرتا تھا۔ عموماً صوبہ کا بخشی ہی واقعہ نویس کی حیثیت سے کام کرتا تھا جو صوبہ کے تمام اہم واقعات کی اطلاع بادشاہ کو ارسال کیا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ صوبے میں سوانح نگار، خفیہ نویس اور ہرکارے بھی ہوتے تھے۔ سوانح نگار کا کام ریاسر کے افسروں ان کے عملہ اور دفاتر سے متعلق اطلاعات بھیجنا ہوتا تھا۔ خفیہ نویس اہم مقامات پر مقرر کیے جاتے تھے جو ریاست کا کام کرنے والے افراد اور رونما ہونے والے واقعات کی اطلاع مرکزی سرکار کو بھیجتے تھے۔ ہرکارے صوبے کے چاروں اطراف کی خبریں اور اس کی تفصیلات صوبیدار کے حضور پیش کرتے تھے۔

13.5 مقامی نظم ونسق (Local Administration)

انتظامی امور کو بحسن وخوبی انجام دینے کی غرض سے صوبہ متعدد انتظامی اکائی میں تقسیم تھا۔ مقامی انتظامیہ کے لیے سرکار، پرگنہ اور گاؤں انتظامی اکائی کی حیثیت رکھتے تھے۔

13.5.1 سرکار (*Sarkar*)

صوبہ کے بعد ایک انتظامی اکائی سرکار کہلاتی تھی۔ کئی پرگنہ کو ملا کر ایک سرکار بنتی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے ان شاہجہاں نے متعدد سرکاروں کے لیے افسر مقرر کیے۔ سرکار میں ایک افسر دیوان کا ہوتا تھا جو مال گزاری کے بعض معاملات سے متعلق تھا مثلاً جاگیروں کی تفویض وغیرہ۔ سرکار کے انتظامی امور کے لیے درج ذیل افسران مقرر کیے جاتے تھے۔

1۔ فوج دار: ہر سرکار میں ایک فوجدار تعینات کیا گیا تھا۔ یہ سرکاری سطح پر اہم افسر ہوتا تھا۔ اس کی تقرری بادشاہ کے حکم سے ہوتی تھی۔ وہ سرکار میں صوبیدار کے نمائندے کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ابوالفضل اپنی کتاب آئین اکبری میں فوجدار کے فرائض منصبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسے تمام فوجیوں کے سازوسامان کا معائنہ کرتے رہنا چاہیے۔ گھوڑوں کی فراہمی کرنی چاہیے مگر بغیر ضرورت باغی و سرکش زمین داروں اور کسانوں کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ سرکار میں مجھے انتظام اور امن وامان کے لیے فوجدار جوابدہ تھا۔ وہ اپنی سرکار میں شاہی احکام کا نفاذ کرتا تھا اور مال گزاری کی وصولی میں عمل گزار کا تعاون بھی کرتا تھا۔ وہ سرکار کی فوج اور پولیس پر کنٹرول رکھتا تھا۔

2۔ عمل گزار: سرمار میں مال گزاری کا اعلیٰ افسر عمل گزار تھا جو مرکزی حکومت کے ذریعہ مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کا اہم کام مال گزاری کی تعیین اور اس کی وصولی کرنا تھا۔ ساتھ ہی بدعنوان کسانوں کو سزا دینا تھا۔ سرکار کے ماتحت سیورغال زمین کی نگرانی کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ مال گزاری سے متعلق کاموں کے لیے اس کے ماتحت بہت سے مددگار افسر ہوتے تھے۔ عمل گزار سرکار کی زمین کی پیمائش اور ٹیکس کی تفصیل مرکزی حکومت کو بھیجتا تھا، بتکچی، خزانہ دار جیسے افسروں کے ذریعہ کیے گئے کاموں کا معائنہ بھی کرتا تھا۔ ڈاکٹر پی سرن کے مطابق عمل گزار و سرکار میں مال گزاری کا اعلیٰ افسر ہوتا تھا۔

3۔ قاضی: ہر سرکار میں ایک قاضی ہوتا تھا جس کی تقرری صدرالصدور کرتا تھا۔ قاضی شریعت کے مطابق مذہبی مسائل کا حل پیش کرتا تھا۔ قاضی کے تعاون کے لیے ایک مفتی ہوتا تھا جو اصول شریعت یعنی اسلامی قوانین کی وضاحت کرتا تھا۔

4۔ بتکچی: عمل گزار کے بعد سرکار میں شعبہ مال گزاری میں اہم افسر بتکچی ہوتا تھا۔ اسے مال گزاری سے متعلق پوری جانکاری ہوتی تھی۔ اس

کے پاس زمین کی پیائش،اس کی درجہ بندی، پیداوار وغیرہ کی تفصیل ہوتی تھی جس کی بنیاد پر عمل گزار مال گزاری کی تعیین کرتا تھا۔اسے ہر موسم کی فصل اوراس کی مال گزاری کا بیوراسالانہ تفصیل کے ساتھ عمل گزار کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا۔

5۔ خزانہ دار: ہر سرکار میں ایک خزانہ دار ہوتا تھا جو شاہی خزانہ کا انچارج ہوتا تھا۔اس کے پاس مال گزاری کا روپیہ جمع کیا جاتا تھا جسے وہ مرکزی شاہی خزانے کو بھیج دیتا تھا۔ مگر بغیر صوبائی دیوان کی اجازت کے وہ روپیہ خرچ نہیں کر سکتا تھا۔

13.5.2 پرگنہ (*Pargana*)

عام طور سے پرگنہ ایک انتظامی اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ کئی گاؤں کو ملا کر ایک پرگنہ بنتا تھا۔ شیر شاہ کے پرگنہ میں اکبر نے کچھ اصلاحات کیں تھیں۔ پرگنہ کا نظم ونسق درج ذیل افسروں کے ذریعہ ہوتا تھا۔

شقدار: پرگنے کا اعلیٰ افسر شقدار کہلاتا تھا جو پرگنہ میں امن وامان کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ فوجدار کے ماتحت ہوتا تھا۔کسانوں سے مال گزاری کی وصولی میں وہ عامل کا تعاون بھی کرتا تھا۔اس کے علاوہ شقدار پرگنہ میں ایک مصنف کی حیثیت سے فوجداری مقدمات کو فیصل کرتا تھا۔

عامل: پرگنہ میں انتظام مال گزاری کا بڑا حاکم عامل ہوتا تھا۔اس کی مدد کے لیے ایک بڑا عملہ ہوتا تھا جس میں سب سے زیادہ اہم بتکچی ہوتا تھا۔ ہر پرگنے میں تخمینہ اور وصولی کا کام عامل انجام دیتا تھا۔ عامل پرگنہ سطح پر مقامی انتظام کا سربراہ ہوتا تھا۔ پرگنہ میں عامل کا وہی کام تھا جو سرکار میں عمل گزار کا ہوتا تھا۔ عامل کے ماتحت کارکن ہوتے تھے جو کلرک کی طرح اس کی مدد کرتے تھے۔ عامل ایک کام یہ بھی تھا کہ کاشت اراضی پر کاشت برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرے اوراس کی مال گزاری وصول کرائے۔

خزانہ دار (فوطہ دار): ہر پرگنے کا اپنا خزانہ ہوتا تھا جس کا انتظام خزانہ دار کی سربراہی میں متعدد افسران کے سپرد ہوتا تھا۔ خزانہ دار کو فوطہ دار بھی کہتے تھے۔ اکبر کے عہد میں عامل، کارکن اور شقدار پرگنے کے خزانے کی حفاظت اور رقم کی مناسب ادائیگی کے سلسلے میں مشترکہ طور سے ذمہ دار تھے۔ بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خزانے کے عملے میں داروغہ خزانہ کے عہدہ کا اضافہ کیا گیا۔ فوطہ دار مال گزاری کی شکل میں ہونے والی رقم کو جمع کرکے اسے مرکزی حکومت کو بھیجتا تھا۔ فوطہ دار کے امور منصبی میں مال گزاری کی وصولیابی، نقد رسیدوں کی حفاظت، حسابات تیار کرنا اور خزانے میں جمع شدہ نقد رقم کی مناسب ادائیگی شامل تھی۔

قانون گو: ہر پرگنہ میں ایک قانون گو کی ڈگری ہوتی تھی۔ پرگنہ کی سطح پر تعینات قانون گو اپنے جملہ کاغذات تیار کرتا تھا۔ لہٰذا مقامی نظام مال گزاری میں عمل دخل کے اعتبار سے وہ ایک اہم افسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ عام طور پر ایک پرگنہ میں ایک قانون گو ہوتا ہے۔ لیکن بعض پرگنوں میں ایک سے زیادہ قانون گو بھی ہوتے تھے۔ قانون گو سب سے اہم کام آراضی سے متعلق مختلف فریقین کے مفادات کے بارے میں مکمل اطلاع اور تخمینے کی شرحیں، طریق کار، رسومات اور قواعد کے بارے میں ضروری کاغذات محفوظ رکھتا تھا۔اس کے پاس کئی کتابچہ ہوتے تھے جس میں پرگنہ کی زراعت کے تمام احوال وکیفیات اوراس سلسلے کی تمام اطلاعات درج ہوتی تھی۔ قانون گو آراضی سے متعلق اندراج تیار کرتا تھا قانون گو کی مدد کے لیے بہت سے پٹواری ہوتے تھے۔

13.5.3 گاؤں (Village)

انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی گاؤں ہوتا تھا۔ کئی گاؤں کو ملا کر ایک پرگنہ بنتا تھا۔ گاؤں کے اعلیٰ افسر چودھری یا مقدم کہلاتے تھے۔ یہ گاؤں اور انتظامیہ کے بیچ کی کڑی کا کام کرتے تھے۔ کچھ علاقوں میں رائے یا راوت بھی گاؤں کے مکھیا کا کردار ادا کرتے تھے۔ گاؤں کے مکھیا کا کام عام نگرانی رکھنا، تنازعات کو ختم کرنا، پولیس کے فرائض نبھانا اور گاؤں کے کسانوں سے جو مال گزاری وصول کرتے تھے اس کے لیے انہیں گاؤں کی مال گزاری میں سے ڈھائی فیصد دستوری ملتی تھی۔ اس کا کام گاؤں میں امن وامان قائم کرنا اور نقادی کی تقسیم کرنا ہوتا تھا۔ گاؤں کا دوسرا اہم افسر پٹواری ہوتا تھا وہ کسانوں سے وصول کیے جانے والے لگان اور قابل کاشت زمین کی تفصیل رکھتا تھا اسے گاؤں کی لگان میں سے ایک فیصد دستوری ملتی تھی۔ پٹواری گاؤں کا سب سے کم تر درجہ کا افسر ہوتا تھا۔ لیکن دیہی انتظامیہ میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ آج کے دور کے لیکھپال کی طرح ہوتا تھا۔ ابوالفضل دیہی انتظامیہ کے سلسلے میں کوئی جانکاری نہیں دیتا۔ البتہ شیر شاہ کے عہد میں دیہی انتظامیہ کا بہترین تصور تھا جہاں مقدم، چودھری اور پٹواری وغیرہ گاؤں کے نظم ونسق کو چست رکھتے تھے اور ڈکیتی وزنا جیسی واردات اور جرائم کی روک تھام کرتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اکبر اور بعد کے مغل حکمرانوں نے شیر شاہ کے اسی نظم ونسق کا گاؤں کی سطح پر نافذ کیا۔ گاؤں کے دوسرے کرمچاریوں میں چوکیدار، مذہبی رسم وروایت کو ادا کرنے کے لیے مولوی اور پروہت ہوا کرتے تھے۔

13.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عہد مغل میں نظم ونسق کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے سلطنت صوبوں میں تقسیم تھی۔ صوبوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ اکبر کے عہد پہلے 12 صوبے تھے بعد میں تین صوبوں کا اضافہ ہوا اس طرح کل 15 صوبے ہو گئے۔ جہانگیر کے عہد میں 17 جب کہ شاہجہاں کے عہد میں 22 اور اورنگ زیب کے عہد میں صوبوں کی تعداد 21 ہو گئی۔ صوبہ کا سب سے بڑا افسر صوبیدار (سپہ سالار) ہوتا تھا وہ صوبہ میں بادشاہ کی طرح ہی کام کرتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے بہت سے عہدیدار ہوتے تھے۔ ان میں دیوان، بخشی، فوجدار، کوتوال، قاضی، صدر اور عامل وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ دیوان صوبے کے نظام مال گزاری سے متعلق کام دیکھتا تھا۔ صوبیدار کو خفیہ اطلاعات، خفیہ نویس یا واقعہ نویس سے ملتی تھی۔ انتظامیہ کی چھوٹی اکائی سرکار تھی۔ ان کی تعداد بھی متعین نہیں تھی۔ سرکار میں اہم افسر فوجدار، عمل گزار، قاضی، کوتوال، بتکچی اور فوطہ دار ہوتے تھے۔ ان کا کام سرکار میں امن وامان برقرار رکھنا اور مال گزاری وصول کرانا تھا۔ ان کے کاموں کی نگرانی صوبیدار کرتا تھا۔ سرکار کئی پرگنوں کو ملا کر بنتی تھی۔ پرگنہ کا نظم ونسق شقدار، عامل، فوطہ دار، کارکن اور قانون گو دیکھتے تھے۔ انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی گاؤں تھی۔ ایک پرگنہ کئی گاؤں ملا کر بنتا تھا۔ گاؤں کی انتظامیہ مقامی لوگوں کے تعاون سے چلتی تھی۔ مقدم (مکھیا) پٹواری، چوکیدار یہ گاؤں کی انتظامیہ کے اہم لوگ تھے۔ قانونی طور پر بادشاہ خدا کا خلیفہ ہوتا تھا اور قانون الٰہی کے مطابق حکومت کرنا اس کا فرض تھا۔ آئین کے مطابق وہ مختار کل تھا۔ مغل انتظامیہ کی پوری مشین کی قوت کا مخرج بادشاہ ہوتا تھا۔ پوری انتظامیہ کو بحسن وخوبی سرگرم رکھنے کے لیے مرتبہ اور حیثیت رکھنے والے وزراء کی تقرری ہوئی تھی اور ان کے درمیان کاموں کو تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح وکیل، دیوان، میر بخشی، میر ساماں، صدر الصدور جیسے محکموں کے علاوہ قاضی القضاۃ، محتسب، مستوفی، میر آتش، داروغہ ڈاک چوکی جیسے افسروں کا تقرر بھی ہوا کرتا

تھا۔اس کے علاوہ ناظر بیوتات، میر بر، میر بحر اور داروغہ ٹکسال نامی افسران بھی ہوتے تھے جن کی نگرانی میں مرکزی نظام حکومت پورا نظام متحرک تھااور ہر شعبہ باقاعدگی سے کام کرتا تھا۔اہل کار سے لیکر وزیر محکمہ تک اپنے فرائض، حیثیت اور روزمرہ کے کام س واقف تھا۔عدل و انصاف کے معاملے میں بادشاہ انصاف پرور تھے۔سختی کے ساتھ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔کسی کے ساتھ کسی طرح کی رعایت نہیں ہوتی تھی اور قانون کی نگاہ میں سب برابر تھے۔مغلوں کا محکمہ عدل اپنی تنظیم ،نوعیت، حیثیت اور عظمت میں مرکزی حکومت کے دوسرے شعبوں سے کہیں زیادہ بہتر تھا۔

13.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

مہراز ک	:	شاہی مہر، مہر اعظم
تمن	:	دس ہزار سواروں کا دستہ
دبیر	:	چیف سکریٹری
میر بخشی/بخشی	:	فوجی محکمہ کا سربراہ اعلیٰ
میر سامان	:	حکومت کے خار خانوں اور مال خانوں کی دیکھ بھال کرنے والا سب سے بڑا عہدیدار
صاحب توجہ	:	فوجی محاسب
یومیہ داران	:	وہ عہدیدار اور دوسرے افراد جو کسی منصب کے بغیر نقد تنخواہ یا بھتہ پاتے تھے۔
مشرف کل	:	چھوٹی بڑی تمام چیزوں کا محاسب
سیورغال	:	لگان سے مستثنیٰ زمین
مقدم	:	گاؤں کا مکھیا
عامل یا عمل گزار	:	سرکار (ضلع) کا اہم افسر جن کا کام مال گزری سے متعلق تھا۔
شقدار	:	فوجی افسر: جو پرگنہ میں پولیس کا انتظام کرتا تھا اور مال گزاری وصول کرنے میں مدد کرتا تھا۔
کروڑی	:	مال گزاری وصول کرنے والا افسر

13.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

13.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اکبر کا پہلا وزیر کون تھا۔
2. منعم خان کس مغل بادشاہ کا وزیر تھا۔
3. ٹوڈرمل کس کے عہد میں دیوان بنا۔

4. برار، خاندیش اور احمد نگر قلعہ کی فتح کے بعد اکبر کے صوبوں کی تعداد کتنی تھی؟

5. کس سن میں اکبر نے اپنی سلطنت کو 12 صوبوں میں تقسیم کیا۔

6. جہانگیر کے عہد میں کل کتنے صوبے تھے؟

7. اورنگ زیب کی وفات کے وقت کتنے صوبے تھے؟

8. صوبیدار کی تقرری کون کرتا تھا؟

9. دیوان کی تقرری کس کے ذریعہ ہوتی تھی؟

10. مقامی انتظامیہ کی سب سے چھوٹی اکائی کیا تھی؟

13.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. وکیل (وزیر اعظم) کے فرائض پر روشنی ڈالیں۔

2. میر ساماں کے اختیارات و فرائض تحریر کریں۔

3. صدر الصدور کی اہم ذمہ داریوں پر نوٹ لکھیں۔

4. بخشی کے اختیارات پر روشنی ڈالیں۔

5. پرگنہ کے افسران پر مختصر نوٹ لکھیں۔

13.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل نظریہ بادشاہت پر تفصیلی نظر ڈالیں۔

2. مغل سلطنت کے مرکزی ڈھانچہ پر تفصیلی مضمون لکھیں۔

3. صوبائی انتظامیہ کی نوعیت کا جائزہ پیش کریں۔

13.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

---

1. U.N. Day, *The Mughal Government*, Delhi, 1970.
2. J.N. Sarkar, *The Mughal Administration*, Culcutta, 1935.
3. I.H. Qureshi, *The Administration of the Mughal Empire*, Patna, 1979.
4. Ibne-Hasan, *The Central Structure of the Mughal Empire*, London, 1936.

اکائی 14۔ مغل سلطنت کا زوال

(Decline of the Mughal Empire)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 مغل سلطنت کے زوال کے اسباب
14.2.1 جانشینی کے اصول کا فقدان
14.2.2 اورنگ زیب کے نااہل جانشین
14.2.3 امراء کی سیاسی گروہ بندیاں
14.2.4 معاشی اور زرعی بحران
14.2.5 جاگیرداری نظام
14.2.6 فوجی نظام
14.2.7 مراٹھوں کا عروج
14.2.8 بیرونی حملے
14.3 اورنگ زیب اور مغل سلطنت کا زوال
14.4 مغل سلطنت کا زوال اور مورخین کی آراء
14.5 اکتسابی نتائج
14.6 کلیدی الفاظ
14.7 نمونہ امتحانی سوالات
14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.8 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

14.0 تمہید (Introduction)

ظہیر الدین محمد بابر (1526-1530) نے 1526 میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی کو شکست دینے کے بعد ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ حالانکہ وہ اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا جس کے باعث اس کے جانشین اور بیٹے ہمایوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے کسی طرح زندگی کے آخر میں سلطنت دوبارہ حاصل کر لی۔ اس کے بیٹے اکبر نے اسے مضبوط کیا اور ہم عصر راجپوت ریاستوں اور سیاسی طاقتوں کے ساتھ صلح اور دوستی کی پالیسی اپنائی اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر کے مغل سلطنت کی ترقی اور استحکام کے لیے راستہ ہموار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کے عہد میں مغل سلطنت کی توسیع و ترقی ممکن ہو سکی۔ جہانگیر کا عہد بھی اچھا رہا۔ عہد شاہجہاں میں مغل سلطنت اپنے ارتقا اور عروج کی آخری منزل پر تھی۔ اس عہد میں فن تعمیر نے خوب ترقی کی اور معاشی لحاظ سے مغل سلطنت بام عروج پر تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں علاقائی توسیع تو ہوئی لیکن سلطنت کو مسلسل بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلوں کی دکن پالیسی جس کی ابتداء، اکبر نے کی تھی، اورنگ زیب عالمگیر (1658-1707) نے اپنی صلاحیت سے بیجاپور اور گولکنڈہ کو مغل سلطنت میں شامل کر کے تکمیل کی۔ اس طرح اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں مغل سلطنت بہت وسیع و عریض ہو گئی، یہ سلطنت اورنگ زیب کے کمزور جانشینوں کے عہد میں زوال پزیر ہو گئی۔ 18 ویں صدی کی ابتداء ہی سے مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا، نئی خود مختار ریاستوں کا عروج شروع ہوا، سکھ جاٹ اور مراٹھوں نے مغل سلطنت کے خلاف بغاوتیں کیں اور بیرونی حکمرانی نے اسی عہد میں ہندوستان پر حملے کیے۔

18 ویں صدی نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں زبردست تغیرات کا مشاہدہ کیا۔ ہندوسران میں اس کی اہمیت اس لیے تسلیم کی جاتی ہے کہ عظیم مغل سلطنت جو تقریباً دو صدی تک دنیا بھر کی ہم عصر سلطنتوں میں اپنی شان و شوکت اور استحکام کی وجہ سے ممتاز رہی تھی اور جس نے ملک کے اتحاد کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف میدانوں میں ترقی کی تھی، بالآخر 18 ویں صدی کی ابتداء میں زوال پزیر ہونے لگی۔ اس کا رقبہ بتدریج سمٹ کر دہلی کے قرب وجوار تک محدود ہو گیا۔ 1803ء میں دہلی میں بھی انگریزوں کو عمل دخل حاصل ہو گیا۔ مغل سلطنت کا زوال محض ایک حکمراں خاندان کا زوال نہ تھا بلکہ یہ ایک خاص طرز زندگی میں انقلابی تبدیلیوں کے باعث ہوا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ زندگی کے مختلف میدانوں میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں وہ اس کے زوال کا باعث بنیں۔ عام طور سے مغل تاریخ کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1. بابر سے اورنگ زیب تک (1526تا1707)
2. 1707 کے بعد سے 1837ء تک جب آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کو بغاوت کی وجہ سے معزول کیا گیا۔

پہلا دور سیاسی استحکام، شان و شوکت اور فتوحات کا دور کہلاتا ہے جب کہ دوسرے دور کو سیاسی انتشار، بدامنی اور زوال کا دور کہا جاتا ہے جس میں مغل سلطنت آہستہ آہستہ کمزور ہوئی اور اس کی جگہ دوسری طاقتوں نے لینی شروع کر دی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب یورپی اقوام نے

ہندوستان کی سیاست میں عمل دخل شروع کیا اور بالآخر انگریزوں کو اس کا موقع مل گیا کہ انہوں نے دوسری یورپی اقوام کو راستے سے ہٹا کر خود ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں مغلوں کے بعد ایک یورپی حکومت قائم ہوئی جو ہندوستانی ثقافت و روایت سے سرے سے اجنبی تھے۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- مغل سلطنت کے زوال کے اسباب جان سکیں گے۔
- اورنگ زیب اور اس کے جانشین مغل سلطنت کے زوال میں کہاں تک ذمہ دار ہیں، سمجھ سکیں گے۔
- مغل امراء کی سیاسی گروہ بندیاں مغل سلطنت کے زوال کا کس طرح باعث بنیں، تجزیہ کر سکیں گے۔
- جاگیرداری نظام، کسانوں کی بغاوت اور معاشی بحران جیسے نظریات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- فوجی نظام کی کمزوری یا اندرونی اور بیرونی حملے مغل سلطنت کے زوال کا سبب تھے؟ جواب دے سکیں گے۔

14.2 مغل سلطنت کے زوال کے اسباب (Causes for the Decline of Mughal Empire)

1707ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد حکومت تو 1857 تک برقرار رہی۔ مگر مغل سلطنت کا طمطراق اور دبدبہ اسی کے بعد کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں حکومت کا شان و شوکت اور عزت و وقار بالکل ختم ہو گیا تھا۔ شاہ عالم کے متعلق یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ 'حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم'۔ اطہر عباس رضوی لکھتے ہیں کہ 'اورنگ زیب کے بعد اگر کوئی اکبر اعظم جیسا بادشاہ پیدا ہو جاتا تو مغل سلطنت زوال سے بچ سکتی تھی'۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اورنگ زیب کے بعد جو بھی حکمراں ہوئے تمام حکمراں نااہل تھے۔ ان میں کوئی اکبر جیسا لائق بادشاہ نہیں ہوا۔ اس طرح مغل سلطنت کے زوال کے لیے بعد کے حکمرانوں کو ایک حد تک ذمے دار مانا جا سکتا ہے، لیکن اتنی بڑی سلطنت کے زوال کی ذمہ داری کسی ایک سبب یا کسی ایک حکمراں کے سر نہیں ڈالی جا سکتی بلکہ اس کے زوال میں مختلف قسم کے اسباب کارفرما تھے جن میں جانشینی کے اصول کا فقدان، اورنگ زیب کے بعد کے نااہل حکمراں، مغل امراء کی سیاسی چپقلش اور بغاوتیں، معاشی اور زرعی بحران، جاگیرداری نظام، فوجی نظام میں در آئی کمزوری، مراٹھوں کا عروج اور بیرونی حملے قابل ذکر ہیں۔

14.2.1 جانشینی کے اصول کا فقدان (Absence of a Principle of Succession)

مغلوں کے یہاں جانشینی کا کوئی متعین اصول و ضابطہ نہیں تھا۔ بابر نے ضرور اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کو اپنا جانشین بنایا مگر اس کے دوسرے بھائی مطمئن نہیں ہوئے اور برابر مشکلات پیدا کرتے رہے۔ ہمایوں کا بڑا اکبر تھا لیکن مرزا حکیم نے اسے تاحیات بادشاہ تسلیم نہیں کیا۔ سلیم اکبر کا اکلوتا لڑکا تھا مگر سلیم کے سلوک و اخلاق سے جب وہ ناراض ہو گیا تو اس نے اپنے پوتے خسرو میں دلچسپی دکھائی جس سے شہزادہ

سلیم نے غیر مطمئن ہو کر بغاوت کر دی تھی۔ اکبر کے خلاف سلیم کی اس بغاوت کی پیروی میں اس کے بیٹوں اور پوتوں نے بھی بغاوت کی۔ جہانگیر کے تخت نشین ہوتے ہی شہزادہ خسرو نے بغاوت کر دی اور جہانگیر کے آخری دور حکومت میں شاہجہاں بھی باغی بن بیٹھا تھا۔ بادشاہ بننے کے بعد شاہجہاں نے اپنے بڑے بیٹے دارا شکوہ کو اپنا جانشین بنانا چاہا تھا مگر اس کے دوسرے تین بیٹوں شجاع، اورنگ زیب اور مراد نے اس کی مخالفت کی اور تخت طاؤس پر تمکن ہونے کے لیے بھائیوں کے درمیان تخت نشینی کی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس جنگ میں خون خرابہ کے بعد اورنگ زیب بادشاہ بنا تھا۔ اس طرح اورنگ زیب کے عہد تک جانشینی کے سوال کو لے کر بیٹوں اور بھائیوں کی بغاوت ایک روایت بن گئی تھی جو سلطنت کے لیے نقصاندہ ثابت ہوئی۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں شہزادہ خرم کی بغاوت کے سبب قندھار **مغل سلطنت** سے علاحدہ ہو گیا تھا۔ شاہجہاں کے بیٹوں میں تخت کے حصول کے لیے اس سے صرف جان مال کا ہی نقصان نہیں ہوا بلکہ انتشار وافرا تفری پیدا کرنے والی طاقتوں کو ابھرنے کا اچھا موقع ملا۔ مگر اورنگ زیب نے بادشاہ بننے کے بعد ان باغی طاقتوں کو ایک ایک کر کے زیر کیا اور صلطنت کو زوال سے بچا لیا۔

جانشینی کی جنگ کی روایت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اسے جاری رکھا اور تخت وتاج کے حصول کے لیے جنگوں کا سلسلہ جاری رہا اور مرکز مخالف طاقتوں کو سرکشی وبغاوت کا موقع ملتا رہا۔ مرکز مخالف طاقتیں ہمیشہ سرگرم رہیں جس کی وجہ سے مغل سلطنت کا نظم ونسق ڈھیلا اور کمزور پڑتا گیا اور سلطنت کے زوال کی ابتداء ہو گئی یا سلطنت زوال پزید ہو گئی۔

14.2.2 اورنگ زیب کے نااہل جانشین (Incompetent Successors of Aurangzeb)

مغل انتظامیہ میں بادشاہ ہی مالک کل ہوتا تھا اور سلطنت کے تمام عہدیدار کی تقرری بادشاہ ہی کرتا تھا۔ اس لیے مغل انتظامیہ کی کامیابی یا ناکامی بادشاہ کے اخلاق اور اس کی لیاقت وصلاحیت پر منحصر ہوتی تھی۔ بابر سے اورنگ زیب تک تمام بادشاہ **انتظام وانصرام ہوں میں** تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں جس کے باعث مغل سلطنت ترقی کرتی رہی مگر 1707ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں میں سیاسی ودوراندیشی کا فقدان تھا جس کے باعث مغل سلطنت زوال پزید ہوتی گئی۔

بہادر شاہ(1712-1707)نے مذہبی رواداری کی روایتی پالیسی اپنائی مگر اس میں اکبر جیسی ہمہ جہت صلاحیت نہیں تھی اس لیے وہ مغل سلطنت کو زوال سے نہیں بچا سکا۔ اس کا جانشیں جہاندار شاہ(1713-1712) عیش وعشرت کا شکار ہوا۔ وہ اپنی ملکہ خاص، لال کماری کے زیر اثر تھا۔ ملکہ کے توسط سے دربار میں نااہل لوگوں کو اونچے اونچے عہدے ملے۔ آخر کار امراء کی ناراضگی کا شکار ہو کر تخت سے اتارا گیا اور مار ڈالا گیا۔ جہاندار شاہ کے بعد فرخ سیر (1719-1713)سید برادران حسن اور حسین کی مدد سے تخت نشین ہوا۔ اسے اپنے اہم فرائض اور ذمہ داریوں کا قطعاً احساس نہ تھا۔ اس کے عہد میں مغل دربار میں سید برادران چھائے رہے جو باصلاحیت اور بااثر امراء تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ تک مغل سلطنت کو کئی خطروں سے بچایا۔ مگر جب فرخ سیر نے ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سازش کی تو انہوں نے فرخ سیر کو تخت سے اتار کر 1719ء میں قتل کر دیا اور اس کے بعد محمد شاہ(1748-1719) کو تخت پر بٹھایا۔ محمد شاہ کو بحیثیت حکمراں طویل

مدت ملی مگر وہ بھی اپنے پیشرو حکمرانوں سے بہتر نہیں تھا۔ وہ جہاندار شاہ کی طرح عیش پرست اور عورتوں کا دلدادہ تھا۔ محمد شاہ نے بھی فرخ سیر کی طرح سے سید برادران کے خلاف سازش کی اور 1722ء تک ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا مگر دربار میں حریف امراء کا بول بالا ہو گیا۔ اس دور میں مغل سلطنت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ سکھ، جاٹ، مراٹھے بے حد سرکش ہو گئے تھے اور بیرونی حملوں نے خصوصاً نادر شاہ کے حملے نے مغل سلطنت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اسی کے دور میں نئی ریاستوں کو عروج ہوا۔

محمد شاہ کے جانشین احمد شاہ (1748-1754) اور احمد شاہ کے جانشین عالمگیر ثانی (1754-1759) کے زمانے میں مغل بادشاہ محض نام کا رہ گیا تھا۔ حکومت کا کاروبار پوری طرح سے امراء کے ہاتھ آ چکا تھا۔ شاہ عالم ثانی (1760-1806) نے کچھ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا لیکن بعد میں امراء کی سیاست کا شکار ہو گیا۔ اس کے زمانے میں مراٹھوں کا دلی پر قبضہ کرنے کا خواب پورا ہوا۔ غلام قادر نے شاہ عالم کی بے عزتی کی اور اسے بے دخل کر دیا۔ اس کے عہد میں حکومت امراء کے ہاتھ میں رہی۔ پھر سندھیا کے ہاتھ میں بعد میں انگریزوں کے ہاتھ میں۔ اس کے بعد اکبر ثانی (1806-1837) اور بہادر شاہ ظفر (1837-1857) انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے اور آخرکار ان مغل حکمرانوں کی نااہلی اور امراء کی سازش نے مغل سلطنت کو زوال کے دہانے پر پہنچا دیا۔ ولیم اردن نے مغل سلطنت کے زوال کو حکمرانوں اور امراء کے ذاتی معیار اور عدم صلاحیت کی روشنی میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔

14.2.3 امراء کی سیاسی گروہ بندیاں (Political Factions among the Nobles)

مغل دربار میں امراء کی گروہ بندیاں مغل سلطنت کے لیے نقصاندہ ثابت ہوئیں۔ کیونکہ جس وقت مغل بادشاہ کو نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے بیرونی اور جاٹ، سکھ اور مراٹھوں کی اندرونی بغاوت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس وقت مغل دربار علاحدہ علاحدہ گروہ میں تقسیم ہو گیا تھا جس کے باعث مغل سلطنت زوال پزیر ہوئی اور اس کا خاتمہ یقینی ہو گیا۔ جس پر امیر طبقہ کی مدد سے بابر نے ہندوستان کے طاقت ور مخالفین کو زیر کر کے مغل سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اور اس کے بعد ہمایوں سے اورنگ زیب تک کے مغل بادشاہوں نے جس مغل سلطنت کو طاقت و سعت کے بام عروج پر پہنچایا تھا وہ امراء طبقہ اب اپنے مفاد کے حصول، آپسی رنجش اور حسد و جلن میں مصروف ہو گیا۔ ان حالات میں اہل اور دوراندیش حکمراں کی ضرورت تھی مگر افسوس کہ اہل حکمراں کا فقدان تھا جس کی وجہ سے حالات میں اصلاحات ناممکن تھی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد دربار ایرانی اور تورانی گروہ میں تقسیم ہو گیا تھا جس میں تورانی سنی مسلک کے تھے اور ان کے آباء واجداد مرکزی ایشیاء سے آئے تھے۔ ایرانی شیعہ مسلک کے تھے جن کے آباء واجداد ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دونوں گروہ کے امیر سلطنت کے مفاد کی فکر نہ کر کے ایک دوسرے کے خلاف سازش رچنے میں مشغول رہتے۔ امراء کی اس سیاسی گروہ بندی اور آپسی حسد و جلن کے باعث بادشاہ کی پوری طاقت و صلاحیت بھی باغیوں کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ان دونوں گروہوں کی آپسی دشمنی کے باعث ہی نادر شاہ کے حملے کے وقت مغل سلطنت کے بے پناہ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا اور مغل سلطنت کی بنیاد کمزور ہوئی۔

امراء سلطنت کے مفاد کے مقابلے اپنے فائدے کو اہمیت دینے لگے تھے۔اورنگ زیب کی وفات کے بعد معظم خان، مرزا راجہ جئے سنگھ ،فاضل خان، جعفر خان اور رانے راگھوناتھ جیسے لائق اور وفادار امراء کا فقدان ہوگیا تھا۔ بعد کے مغل حکمرانوں کے عہد میں سوانی جے سنگھ ،زوالفقار خان، نظام الملک، خان دوران وغیرہ ایسے امیر تھ جن کی وفاداری مشتبہ تھی اور یہ سب اپنے مفاد کے حصول میں ہی مصروف رہتے تھے۔" جادوناتھ سرکار کا کہنا ہے کہ پوری سال گزاری کی اوپری آمدنی مغل امراء کی عیاشی میں صرف ہوتی تھی اوران کی عیش وعشرت کی زندگی ایسی ہوتی تھی کہ جس کا خواب خود شاہ ایران اور مرکزی ایشیاء کا سلطان نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ولی کے امراء کے محلوں میں عیش پرستی اپنی انتہاء پر تھی۔ان کے حرم ہمیشہ لاتعداد بیرونی ملکوں کی مختلف کردار کی اور ذات و نسل کی عقل مند عورتوں سے بھرے رہتے تھے"۔اس طرح بعد کے حکمرانوں کے عہد میں بداخلاق وبد کردار امراء کی وجہ سے مغل سلطنت زوال کی طرف بڑھی۔ بعد کے مغل حکمراں امراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گئے اور مغل سلطنت کے زوال کو روک نہ سکے۔

14.2.4 معاشی اور زرعی بحران (Economic and Agrarian Crisis)

شاہجہاں کا عہد حکومت معاشی اعتبار سے خوشحال تھا۔اورنگ زیب کا عہد بھی معاشی نقطہ نظر سے اطمیان بخش تھا مگر اس کے جانشینوں اور بعد کے حکمرانوں کے عہد میں شاہی خزانہ خالی ہونے لگا تھا اور سلطنت کی معاشی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ ہم عصر مورخ خافی خان لکھتا ہے کہ دو بہادر شاہ کے چار سال اور دوماہ کے دور حکومت میں تیرہ لاکھ کا جو خزانہ اسے حاصل ہوا تھا خرچ ہو چکا تھا۔ بادشاہ کی آمدنی اتنی کم تھی کہ خرچ نہیں چل سکتا تھا اسی لیے شاہی محکموں میں کفایت شعاری سے کام لیا جاتا تھا خصوصاً بادشاہ کے ذاتی خرچ میں بہت حد تک کٹوتی کردی گئی تھی۔ جہاندار شاہ کے عہد میں تو پیسہ نہ ہونے کے باعث شاہی کارخانے کے سونے اور چاندی کے برتنوں کو فروخت کرکے فوجیوں کی تنخواہ ادا کرنی پڑی تھی۔عالمگیر ثانی کے عہد حکومت میں مغل سلطنت کا معاشی ڈھانچہ منتشر ہوگیا تھا۔ تخت نشینی کے ڈیڑھ ماہ بعد کوئی اچھی سواری نہیں رہ گئی تھی جس پر سوار ہو کر وہ جلوس کی شکل میں عید گاہ تک جا سکتا۔ جادوناتھ سرکار کے مطابق:

'ایک دن شہزادیاں جب بھوک سے تڑپ رہی تھیں تو وہ پردے سے نکل کر محل سے شہر جانے کے لیے دوڑ پڑی تھیں، لیکن قلعے کے دروازے کے بند ہونے کی وجہ سے وہ پوری رات چوکیدار کے کمرے میں بیٹھی رہیں جہاں سے انہیں جبراً اپنے کمروں میں بھیج دیا گیا'۔

حالانکہ اس کے بعد بھی مغل سلطنت نصف صدی تک زندہ رہی۔اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سلطنت کی معاشی حالت زوال پزید تھی، مگر اتنی خراب نہیں تھی جتنی جادوناتھ سرکار نے دکھانے کی کوشش کی ہے۔

معاشی بحران کے سلسلے میں مورلینڈ کا کہنا ہے کہ غیر محتاط عیش و عشرت کی وجہ سے ملکی آمدنی کا بڑا حصہ غیر پیداواری مشغلوں میں ضائع ہو جاتا تھا اور چونکہ آبادی کا وہ حصہ جو کچھ پیدا نہ کرتا تھا خاص طور پر شہروں اور چھاؤنیوں میں آباد تھا جب کہ پیدا کرنے کا عمل بیشتر دیہات میں انجام پایا تھا۔ لہٰذا مورلینڈ کے الفاظ میں "اس معاشی نظام کے تحت کسان خود بھوکا رہ کر دوسروں کا پیٹ بھرنے اور بنکر خود ننگا رہ کر دوسروں کو کپڑا مہیا کرنے پر مجبور تھا" گویا اس نظام کی بنیادی خصوصیت یہی تھی کہ "پیداوار" سے زیادہ "صرف" تھا اور یہی اس نظام کی

تباہی کا سبب ثابت ہوا۔ مورلینڈ کے مذکورہ بالا نظریہ سے پروفیسر عرفان حبیب کی تائید حاصل ہے۔ وہ بھی مغلوں کے زوال کے اسباب اس کے زرعی بحران میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق جاگیروں کے تبادلے کے طریقے نے استحصال کے رجحان کو بڑھاوا دیا اور اس استحصال کا ردعمل زمین دار اور کسان طبقوں کی بغاوتوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اپنے نظریہ کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں کہ حکومت کی مالی پالیسی دو بنیادی امور کے پیشِ نظر مرتب کی جاتی تھی۔ اس لیے مطالبہ مال گزاری کو زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک بڑھا رکھا جاتا تھا تاکہ مملکت کے لئے زیادہ فوجی طاقت حاصل کی جاسکے مگر دوسری طرف یہ بات بھی ضرور واضح رہی ہوگی کہ اگر شرح مال گزاری اس قدر زیادہ بڑھائی گئی کہ کسان کی بچت اس کے زندہ رہنے کے لیے ناکافی ثابت ہوئی تو مال گزاری کو اس طور پر معین کرتے کہ وہ معمولاً کسان کی پیداواری بچت کے تقریباً برابر رہے اور اس طرح اس کے لیے محض اس قدر چھوڑ دیا جاتا جو اس کی زندگی کی ناگزیر ترین ضروریات کے لیے کافی ہوسکے۔

کسان کی پیداواری بچت پر مغل حکمراں طبقے کا یہی کنٹرول اس طبقے کی دولت کی فراوانی کا سبب تھا اور اسی وجہ طبقہ امراء انتہائی دولت مند اور طبقہ عوام انتہائی مفلس تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی مطالبہ مال گزاری میں مزید اضافہ کا رجحان نظر آتا ہے جس کے اثرات وقت کے ساتھ ساتھ بڑھ رہے تھے۔ اس رجحان کا اصل محرک جاگیرداری نظام کی مخصوص نوعیت تھی۔ شاہی انتظامیہ اگرچہ کہ مملکت اور حکمراں کے طویل المیعاد مفادات کے پیشِ نظر مطالبہ مال گزاری کو ایک مناسب حد کے اندر رکھنے کی کوشش کیا کرتی تھی لیکن شاہی انتظامیہ اور جاگیرداروں کے مفاد میں اختلاف اور قدر میں تضاد پایا جاتا تھا۔

جاگیردار جس کی جاگیر کسی بھی لمحہ تبدیل کی جاسکتی تھی وہ ترقی کاشت کی کسی دوررس پالیسی پر کبھی بھی عمل پیرا نہیں ہوسکتا تھا۔ دوسری طرف خود اس کے ذاتی مفاد کا تقاضہ اسے ہر اس ظلم کے کرنے پر مجبور کرتا جو اس کے لیے فوری طور پر نفع بخش ہو خواہ اس کے نتیجہ میں کاشتکار تباہ اور اس کی مال گذاری ادا کرنے کی صلاحیت ہمیشہ کے لیے برباد ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اس بات کی تائید مغربی مشاہدین مثلاً کے علاوہ خود ہندوستانی مورخین کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بھیم سین نسخہ دلکشا میں لکھتا ہے کہ وہ "مسلسل اور ناگہانی تبادلوں کے باعث جاگیرداروں نے کسانوں کی مدد کرنے یا مستقل انتظامات کت طریقوں کو خیر آباد کہہ دیا ہے۔" عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ جاگیروں کے تبادلے کے نظام کے باعث کسان بڑی بے دردی سے استحصال کا شکار ہوا۔ کسانوں نے ان تمام مصائب کا حل اپنے آبائی پیشے سے فرار کی شکل میں دریافت کیا۔ جس کی وجہ سے پیداوار میں کمی آئی جس کو معاشی وزرعی بحران سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

عرفان حبیب کے مطابق مملکت مغلیہ کے زوال کے اسباب کے زرعی نظام میں موجود تھے جس کی وجہ سے نہ صرف کاشتکاری میں انحطاط رونما ہوا بلکہ پیدا کرنے والے بھی پیداوار کے صارفین کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور ہوئے، اور جس کے عمل اور ردعمل کے طور پر حکومت مالی خسارے سے دوچار ہوئی اور جنگوں کے طویل سلسلوں نے مزید شدت پیدا کردی۔ مارکسٹ نظریہ کے مورخین مغل سلطنت کے زوال کی وجہ سماج کے معاشی ڈھانچے میں تلاش کرتے ہیں۔ عرفان حبیب مغل سلطنت کے زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغل سلطنت کی توسیع کے ساتھ ساتھ حکومت کے اخراجات میں اضافہ ہوا۔ حکومت کی آمدنی کا اصل ذریعہ زراعتی ٹیکس تھا۔ مغل حکمرانوں نے

اپنے بڑھتے ہوئے خرچے زراعتی ٹیکس بڑھا کر پورے کیے مگر زراعت کی پیداوار کو جدید طریقوں سے بڑھانے کی کوشش نہیں کی اسی وجہ سے کسان بغاوت ہوئی اس طرح عرفان حبیب مغل سلطنت کے زوال کے اسباب زراعتی نظام کے ساتھ ہی طبقاتی کشمکش میں بھی ڈھونڈتے ہیں۔

14.2.5 جاگیر داری نظام (Feudal System)

مغل عہد کا جاگیر داری نظام بھی مغل سلطنت کے زوال کا بعث بنا۔ جاگیریں منصب داروں کو ان کی تنخواہ کے عوض میں دی جاتی تھیں۔ جاگیریں تبدیل ہوتی رہتی تھیں اور عموماً یہ جاگیریں کسی منصب دار کے پاس تین چار سال سے زیادہ نہیں رکھی جاتی تھیں جس کی وجہ سے جاگیر دار کسانوں کے مفاد کو دھیان میں نہیں رکھتے تھے۔ جاگیر داروں اور کسانون کا تعلق ہر سال صرف مال گزاری وصول کرنے تک ہی محدود رہتا تھا۔ جاگیر دار مال گزاری وصول کرنے کی مشکل سے بچنے کے لیے زمین اجارہ پر دینے لگے۔ اگرچہ کہ اورنگ زیب نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا جس کے باعث اجارہ دار کسانوں سے زیادہ سے زیادہ مال گزاری وصول کرنے میں مصروف رہتے تھے۔

پروفیسر عرفان حبیب کے مطابق کسانوں کو کبھی کبھی مال گزاری ادا کرنے کے لیے اپنی بیوی، بچوں اور اپنے مویشیوں تک کو فروخت کرنا پڑتا تھا جس کے باعث اس استحصال کے خلاف کسانوں میں بغاوت نے جنم لیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں سکھوں کی جو بغاوت ہوئی وہ دراصل کسان بغاوت تھی جس کی اہم وجہ معاشی استحصال تھا جو جاگیر داری نظام کی پیداوار تھا۔

اطہر علی کا خیال ہے کہ مغلوں کے زوال کے اسباب ان کے جاگیر داری نظام میں مضمر تھے جب تک یہ نظام صحیح طریقے پر کام کرتا رہا حکومت کے لیے کوئی خطرہ اس سے پیدا نہ ہوا۔ لیکن ایک خاص دور میں جب اس نظام میں بحران پیدا ہونے لگا تو حکومت بھی بحرانی دور سے گزرنے لگی۔ ان کے مطابق جاگیر داری نظام اپنی حقیقی شکل اور مغلیہ معیار کے ساتھ اورنگ زیب کے عہد کے وسط تک کام کرتا رہا لیکن اورنگ زیب کے آخری 26 برسوں میں دکن کی متواتر جنگوں کی وجہ سے سلطنت کے مالی وسائل پر پڑنے والے منفی اثرات، شمالی ہند میں دربار اور حکمراں کے نہ ہونے کی وجہ سے انتظامی مشنری کا متاثر ہونا نیز اس انتظامی طریقہ کار کا پیچیدہ ہونا جس کے ذریعہ جاگیریں تفویض کی جاتی تھیں وغیرہ ایسے اسباب تھے جنھوں نے مل کر جاگیر داری نظام کو متاثر کیا۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت کے آخری برسوں تک بحرانی کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی بلکہ اس بد نظمی کا پہلا مرحلہ ہی سامنے آیا تھا لیکن یہیں سے اس نظام کے اختتام کا آغاز تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

جس چیز نے جاگیر داری نظام کی جڑیں ہلائیں اسے "معموری" کے الفاظ میں 'بے جاگیری' کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حکومت کے پاس 'پائے باقی' ختم ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود اعلیٰ افسروں اور سرداروں کی حمایت حاصل کرنے اور بڑی مہمات کی روانگی کے وقت یہ ضروری تھا کہ ان کے منصب اور جاگیر میں اضافہ کیا جائے لیکن پائے باقی یا غیر تفویض شدہ زمین کی قلت تھی لہٰذا یہ ضرورت اس

طرح پوری کی جاتی کہ متعدد چھوٹے اور کم مرتبہ سرداروں کی جاگیریں ختم کرکے یا ان میں کٹوتی کرکے کسی بڑے سردار کو دے دی جاتی۔ گویا حکومت کئی افراد کو ناراض کر کے فردِ واحد کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ پائے باقی کی کمی سے حکومت پوری طرح آگاہ تھی۔

خود اورنگ زیب نے شاہزادہ اعظم کو لکھا تھا کہ "پائے باقی کی کمی اور تنخواہ کے دعویداروں کی کثرت "اس سلسلے میں خافی خان اورنگ زیب کا یہ جملہ دہراتا ہے کہ "یک انار وصد بیمار" بہر حال پائے باقی کی کمی کی وجہ سے ہی اورنگ زیب نے 1691 میں بخشیوں کو منع کر دیا تھا کہ وہ منصب دلانے کے لیے نئے آدمیوں کو پیش نہ کریں۔ بہر حال پائے باقی کی کمی نے دیگر عوامل کے ساتھ مل کر جاگیرداری نظام کی کارکردگی کو دشوار بنا دیا تھا۔اس لیے کہ جن لاگوں کو منصب مل جاتے وہ اکثر جاگیر پانے میں ناکام رہتے۔ جاگیر پانے کے لیے دربار میں رشوت اور جوڑ توڑ کا طریقہ شروع ہوا، نیز امراءاپنی تمام تر توجہ حکومت کی طرف سے سونپی گئی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے بجائے اپنی جاگیر حاصل کرنے اور اس کی برقراری پر صرف کرنے لگے۔ چھوٹے منصب دار جو رشوت اور درباری جوڑ توڑ کے مقابلے میں پیچھے رہ جاتے وہ بد ظن اور مایوس ہو جاتے جس کا خود اورنگ زیب نے بھی کئی مرتبہ اعتراف کیا تھا۔اس خرابی کا ایک اور پہلو یہ سامنے آیا کہ دربار میں گروپ بندیاں ہونے لگی تھیں۔ اطہر علی کا خیال ہے کہ امراء میں باہمی نزاع کی جو بھی صورت رہی ہو تاہم اس نے مسلح جدوجہد کی شکل اختیار نہ کی تھی اور یہ صرف گروہ بندیوں اور سازشوں ہی تک محدود تھی۔

بھیم سین نے نسخہ دلکشاء میں لکھا ہے کہ بہادر شاہ اول کے دور میں پائے باقی کی کمی اس حد تک ہو گئی تھی کہ اسے جاگیرداروں میں جا کر تقسیم کرنے کے لیے راجپوت ریاستوں پر حملہ کرنا پڑا تھا۔اس کے باوجود فرخ سیر کے دور میں دربار کے ذریعہ جاگیر تفویض ہونا ایک کاغذی کاروائی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ بہر حال یہ نظام بتدریج کمزور ہونے لگا اور اسی کے ساتھ مغلیہ حکومت بھی روبہ زوال ہونے لگی۔ اس لیے کہ اس کی بنیاد اسی نظام اور اس سے متعلقہ نظام (منصب داری) پر تھی۔ متعدد ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعض امراء اس صورتِ حال سے پریشاں ہو کر مغل سلطنت ترک کر کے مراٹھوں سے جا ملے۔ ستیش چندرا نے بھی مغلوں کے زوال کے اسباب منصب داری اور جاگیرداری نظام کی ناکامی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس لیے کہ ان دونوں نظاموں کی صحیح کارکردگی پر ہی مغلوں کی مرکز بند سیاست کی بنیاد تھی۔ جب منصب کرداری اور جاگیرداری نظام میں بحران آیا تو یہ مغل سلطنت کا زوال ثابت ہوئی۔

14.2.6 فوجی نظام (Military System)

مغلیہ دور حکومت کے ابتدائی زمانہ میں فوج کا ارادہ انتہائی مضبوط اور فعال تھا۔ جس کی مدد سے انہوں نے نہ صرف اپنے اقتدار کو برقرار رکھا بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو بھی فتح کر کے اپنی الطنت کی حدود بڑھائیں لیکن سلطنت کی کمزوری کے ساتھ ہی فوج کا ارادہ بھی کمزور ہوا اور اس کی کمزوری کے ساتھ ہی ملک کا سیاسی نظام بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مغل عہد سلطنت میں فوجی نظام میں جو کمزوریاں آئیں اس نے بھی مغل سلطنت کو زوال کے عمل میں اپنا کردار ادا کیا۔ مغلوں کا فوجی نظام منصب داری نظام پر منحصر تھا اور بادشاہ کا منصب داروں کی فوج پر منصر ہوا کرتے تھے۔ ہر منصب دار کی اپنی فوج ہوا کرتی تھی اور فوج کی بھرتی منصب دار خود کیا کرتا تھا۔ منصب داروں کے

فوجیوں کو تنخواہ بھی منصب داروں کے ذریعہ ملتی تھی جس کی وجہ سے بادشاہ اور فوجیوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ فوجی اپنے منصب دار کو ہی اپنا مالک سمجھتے تھے اور اسی کے تئیں وفادار رہتے تھے۔ منصب داری نظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی منصب دار بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دیتا تو اسے اپنے فوجیوں کا تعاون حاصل ہو جاتا تھا۔ اس لیے مغل بادشاہ اپنے طاقت ور منصب دار ہمیشہ خوف محسوس کرتا تھا۔ جب تک بادشاہ طاقت ور رہے تب تک تو منصب داروں پر پورا کنٹرول رہا اور انہیں منصب داروں کا پورا تعاون حاصل رہا۔ مگر بعد کے مغل حکمراں سب کمزور ثابت ہوئے جس کی وجہ سے منصب داروں پر کنٹرول نہیں رہا۔ اس وجہ سے فوجی نظام میں کمزوریاں آئیں۔ فوجی طاقت کمزور ہوتی چلی گئی اور مغل سلطنت کا زوال یقینی ہو گیا۔ اگر نادر شاہ کے حملوں کے وقت 1739ء میں مغل منصب داروں نے متحد ہو کر بادشاہ کے ساتھ ایک وفادار منصب دار کی طرح کھڑے ہو گئے ہوتے تو مغل سلطنت کا زوال اتنا آسان نہ ہوتا اور نہ ہی بادشاہ محمد شاہ کو بے عزت ہی ہونا پڑتا۔ اگر مغل بادشاہوں کی اپنی مستقل مفوج ہوتی تو وہ طاقت ور منصب دار امراء کو کنٹرول میں رکھتے اور اندرونی و بیرونی حملوں اور بغاوتوں کا سامنا کرنے کے قابل ہوتے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ مستقل فوج کا فقدان تھا جس کے باعث بعد کے مغل حکمراں بغاوتوں کو کچلنے اور بیرونی حملوں سے سلطنت و عوام کو بچانے میں ناکام رہے۔

پیٹر ہارڈی مغلوں کی ناکامی اور زوال کے اسباب مغلوں کی فوج میں تلاش کرتے ہیں۔ خصوصاً فوج اور منصب داروں کی تنخواہ کی ادائیگی کے بارے میں حکومت کی پالیسی کو اس کا اہم سبب بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شروع میں ان لوگوں کی تنخواہ جاگیر کی شکل میں دی جاتی تھی لیکن 1580ء اور 1583ء کی بغاوتوں کے دوران اکبر نے یہ محسوس کیا کہ منصب داروں کو اسی صوبے میں جاگیر دینا مناسب نہیں جہاں ان کا تقرر ہو اس کے علاوہ اس نے نقد تنخواہ دینے کا ارادہ بھی کیا۔ اگرچہ نقد تنخواہ دینے کا طریقہ پوری طرح رائج نہ ہو پایا تاہم منصب دار کو اس سے متعلقہ صوبے کے باہر جاگیر دیے جانے کا طریقہ رائج رہا۔ لیکن اورنگ زیب نے 1694ء میں یہ حکم جاری کیا کہ دکن میں ان ہی امراء کو جاگیر دی جائے جو وہاں مقرر ہوں۔ غالباً اس کے پیچھے یہ نظریہ رہا ہوگا کہ اپنی جاگیروں کے تحفظ کے لیے وہ زیادہ مستعدی سے کام کریں گے لیکن اس طرح ایک نقصان سامنے آیا کہ وہاں اگر کسی امیر کا اپنی جاگیر پر مؤقبضہ ہو جاتا تو ضروری نہیں تھا کہ وہ حکومت کا وفادار بھی رہے۔ اور یہی بے وفائی اورنگ زیب کے عہد میں اور اس کے بعد بھی مغل حکومت کو روبہ زوال کونے میں اپنا کردار ادا کرتی رہی۔

اس کے علاوہ مراٹھوں کی گوریلا جنگ اور یورپی قوم کی جنگ کی نئی تکنیک اور منصب داروں کا شاہی احکامات کو نظر انداز کرنا بھی مغل سلطنت کے زوال کا باعث بنا۔ ستیش چندرا کا خیال ہے کہ اکبر کا منصب داری نظام بہترین سیکولر اصولوں پر مبنی تھا اورنگ زیب کے بعد یہ طریقہ جاگیر داری نظام میں بدل گیا۔ ابتداء میں صلاحیت کی بنیاد پر منصب داروں کا تقرر ہوتا تھا اور منصب کی مناسبت سے انہیں جاگیریں ملتی تھیں۔ بعد میں جاگیریں وراثت میں ملنے لگیں۔ ظاہر بھی ہے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک شخص کا بیٹا اپنے باپ کی طرح باصلاحیت ہو مگر تنخواہ اور جاگیر اس کو اتنی ہی ملتی تھی۔ اس طرح دھیرے دھیرے ایک بڑی تعداد ایسی امراء کی ہو گئی جو مغل سلطنت کو کچھ دے تو نہیں سکتے تھے مگر بوجھ بنے ہوئے تھے۔

14.2.7 مراٹھوں کا عروج (Rise of Marathas)

جنوبی ہند میں مراٹھوں کا عروج بھی مغل سلطنت کے زوال میں مددگار ثابت ہوا۔اورنگ زیب نے اپنے عہد کا تقریباً نصب حصہ یعنی 25سال مراٹھوں کے خلاف جنگ میں صرف کیا تھا مگر مراٹھوں کے خلاف جنگ فیصلہ کن نہیں رہی۔ مراٹھوں کے خلاف جنوبی ہند میں اورنگ زیب کے برسرپیکار رہنے کی وجہ سے شمالی ہندوستان خبر گیری وہ اچھی طرح سے نہیں کرسکا جس سے یہاں کے جاٹوں ،سکھوں ،۔اور راجپوروں کو بغاوت کرنے کا سنہرا موقع ملا اور ان بغاوتوں نے مغل سلطنت کی بنیاد کو کمزور کیا۔1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں نے ان کی سرزش کی اور باغی طاقتوں کو کچلنے میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کیا۔بعد کے مغل حکمراں میں لیاقت اور سیاسی صلاحیت کا فقدان رہا۔یہی وجہ تھی کہ ان کے عہد حکومت میں مراٹھوں نے مغل مخالف سرگرمیوں کو تیز کردیا جو مغل سلطنت کے زوال میں مددگار ثابت ہوئیں۔

14.2.8 بیرونی حملے (Foreign Invasions)

ہندوستان پر شمالی مغربی راستے سے بیرونی حملے ہوتے رہے۔یہ حملے عموماً سیاسی اور معاشی حالات کی وجہ سے ہوتے تھے۔18ویں صدی میں اسی راستے سے ایران اور افغانستان کے شہنشاہ نادر شاہ1739ء میں ہندوستان پر حملہ کیا۔نادر شاہ قندھار کے سرکش قبیلے غزالی کو کچلنا چاہتا تھا۔نادر شاہ نے مغل شہنشاہ محمد شاہ کو تاکید کی تھی کہ وہ اس قبیلے کو اپنی سرحد میں داخل نہ ہونے دے۔مگر بے خبر محمد شاہ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور غزالی قبیلے نے مغلیہ سرحد میں پناہ لی جس کی وجہ سے نادر شاہ نے 1739ء میں ہندوستان پر حملہ کر دیا۔اس میں مغلیہ فوج کو شکست ہوئی۔ہزاروں کی تعداد میں جانیں گئیں۔نادر شاہ دہلی میں داخل ہوا۔ایرانی اور ہندوستانی سپاہیوں میں ایک معمولی چھڑپ ہوئی۔نادر شاہ نے پوری دہلی شہر میں قتل کا عام کا حکم جاری کر دیا۔نادر شاہ نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔اپنے نام کے سرکلر جاری کیے اور خطبہ میں اپنا نام شامل کرایا۔نادر شاہ نے سندھ کے پار کا شمال مغربی علاقہ اپنی حکومت میں ملالیا۔اور جب وہ ہندوستان سے گیا تو بیش بہا دولت اونٹوں پر لاد کر لے گیا۔شاہجہاں کا تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی اپنے ساتھ لے گیا۔نادر شاہ کے اس حملے سے شاہی خزانہ خالی ہو گیا۔بہت سے صوبے مغل سلطنت سے الگ ہو گئے اور مغل بادشاہ کے عزت وو قار میں کمی آئی اور مغل سلطنت بالکل کمزور ہو گئی۔

احمد شاہ ابدالی کا حملہ جو مراٹھوں کے خلاف تھا اور جس کا فیصلہ پانی پت کی تیسری جنگ 1761ء میں ہوا،تاریخ میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔اس حملے میں ابدالی کی اپنی کوئی غرض نہیں تھی بلکہ ہندوستان کی مغل سلطنت کی حفاظت مقصود تھی۔ہندوستان کی مقتدر شخصیات خصوصاً نجیب الدولہ اور شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان آکر مراٹھوں اور دیگر باغی عناصر کی سرکوبی کر کے مغل سلطنت کو زوال سے بچائے۔یہاں تک کہ جے پور کے راجہ مادھو سنگھ اور مارواڑ کے راجہ نے بھی ابدالی سے مراٹھوں کے خلاف مدد مانگی۔ان تمام لوگوں کی اپیل پر ابدالی نے ایک کثیر فوج کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کر دیا۔پانی پت کے میدان میں افغانی فوج اور مراٹھوں کے بیچ زبردست جنگ ہوئی اس میں مراٹھوں کو شکست ہوئی۔جنگ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم ثانی کو شہنشاہ تسلیم کیا۔احمد شاہ ابدالی نے

1748ء سے 1761ء کے بیچ جو حملے کیے تھے، اس سے مغل سلطنت کمزور ہوئی اور انہیں حملوں نے شمالی ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کی راہ ہموار کی۔ ولیم اردون لکھتا ہے کہ ان دونوں حملوں سے مغل سلطنت کی شان و شوکت ختم ہو گئی۔

14.3 اورنگ زیب اور مغل سلطنت کا زوال

(Aurangzeb and the Decline of Mughal Empire)

اورنگ زیب کے انتقال کے برسوں بعد مغل سلطنت کا زوال ہوا پھر بھی اورنگ زیب ہی کو بیشتر دانشوروں نے یہ کہتے ہوئے ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ وہ جنوب کی مسلم طاقتوں کو مراٹھوں کے خلاف منظم نہیں کر سکا۔ جنوب کے ہندو اس کے مذہبی برتاؤ کو بنیاد بنا کر ناخوش رہے۔ وہ راجپوت سرداروں کی مکمل حمایت کرنے میں بھی ناکام رہا جب کہ جنوب کی مسلم ریاستوں نے نہ صرف اورنگ زیب کے خلاف مراٹھوں سے سانٹھ گانٹھ کی بلکہ اس کے بیٹے اکبر کو باغی بنانے میں سب سے زیادہ جنوب کی یہی مسلم ریاستیں ذمہ دار ہیں۔

مغل سلطنت کے زوال میں مورخین و دانشوروں کے نظریات مختلف ہیں ان میں سے اکثر اس بار پر متفق ہیں کہ مغل سلطنت کے زوال کی تمام تر ذمہ داری اورنگ زیب پر عائد ہوتی ہے جس نے سیاست کو مذہب میں داخل کر کے مغل سلطنت کے سیکولر کرداروں کو کمزور کیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے مذہبی پالیسی کو اختیار کرتے ہوئے مغل ریاست کے اداروں میں تبدیلیاں شروع کیں جب کہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ہندو مغل سلطنت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ اورنگ زیب نے سلطنت کو چلانے کے لیے وہی سیاسی حکمت عملی اپنائی جو اس سے پیش رو حکمراں کی تھی۔ البتہ جب امراء طبقہ میں اخلاقی پستی آئی اور وہ فیشن پرستی کے لیے طرح طرح کی بدعنوانیوں میں ملوث ہوئے اور ریاست کے خزانے میں کمی آئی، ریاست کی آمدنی کے ذرائع کم ہوئے تو اس کی حالت ایسی نہیں رہی کہ وہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کر سکے۔ یہی وہ صورت حال تھی جب اورنگ زیب اور مذہبی علماء نے ان خرابیوں اور دیگر مسائل کا حل مذہبی اصلاحات میں تلاش کیا اور شریعت کے ذریعہ معاشرے کی اخلاقی معاشی پستی کو دور کرنا چاہا۔

مغل سلطنت کے زوال کے سلسلے میں اورنگ زیب کے کردار کو نمایاں طور پر پیش کرنے کا رجحان مورخین میں پایا جاتا ہے بلکہ اکثر و بیشتر تو تنہا اسی کو زوال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ولیم اردن کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی نے نہ صرف سیاسی پیشہ راجپوت قبائل کو بلکہ عام ہندوؤں کو بھی اس کا مخالف بنا دیا اور ایسے دور میں جب کہ قوم پرستی اور وطن پرستی کا وجہ نہ تھا صرف حکمراں کی ذات ہی مختلف طبقات اور گروہوں کو ایک مشترکہ مقصد فراہم کرتی تھی چنانچہ بابر اور اکبر اس سلسلے کی بہترین مثالیں ہیں۔ مگر اورنگ زیب مختلف مفادات کے حامل طبقات اور گروہوں کو مطمئن رکھتے ہوئے ایک مشترکہ مقصد فراہم کرنے میں ناکام رہا جس کی بڑی وجہ بقول ولیم اردون اس کی مذہبی تنگ نظری تھی جس نے مختلف گروہوں کو ان کی جداگانہ حیثیت اور مختلف مفادات کا احساس دلایا۔ چنانچہ اپنے مکمل خاتمے سے بہت پہلے ہی مغل سلطنت اپنی قوت اور مرکزیت کھو چکی تھی لہٰذا نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی جیسے فاتح اور ڈوپلے و کلایو جیسے مہم کا کام صرف اتنا تھا کہ مغلوں کی اس کمزوری کو آشکار کر دیں۔ علاوہ ازیں ولیم اردون کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کی پالیسیوں کے رد عمل میں مرکز گریز رجحانات

بڑھے جو اس کے دور میں اگرچہ کہ کافی حد تک دبے رہے تاہم اس کے جانشینوں اور بعد کے مغل حکمراں کے دور میں پوری طرح سامنے آ گیا۔

سر جادو ناتھ سرکار بھی مغل حکومت کے زوال کا ذمہ دار اورنگ زیب کی پالیسیوں کو مانتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ "اورنگ زیب کی غیر رواداری کی پالیسی کے تحت اس دور میں ہندو مسلم اختلافات بڑھے۔" وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "اس نے اکبر کی مذہبی رواداری کی پالیسی کو بدل کر جو اس وقت تک مغل حکومت کی بنیادی پالیسی تھی، حکومت کے تیئں ہندوؤں کی وفاداری کو ختم کر دیا۔ جس ہندو مسلم کے اتحاد کو اس کے اجداد نے بڑی محنت کے بعد پروان چڑھایا تھا وہ ختم ہونے لگا۔ نیز حکومت میں جذب ہونے کا جو عمل جاری تھا وہ نہ صرف رک گیا بلکہ اس دور میں وہ ہندو جو حکومت کے جزء بن چکے تھے خود کو اس سے علاحدہ کرنے لگے۔ جادو ناتھ سرکار کی رائے کو مختصراً ان الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کے خلاف جو ہندو رد عمل ہوا مغل حکومت کا زوال اسی کا نتیجہ تھا۔اس لیے کہ یہاں ہندو اکثریت میں تھے اور ان کو ساتھ لیے بغیر حکومت چلانا ممکن نہ تھا۔

14.4 مغل سلطنت کا زوال اور مورخین کی آراء

(Historians' Views on the Fall of Mughal Empire)

ولیم اردون اور جادو ناتھ سرکار نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کا انتہائی آرام طلب ہو جانا مغل سلطنت کے زوال کا خاص سبب مانا ہے۔اورنگ زیب کی مذہبی اصول پرستی سے پیدا شدہ ہندو مسلمان کی تفریق کو جادو ناتھ سرکار نے مغل سلطنت کے زوال کی اصل وجہ بتایا ہے۔ منصب داری اور جاگیر داری نظام میں ستیش چندر نے مغلوں کے زوال کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس لیے کہ ان دونوں نظاموں صحیح کارکردگی پر ہی مغلوں کی مرکز بند سیاست کی بنیاد تھی اور اس کی تائید عرفان حبیب نے بھی کی ہے، کچھ مورخین کی رائے میں سلطنت کی وسعت ہی زوال کا باعث بنی۔ ڈاکٹر تاراچندر نے مغلوں کے زوال سے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے ہی دو تہذیبوں کے درمیان عمل اور رد عمل جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد رک گیا۔ نہ صرف تہذیبی لین دین کا سلسلہ اس کے بعد بند ہو گیا بلکہ سماجی و معاشی ترقی جو دراصل اسی تہذیبی لین دین کی رہین منت تھی، وہ بھی رک گئی۔اس کا اثر حکومت کے مالی نظام پر بھی پڑا اور اس کا خزانہ گھٹتا گیا، رسل و رسائل میں دقتیں پیدا ہونے لگیں اور صنعت و تجارت اور زراعت مقامی طور پر محدود ہو کر رہ گئیں۔ نتیجتاً مرکز گریز قوتوں نے غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیا۔ قانون اور ضابطہ منتشر ہو گیا اور شہنشاہیت عملاً ٹکڑوں میں تقسیم ہونے لگی۔ جس کے بعد اس کی بیرونی حملہ آوروں اور اندرونی دشمنوں نے نمٹنے کی صلاحیت ختم ہو گئی اور یہی وہ موقع تھا جب یورپی اقوام نے ہندوستان کے معاملات میں مداخلت شروع کی اور بالآخر انگریز حکومت پر قابض ہو گئے۔

پروفیسر نورالحسن کا خیال ہے کہ مغل حکومت کی مرکز پسندی وجہ سے صنعت و تجارت کو فروغ حاصل ہوا اور وہ حالات پیدا ہوئے جو معیشت زر کی ترقی میں معاون تھے، معیشت زر نے زرعی پیداوار کو بھی کافی متاثر کیا، خاص کر اس وجہ سے کہ مال گزاری زیادہ زیادہ سے نقد

میں وصول کی جاری تھی۔اس کی وجہ سے نقدی فصلوں کی کھیتی بڑھی اور زیر کاشت علاقے کی بھی توسیع ہوئی۔ یہ دونوں باتیں کسی حد تک اس وجہ سے ہوئیں کہ مزید مال گزاری کی ضرورت تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سارے نظام میں اس قدر تضادات تھے کہ ٹکراؤ لازمی تھا اور اس ٹکراؤ کا حل شاہی مغلیہ نظام کی چہار دیواری کے اندر ممکن نہ تھا۔ اگرچہ اس نظام نے تقریباً دو سو سال تک استحکام قائم رکھا مگر اس دوران اس نے مزید ٹکراؤ کے امکانات کو پیدا کیا۔ مثلاً زمین داروں کے مختلف گروہوں کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ تھا اور یہ ٹکراؤ اکثر حکومت کے لیے نقصاندہ ثابت ہوتا۔اس کے علاوہ خاص کر ان حالتوں میں جب کہ قرابت داری، برادری اور قبائلی رشتے مضبوط ہوتے۔ جب بھی کوئی سرمایہ دار یا زمین دار بغاوت کرتا تھا تو وہ "بنیادی زمین داروں اور کسانوں کی خاص بڑی تعداد مرکزی حکومت کے خلاف جمع کر لیتا۔اس طرح کی بغاوتیں ناگیز تھیں۔اس لیے کہ تمام سرداروں کو اعلیٰ مناصب اور اسی مناسبت سے جاگیریں نہیں دی جاسکتی تھیں جس کے نتیجہ میں جاگیروں پر دباؤ بڑھنے لگا اور بادشاہ تمام سرداروں کی خواہشات پوری کرنے کے قابل نہ رہا۔ مزید برآں مغلیہ حکومت کے آخری دور میں مختلف قسم کے زمین داروں کے مطالبات اور شاہی مال گزاری کا بوجھ بالآخر کاشتکار پر پڑا اور اس نے زرعی معیشت پر ایسا دباؤ ڈالا کہ مزید ترقی تقریباً ناممکن ہوگئی۔ اگرچہ کہ مرکزی حکومت نے حتی الوسع کوشش کی کہ کسانوں کو کل پیداوار کے نصف سے زیادہ نہ دینا پڑے لیکن جب مرکزی حکومت پر دباؤ بڑھا تو یہ ممکن نہ رہا اور زرعی معیشت ایسے بحران سے دوچار ہوئی جو بالآخر اس پورے نظام کی شکست کا باعث ہوا۔

پیٹرسن کو اس بات پر اتفاق ہے کہ مغل حکومت کا زوال اورنگ زیب کے عہد سے شروع ہوا لیکن وہ اس کی وجہ مغلوں کا دکن میں الجھنا قرار دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ مغلوں کے لیے دکن سے الگ رہنا غالباً ممکن نہ رہا تھا اور یہ بات ان کے مرکز کی کمزوری کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ نیز یہ ان کی جارحانہ پالیسی نہیں بلکہ دفاعی اور خود حفاظتی رویہ تھا جو ان کو دکن کے اس قدر قریب لے گیا۔اس لیے اگر مغل جیسی بڑی سلطنت دکن کے بڑھتے ہوئے فوجی چیلنج کا جواب نہ دیتی تو یہ حکومت کے لیے زیادہ نقصان دہ ہوتا۔ دکن میں مغلوں کے ملوث ہونے اور مغلوں کے زوال میں جو ربط ہے اس کو پیٹرسن نے اس طرح واضح کیا ہے کہ مغلوں کے نظام حکومت میں طبقہ امراء ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت کا حامل تھا، چنانچہ جب تک حکمراں اور امراء کے درمیان سرپرستی اور وفاداری کا تعلق قائم رہا جس کے پیچھے مذہبی یا نسلی جذبہ کارفرمانہ تھا تو اس وقت تک امور حکومت صحیح اور مؤثر طور پر انجام پاتے رہے مگر جب دکنی امراء بھی مجبوراً حکومت میں شریک کیے جانے لگے تو حکمراں اور امراء کے درمیان تعلق کی یہ نوعیت بدل گئی اور اب دونوں کا مفاد ایک دوسرے کا پابند اور ایک دوسرے سے وابستہ تصور نہ کیا جانے لگا۔ بلکہ اب دونوں اپنے مفاد ایک دوسرے سے جدا بلکہ بعض اوقات تضاد محسوس کرنے لگے اور ایسا پیٹرسن کے مطابق اس لیے ہوا کہ دکن میں بہت سی فوجی ناکامیوں نے اس طبقہ امراء میں اخلاقی تنزل پیدا کیا اور وہ دکن میں ہونے والے تمام نقصان کو تو حکومت کا حصہ قرار دیتے اور فوائد میں اپنی حیثیت نمایا طور پر پیش کرتے، چنانچہ امراء کے اس رویہ کو پیٹرسن کے نقل کردہ اس ایک جملے میں ادا کیا جاسکتا ہے کہ "یہ ہماری حکومت نہیں جو زوال پزید ہو رہی ہے بلکہ یہ تو اورنگ زیب کی حکومت ہے"

رچرڈز نے اطہر علی کے اس نظریے سے اختلاف کیا ہے کہ حکومت کو جاگیروں اور پائے باقی کی قلت کا سامنا کرنا پڑا۔ان کے مطابق حکومت کو کسی قسم کی مالی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اس لیے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے انضمام کے بعد مغلوں کے مالی وسایل کافی بڑھ بلکہ ان

صوبوں کامالی استحصال بھی کیا گیا،اور جہاں تک پائے باقی کی قلت کا مسئلہ ہے، رجرڈز کا کہنا ہے کہ یہ قلت مصنوعی تھی اور اورنگ زیب نے فوجی مصارف کے پیش نظر ملک کی بہترین زمینوں کا خالصہ میں تبدیل کرنا شروع کیا چنانچہ ان کے مطابق صرف 1695ءاور 1697ء میں ہی 17 لاکھ روپئے کی جمع کی پائے باقی کو خالصہ میں تبدیل کیا گیا۔اس طرح رچرڈز کے مطابق پائے باقی کی قلت مصنوعی تھی اور یہ اقدام حکومت کی ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت تھا۔رچرڈز اس کے علاوہ ایک نقطہ یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ جس طرح مغل حکمرانوں نے شمالی ہندوستان کے مقامی سرداروں خصوصاً راجپوتوں اور مقامی مسلمانوں کے ساتھ ذاتی تعلقات قائم کرکے ان کی سرپرستی کی اس طرح کے تعلقات دکن کے سرداروں اور زمین داروں (مراٹھا، گونڈ، بیدر اور تیلگو) کے ساتھ قائم کرنے میں ناکام رہے اور اسی وجہ ان کو دکن میں قدم قدم پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

پیٹر ہارڈی، پیٹرسن ،اور رچرڈز کے نظریات کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ مغلوں کی ناکامی اور زوال کے اسباب ان کی فوج میں تلاش کرتے ہیں۔ خصوصاً فوج اور منصب داروں کی تنخواہ کی ادائیگی کے بارے میں حکومت کی پالیسی کو اس کا اہم سبب بیان کرتے ہیں۔پیٹر ہارڈی مغلوں کے زوال میں اس کے علاوہ بھی کچھ دیگر اسباب کو محسوس کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر جتنی رائے اور نظریات پیش کیے گئے وہ صرف کسی ایک پہلو پر نظر ڈالتے ہیں۔ لیکن جب تک اس کے ہر پہلو کو نہ سمجھا جائے اور کسی ایک سبب کا دوسرے کے ساتھ صحیح تعلق قائم نہ کیا جائے اس وقت تک حقیقت سے آگاہ ہونا مشکل ہے۔کچھ مورخین نے یہ ثابت کرنے کیکوشش کی ہے کہ اٹھارویں صدی میں علاقائی طاقتوں اور علاحدگی پسند رجحانات کی جو لہر چلی تھی مغل سلطنت کا زوال اسی کا نتیجہ تھا۔سوویت مورخ کے بقول 'تنگ نظر قوم پرستی، کے رجحان نے اس مضبوط، مستحکم اور عظیم سلطنت کو تباہ کیا'،اس نظریہ کو بہت سے ہندوستانی کے مارکسی ماہرین نے بھی اپنایا ہے۔

14.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغلیہ حکومت کا زوال ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی وضاحت مختلف مورخین نے مختلف انداز میں کی ہے۔ جس وقت اس زوال کے عمل کو محسوس کیا گیا اسی وقت سے آج تک اس کے اسباب کے بارے میں ماہرین اختلاف رائے کا شکار ہیں ۔ان ماہرین نے اپنی رائے اور نظریات کے ثبوت میں جو دلائل اور رد دلائل پیش کیے ہیں ان کی وجہ سے اس موضوع پر کافی مواد جمع کیا جاچکا ہے۔اور ان سب کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ عظیم مغلیہ جیسی کسی بھی سلطنت کے زوال کے لیے تنہا کوئی سبب ذمہ دار نہیں ہو سکتا اور یہ یقینی ہے کہ متعدد اسباب کے جمع ہو جانے پر ہی مغل سلطنت کا زوال ہوا۔اورنگ زیب کے جانشینوں اور بعد کے مغل حکمرانوں کو مغل سلطنت کے زوال کا ذمہ دار کہا جاسکتا ہے۔اورنگ زیب جیسی غیر معمولی صلاحیت بعد کے حکمرانوں میں ناپید تھی۔ بلکہ یہ وارث نااہل ہونے کے ساتھ بزدل بھی تھے اس لیے رعایا ان کا احترام کرنے کے لیے آمادہ نہ تھی۔ معاشی بدانتظامی کو مغل سلطنت کے زوال کی بنیادی وجہ کہا جاسکتا ہے۔ کاشت کی پیداوار بقدر ضرورت نہیں بڑھ سکی۔ لگان میں اضافہ کی وجہ قابل کاشت زمین ہونے کے باوجود بے روزگار کسان مزدوروں

نے کاشت میں دلچسپی نہیں لی۔

منصب داروں کی تعداد میں اضافہ نے بھی معاشی حالت کواور کمزور کیا۔ جاگیروں کی کمی کی وجہ جاگیر داروں نے اپنی جاگیروں کو موروثی بنانے کی کوشش کی اور خالصہ زمین پر بھی قبضہ کیا۔ اخراجات کم کرنے کے لیے شاہی عہدیداروں اور خود بادشاہ نے کفایت شعاری سے کام لیا اور فوجی اخراجات میں بھی تخفیف کی گئی جس سے فوجی قوت میں تنزل آیا۔ حکومت کے نظام میں بدانتظامی اور لاقونونیت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ چھوٹے چھوٹے ملازم پیروی کر کے یا رشوت دیکر اعلیٰ عہدے حاصل کرنے لگے۔ تربیت یافتہ اور بہتر قسم کے سپاہیوں کی تعداد میں کمی ہونے لگی۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں جدید سامان حرب تیار ہو رہا تھا لیکن ہندوستانی فوج اس وقت بھی پرانے توپ خانے پر منحصر تھی۔ آمدنی کا بڑا حصہ مغل حکمراں اپنے سامان عیش و عشرت پر صرف کرتے تھے۔ کسان، شہری مزدور، کاریگر، عوام اور رعایا کو معاشی مشکلات کا سامنا تھا ۔ وہیں حکمراں و بالادست طبقہ اور مالدار تاجر عیش و آرام کی زندگی گزارنے میں مست تھے اس لیے 18 ویں صدی میں ان بالادست اور مقتدر طبقوں کا اخلاقی و سماجی زوال ہو گیا اور یہ طبقہ زوال کو روک سکنے میں مجبور و ناکام رہا۔

مغل سلطنت کا زوال کسی ایک سبب یا صرف اورنگ زیب کی پالیسیوں سے نہیں ہوا بلکہ مغل حکومت کی انتظامی و معاشی ناکامی، جاگیر داری بحران، زرعی و معاشی بحران اور جاگیروں (پائے باقی) کے فقدان میں ہوا۔ مسئلہ جاگیر نے بہت سے نئے مسائل پیدا کیے جنہیں بعد کے مغل حکمراں حل نہ کر سکے۔ اگرچہ اورنگ زیب کے بعد مذہبی پالیسی اور بغاوت کے بیشتر مسائل کا حل بہادر شاہ اول کے زمانہ میں نکالا جا چکا تھا اور مغلوں کے مخالف گرو گوبند سنگھ، جاٹ، ستنامیوں اور مراٹھوں وغیرہ کی بغاوت کو خاموش کر دیا گیا تھا پھر بھی مغل سلطنت انتشار سے بچ نہ سکی۔ اٹھارویں صدی کا نصف اول شروع ہوا تو زراعتی اور انتظامی بحران مختلف شکلوں میں منعکس ہونے لگا۔ مثلاً مقامی بغاوتیں ، مذہبی تنازعات، دربار کی دھڑے بازی، حکمراں طبقے کا انحطاط، اور اسی قسم کی باتیں عام نظر آنے لگی۔ یہ بحران زیادہ شدید اور زیادہ پیچیدہ ہوتا گیا یہاں تک کہ مغل سلطنت کی بربادی پر جا کر ختم ہوا۔

14.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

ستنامی : ہندو فقیروں، جوگیوں کا ایک گروہ ستنامیوں کے نام سے جانا جاتا ہے جو منیاس بھی کہلاتے ہیں۔ ان میں میوات پر گنہ کے لگ بھگ چار پانچ ہزار خاندان قابل ذکر ہیں۔ ان کا پیشہ زراعت اور کم پونجی کی تجارت تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر مسلح رہتے تھے

پائے باقی : جاگیریں دی جانے والی زمین

خالصہ زمین : حکومت کے سیدھے کنٹرول والی زمین

اجارہ : ٹھیکہ، خصوصاً مال گزاری کا ٹھیکہ

بنیادی زمین دار : بنیادی زمین دار وہ ہوتے تھے جو تمام امور میں زمین کے مالک ہوتے تھے۔ اس میں خود کھیتی کرنے والے کسان بھی شامل تھے اور وہ بھی جن کو ایک یا کئی گاؤں کے مالکانہ حقوق حاصل تھے۔

14.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اورنگ زیب کی وفات کس سن میں ہوئی؟
2. اورنگ زیب کا جانشین کون تھا؟
3. بہادر شاہ کا انتقال کب ہوا؟
4. جہاندار شاہ نے کب سے کب تک حکومت کی؟
5. فرخ سیر کا انتقال کس سن میں ہوا؟
6. محمد شاہ کا جانشین کون ہوا؟
7. اکبر ثانی نے کب سے کب تک حکومت کی؟
8. نادر شاہ نے ہندوستان پر کب حملہ کیا؟
9. پانی پت کی تیسری جنگ کب ہوئی؟
10. بہادر شاہ کا دور حکومت کب سے کب تک رہا؟

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اورنگ زیب کے بعد کے حکمرانوں پر مختصر نوٹ لکھیں۔
2. امراء کی سیاسی گروہ بندیاں مغل سلطنت کے زوال میں کہاں تک ذمہ دار ہیں؟
3. مغل حکومت کے زوال میں فوجی نظام کس حد تک ذمہ دار ہے؟
4. کیا جنوبی ہند میں مراٹھوں کا عروج مغل سلطنت کے زوال میں مددگار ثابت ہوا؟
5. احمد شاہ ابدالی کے حملے کی اہمیت پر روشنی ڈالیں؟

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل سلطنت کے زوال میں اورنگ زیب کی پالیسیاں کہاں تک ذمہ دار ہیں۔ تنقیدی جائزہ لیجیے۔
2. جاگیرداری نظام مغل سلطنت کے زوال کا باعث بنا، وضاحت کریں۔
3. مغل سلطنت کے زوال سے متعلق مورخین کی آراء تفصیل سے لکھیں۔

14.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. S.R. Sharma, *Mughal Empire in India*, Laxmi Narain Agarwal, Agra,1971.
2. William Irwin, *The Army of the Indian Mughals*, Urishia Publishing House, New Delhi,1962.
3. Satish Chandra, *Parties and Politics at the Mughal Court*, People's Publishing House, New Delhi,1972.
4. M. Athar Ali, *The Mughal Nobility under Aurangzeb*, Asia Publishing House,1970.
5. Jadunath Sarkar, *A Short History of Aurangzeb*, Calcutta, 1962.
6. ڈبلیوا ے کے مورلینڈ، مسلم ہندوستان کا زراعی نظام، مترجم جمال احمد صدیقی ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1982۔
7. عرفان حبیب، مغل ہندوستان کا طریق زراعت، مترجم جمال احمد صدیقی ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1972۔
8. ڈبلیو ایچ مورلینڈ، اکبر سے اورنگ زیب تک، مترجم جمال احمد صدیقی ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1981۔
9. تاراچند تاریخ تحریک آزادی ہند، جلد اول، مترجم قاضی عدیل عباسی۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی، 1980۔
10. سید نورالحسن، مغلیہ ہندوستان میں زرعی تعلقات: چند افکار، مترجم قیام الدین احمد، مکتبہ جامع لمیٹڈ نئی دہلی، 1975۔

اکائی 15۔ علاقائی طاقتوں کا عروج

(Rise of Regional Powers)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے حالات

15.3 جانشین ریاستیں

15.3.1 بنگال

15.3.2 اودھ

15.3.3 حیدرآباد

15.4 باغی ریاستیں

15.4.1 شیواجی اور مراٹھا

15.4.2 سکھ

15.4.3 جاٹ

15.4.4 روہیل کھنڈ

15.5 آزاد ریاستیں

15.5.1 میسور

15.6 اکتسابی نتائج

15.7 کلیدی الفاظ

15.8 نمونہ امتحانی سوالات

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

15.0 تمہید (Introduction)

مغل سلطنت، جس کا قیام 1526 میں ظہیر الدین محمد بابر کے ہاتھوں عمل میں آیا وہ اٹھارہویں صدی میں زوال کا شکار ہو گئی۔ اس کے سوال کے کئی اسباب تھے جس کا ذکر گزشتہ اکائی میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ بلاشبہ ہندوستان کی تاریخ میں جن چند حکمراں خاندان نے اپنے انمنٹ نقوش ثبت کیے ان میں مغل سلطنت سرفہرست ہے۔ تین صدی سے زائد حکومت کرنے والے اس شاہی خانوادے میں تقریباً بیس بادشاہوں نے حکومت کی جن میں سے چند کا عہد حکومت نصف صدی پر محیط رہا مگر یہ قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ ''ہر عروج را زوال'' یعنی ہر عروج کے بعد زوال طے ہے۔ اس قول کے مطابق مغل سلطنت بھی اپنی عظمت و شان کو برقرار نہ رکھ سکی اور بالآخر 1857 کے انقلاب کے بعد اس سلطنت کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ یہ زوال اچانک نہیں آیا اس کے خدوخال عہد اورنگ زیب میں ہی ظاہر ہو گئے تھے جس کو اس کے جانشین روکنے میں ناکام رہے اس طرح اورنگ زیب کی وفات کے 150 سال بعد مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد بہت سی علاقائی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا جسے مطالعہ کی آسانی کی رو سے ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

- جانشین ریاستیں : بنگال، حیدرآباد اور اودھ
- باغی ریاستیں : مراٹھا، سکھ، جاٹ اور روہیل کھنڈ وغیرہ
- آزاد ریاستیں : میسور، کیرلا (ٹراونکور) اور راجپوت وغیرہ

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اٹھارہویں صدی کے خدوخال بیان کر سکیں گے۔
- مغل سلطنت کی جانشیں ریاستوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مغل سلطنت کی باغی ریاستوں کے عروج کو سمجھ سکیں گے۔
- میسور ریاست کے عروج و زوال کا جائزہ لے سکیں گے۔

15.2 اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے حالات

(Conditions in India in the Eighteenth Century)

مغل سلطنت کے زوال پذیر ہونے سے اٹھارہویں صدی میں کوئی مرکزیت نہیں رہ گئی تھی جو پورے ہندوستان کو متحد رکھتی مگر

نئی ظہور پذیر ریاستوں نے اس کمی کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حالانکہ اٹھارہویں صدی کی نوعیت کو لے کر مورخین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ مورخین کی رائے یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مغل سلطنت کے زوال کے بعد پورا ہندوستان زوال کی کیفیت سے دوچار تھا۔ معاشی حالات خراب ہوگئے، علم و ہنر اپنی افادیت کھونے لگے، صنعت و حرفت زوال پذیر ہوگئی، اور شعراء و ادباء ''شہرآشوب'' جیسی نظمیں لکھنے لگے۔ غرض لوگ احساس کمتری و پژمردگی کا شکار ہوگئے اور مستقبل سے مایوس ہوگئے۔ اس طرح کی رائے رکھنے والے عموماً ابتدائی مورخین ہیں۔ کچھ مورخین جیسے کرسٹوفر بیلی اور مظفر عالم وغیرہ نے ایک الگ تصویر پیش کی ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ ''اٹھارہویں صدی میں مرکزی سیاسی قوت کمزور پڑ رہی تھی اور اس سے جڑے لوگ اور علاقے زوال پذیر ہو رہے تھے مگر اس زوال کا اطلاق پورے ہندوستان پر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس زوال کے برعکس ہندوستان کے دوسرے علاقے یا ریاستوں میں صورت حال بالکل مختلف تھی جہاں نہ صرف سیاسی استحکام قائم ہو رہا تھا بلکہ زندگی کے دوسرے امور اور میدان میں بھی لوگ ترقی کی طرف گامزن تھے، جیسے صفت و حرفت، تجارت و معیشت اور علم و ہنر وغیرہ۔ مغل سلطنت کے زوال کے باعث دلی سے بھی بعض ماہرین نقل مکانی کرکے ان علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے تھے جن سے ان کی ترقی وابستہ تھیں۔

15.3 جانشین ریاستیں (Successor States)

دراصل یہ وہ ریاستیں تھیں جو نیم آزاد یا آزاد ریاست بننے سے قبل مغل سلطنت کا حصہ تھیں مگر اٹھارہویں صدی کے اوائل میں جب مرکز کی گرفت کمزور پڑنے لگی تو یہاں کے صوبیدار مغل سلطنت کی سرپرستی سے آزاد ہونے لگے۔ لہٰذا پہلے وہ نیم آزاد اور بعد میں خود مختار ہوگئے اور اپنی ایک علاحدہ سیاسی، معاشی اور فوجی تنظیم قائم کرلی۔ ان میں جو تین مشہور ریاست ہیں وہ بنگال، اودھ اور حیدرآباد ہیں۔

15.3.1 بنگال (Bengal)

بنگال شمال مشرقی ہندوستان کی ایک اہم ریاست تھی جو تیرہویں صدی کے اوائل میں بختیار خلجی کے حملے اور قبضے کے مسلم حکمرانوں کے زیر نگیں آیا۔ 1575 میں مغل شہنشاہ اکبر نے فتح کرکے اپنے قلمرو میں شامل کرلیا اور یہ مغل سلطنت کے اہم صوبوں میں سے تھا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغل حکمرانوں کے کمزور ہونے کی وجہ سے یہ صوبہ پہلے نیم آزاد اور پھر خود مختار یا آزاد ہوگیا اس کا آخری صوبیدار جسے مغل حکمرانوں نے مقرر کیا تھا وہ مرشد قلی خان تھا۔

بنگال مغل عہد میں

بنگال ترک اور افغانوں کے زیر حکومت رہا اس کے بعد یہ مغل حکمرانوں کے قبضے میں آیا۔ اکبر نے اپنی فوجی مہمات کا آغاز اپنی تخت نشینی 1556 کے بعد ہی سے کر دیا تھا اور شمالی ہندوستان کے بہت سے حصوں پر قبضہ بھی کرچکا تھا مگر بنگال پر حملہ کرنے کا موقع اسے 1575 میں ملا جب وہاں کے نئے سلطان دائود خان نے مغل بادشاہ اکبر کی سرپرستی سے انکار کر دیا۔ اکبر نے اپنے سپہ سالار خان خاناں منعم خاں کی مدد سے بآسانی بنگال پر قبضہ کرلیا اس طرح 1575 سے بنگال مغل سلطنت کا ایک اہم صوبہ بن گیا، باقی مغل صوبوں کی طرح یہاں بھی مغل نظم

ونسق کے مطابق افسروں کی تقرری عمل میں آنے لگی جن میں درج ذیل آفیسران اہم تھے۔

- صوبیدار ناظم : یہ صدر انتظامیہ ہوتا تھا جس کے ماتحت پورے صوبہ کا امن وامان اور شہری اور فوجی معاملات ہوتے تھے۔
- دیوان : یہ صوبہ کا دوسرا اہم افسر ہوتا تھا جس کے ذمہ ٹیکس وصولی کا کام تھا۔
- بخشی : یہ فوجی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا، فوجیوں کو تنخواہ دینا اسی کے ذمہ تھا۔
- قاضی : یہ شعبہ عدل وانصاف سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
- کوتوال : یہ شعبہ پولیس کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
- واقعہ نویس : یہ مغل بادشاہ کو صوبے کی اندرونی واقعات اور خبروں سے آگاہ کرتا تھا۔

مغل حکمراں مذکورہ افسران پر اپنی گرفت مضبوط بنائے رکھتے تھے تاکہ صوبہ میں کسی طرح کی بد نظمی اور انتشار نہ ہو مگر بعد میں یہی مغل حکمراں اپنی اندرونی کمزوریوں کے باعث اپنی ذمہ داریاں بخوبی ادا کرنے سے قاصر رہے اور خصوصاً صوبہ کے دو اہم افسر صوبیدار اور دیوان پر اپنی گرفت مضبوط نہیں رکھ سکے لہٰذا آہستہ آہستہ وہ مغل سرپرستی سے آزاد ہوتے گئے۔

بنگال ایک نیم آزاد ریاست:

18 ویں صدی کے اوائل میں بنگال کا ایک نیم آزاد اور بعد میں ایک خود مختار ریاست کی شکل میں پروان چڑھنا دراصل اس وقت کی عام حالت کی غمازی کرتا ہے جب مرکز میں سیاسی قوت کے کمزور پڑنے، باہر حملوں اور علاقائی اشرافیہ طبقوں کے آپسی گٹھ جوڑ کے چلتے بہت سی ریاستیں آزاد ہورہی تھیں، حالانکہ ان آزاد ریاستوں میں سے جانشین ریاستوں نے مغل حکمراں کی سرپرستی سے انکار نہیں کیا تھا مگر حقیقی معنوں میں مغل سلطنت کا رقبہ برائے نام ہی رہ گیا تھا کیونکہ ایک موروثی حکومت کا قیام، خود سے ریاستی افسران کی تقرری اور پھر ریاست کے خراج سے مغل بادشاہ کا حصہ بتدریج کم کرتے جانا اس بات کے بین ثبوت تھے کہ یہ اب آزاد ہو چکے ہیں۔

مرشد قلی خان:

مرشد قلی خان (1717-27) 1700ء میں بنگال کا دیوان مقرر کیا گیا تھا پھر 1713ء میں نائب صوبیدار اور 1717 میں صوبیدار بنایا گیا، مرشد قلی خاں 1700ء سے ہی جب کہ وہ صرف دیوان تھا بنگال کے صوبیدار شہزادہ عظیم کے کاموں میں عمل دخل دینے لگا تھا۔ 1719 میں فرخ سیر نے اس کو اڑیسہ کی صوبیداری بھی دے دی جس سے مرشد علی خاں کی طاقت میں مزید اضافہ ہوا اور وہ بہت سے فیصلے خود لینے لگا بعد میں مرشد قلی خاں نے صوبیدار اور دیوان کے عہدے کو ختم کر دیا اور اس عہدے کو موروثی کر دیا اس طرح یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مرشد قلی خان مغل بادشاہ کے ذریعہ مقرر کیا گیا آخری صوبیدار تھا۔ مرشد قلی خاں ایک ماہر، باصلاحیت افسر تھا 1700ء میں دیوان بنتے ہی اس نے بنگال کے نظام مالگزاری (ٹیکس نظام) پر خصوصی توجہ دی اور اس کو بہتر بنانے کی کوشش کی 1720ء کی دہائی میں اس نظام کو مزید بہتر بنانے کے لیے اس نے کچھ اور اقدام اٹھائے جس سے نہ صرف صوبے کے خزانے کو ایک متعینہ ٹیکس ملنے لگا بلکہ آئندہ کے

لیے ایک بہتر نظام کی بنیاد پڑ گئی۔ اس ضمن میں مرشد قلی خان نے جو پہلا اقدام اٹھایا وہ درمیانی زمین دار کا خاتمہ تھا۔ اسی طرح باغی زمین داروں اور جاگیر داروں کو اڑیسہ کے سرحدی علاقوں میں جلا وطن کر دیا کیونکہ اکثر نئے زمین دار نادہندہ زمین داروں کی زمینوں کو خرید کر سرکار کو فائدہ پہنچاتے تھے۔ اس وقت کے کچھ اہم زمین دار بردوان، راج شاہی، بیر بھوم، دیناج پور، نادیہ اور بشنو پور وغیرہ کے تھے۔ اس کے علاوہ مرشد قلی خان نے کسانوں کی بہتری کے لیے بھی کام کیے جیسے انہیں تقاوی قرض اور دیگر سہولیات فراہم کیں۔ دوسری طرف نئے زمین دار طبقہ کے ساتھ اس وقت ایک تجارتی طبقہ بھی ابھر رہا تھا جس کو ریاستی سرکار سے سہولیات دستیاب ہو رہی تھیں۔ دراصل ریاستی سرکار کا ان دونوں طبقات سے تال میل ہی ریاست کی ترقی کا ضامن تھا۔

شجاع الدین:

1726 میں مرشد قلی خان کے انتقال کے بعد شجاع الدین خاں بنگال کا گورنر بنا 1739ء میں شجاع الدین کے انتقال کے بعد سرفراز خان بنگال کا گورنر بنا لیکن سرفراز بہت کمزور تھا۔ شجاع الدین ایک اوسط درجہ کا سیاست دان تھا اپنے خسر مرشد قلی خاں کی طرح اس نے بھی دلی سے اپنے تعلقات ختم نہیں کیے اور خراج بھیجتا رہا مگر خود مختاری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے سارے افسروں کی تقرری اپنی مرضی سے کی اور سارے عہدوں پر اپنے لوگوں کو رکھا اور ان سب کی منظوری اس نے بعد میں لی اور خسر ہی کی طرح سے علاقائی اشرافیہ طبقوں کے تال میں سے صوبیداری کرتا رہا۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ 1739ء میں سرفراز خاں بنگال کا گورنر بنا مگر اس سے قبل کہ وہ اپنی حکومت کو مضبوط کرتا اس وقت کے بہار کے خائب صوبیدار علی وردی خاں نے اس کا قتل کر دیا اور خود بنگال کا صوبیدار بن گیا۔

علی وردی خاں:

1740ء میں علی وردی خاں نے سرفراز کا قتل کر کے خود بنگال کا صوبیدار بن گیا اور 1756 تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے عہد میں بنگال معاشی اعتبار سے خوش حال اور سیاسی اعتبار سے مضبوط تھا۔ عوام بھی اس سے خوش تھی۔ اس کے زمانہ میں مراٹھوں کے حملے ہوئے جن کا اس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اسی کے زمانے میں انگریزوں کی تجارت کو بنگال میں بے حد فروغ ہوا۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے من مانی کارروائی شروع کر دی تھی لیکن علی وردی خاں نے انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ مناسب نہیں سمجھی۔ علی وردی خاں بنگال کا اہم صوبیدار ثابت ہوا۔ صوبیدار بننے کے بعد اس نے مغل بادشاہ سے اپنی صوبیداری کے لیے تصدیق نامہ حاصل کیا۔ علی وردی خان نے ریاست کی فلاح و بہبود پر اپنا خیال مرتکز کیا اور اس نے ٹیکس وصولی کے نظام، فوجی نظم و نسق، مراٹھا حملوں کا دفاع اور یورپی کمپنیوں کی صوبے میں بڑھتی داخل اندازی وغیرہ پر دھیان دیا۔ اس نے ٹیکس کا نظام درست کرنے بہت سے ہندو افسروں کو عامل اور دیوان کے عہدوں پر رکھا۔ اسی طرح فون کو مزید مضبوط کرنے کے لیے اس نے ان افغان فوجیوں کو جو بہار اور شمال ہندوستان میں بس گئے تھے فوج میں شامل کیا۔ علی وردی کے عہد تک مراٹھوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے اور وہ جنوبی ہندوستان کی بہت سے ریاستوں پر قبضہ کر رہے تھے، چوتھ اور سردیش مکھی وصولنے کے بعد شمالی ریاستوں پر بھی حملے کر رہے تھے 1742ء سے 1751ء کے وقفہ میں مراٹھوں نے تین چار مرتبہ بنگال پر حملہ کیا اور ہر بار ریاست کو خصوصاً سرحدی گاؤں کو بہت نقصان پہنچایا لیکن بیک وقت کئی خطرات جیسے انگریز، فرانسیسی اور افغان حملوں کے ڈر سے علی

وردی خاں نے مراٹھوں کا سامنا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور 1751ء میں ان سے ایک سمجھوتہ کر لیا جس کے تحت اس نے مراٹھوں کو بارہ لاکھ (1200000) سالانہ چوتھے اور اڑیسہ کا کچھ حصہ دیا اس کے بدلے میں مراٹھا نے بنگال پر حملہ روک دیا۔ دوسری طرف بہار کے افغان اب بھی علی وردی خاں کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ 1748ء میں ایک افغان سردار مصطفی خاں نے دست بردار کیے گئے سپاہیوں کے ساتھ مل کر پٹنہ پر قبضہ کر لیا۔ علی وردی خاں ان کی سرکوبی کے لیے فوراً پٹنہ کوچ کیا اور مصطفی خاں کو شکست دے کر پٹنہ کو آزاد کروالیا۔

یورپی کمپنیاں بھی علی وسدی خاں کے لیے پریشانی کا باعث تھیں جو بنگال میں اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کر رہی تھیں۔ اگر ایک طرف فرانسیسی کمپنی چندر نگر میں قلعہ بندی کرنے میں لگی ہوئی تھی تو انگریزی کمپنی کلکتہ میں قلعہ بندی کے ساتھ مغل شہنشاہ فرخ سید کے بغیر ٹیکس تجارتی حقوق کے فرمان (دستک) کا ناجائز استعمال کر رہی تھی۔ علی وردی خاں اپنے سخت رویہ سے وقتی طور سے ان کمپنیوں کو روکنے میں کامیاب رہا مگر ان کمپنیوں نے اپنی ریشہ دوانیاں کم نہیں کیں اور بعد کے آنے والے صوبیداروں کے لیے مزید دردسر بن گئیں جو رفتہ رفتہ جنگی جدوجہد میں تبدیل ہو گئیں جس میں انگریز کمپنی بالآخر بنگال کے صوبیداروں کو شکست دے کر بنگال پر قابض ہو گئی۔

بنگال پر انگریزوں کا قبضہ:

یورپ کی 14ویں اور پندرہویں صدی کی نشاۃ ثانیہ نے مرکنٹائل تحریک یا سمندری تجارت کو جنم دیا۔ یورپ کے ممالک اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایشیاء اور افریقہ کے ممالک سے تجارتی تعلقات رکھتے تھے۔ گرم مسالوں کی تجارت تو زمانہ قدیم سے جاری تھی۔ 7ویں صدی تک یورپین قومیں براہ راست یہ تجارت ہندوستان اور ایسٹ انڈیز سے کرتی رہیں اور بعد میں عرب تاجر بھی اس میں شامل ہو گئے۔ 1498ء میں ہندوستان اور یورپ کے درمیان بحری راستہ دریافت ہونے پر ہندوستان میں یورپی تاجروں کی دلچسپی بڑھ گئی اور مختلف یورپی ممالک کی کمپنیاں یہاں کے حکمرانوں سے اجازت لے کر تجارت کرنے لگیں۔ یورپی کمپنیوں نے صرف تجارت ہی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ تجارتی مسابقہ آرائی سے اپنے مدمقابل عرب، چینی اور جاوا کے تاجروں کو بزور قوت ہٹانے لگے، اپنے تجارتی مراکز میں اپنی پکڑ بنانے کے لیے قلعہ بندی کرنے لگے، کچھ بندرگاہوں پر قبضہ کر کے آمد و رفت پر ٹیکس لگانے لگے اور بعد میں ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کر کے اپنے سیاسی عزائم اور منصوبہ کی تکمیل میں لگ گئے اور ان یورپ کمپنیوں میں سرفہرست پرتگالی، انگریز، فرانسیسی، ڈچ اور اور ڈینش، ہیں ،1757ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت بنگال میں قائم ہوئی۔

سراج الدولہ اور جنگ پلاسی 23جون1757ء:

1756ء علی وردی خاں کے انتقال کے بعد جب سراج الدولہ نواب بنا تو انگریزوں کو بنگال میں تجارت کی پوری آزادی ملی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ ہندوستانی تاجر انگریزوں سے دستک حاصل کر کے تجارت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں انگریز جن گاؤں کے زمین دار تھے اس کی

پوری آمدنی اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور بنگال سرکار کو اس میں سے کچھ نہیں دیتے تھے۔ سراج الدولہ نے جب میزان (assessment) لگوایا تو پتہ چلا کہ انگریزوں نے 1717ء سے 1756ء تک بنگال سرکار کو 1875000 (اٹھارہ لاکھ پچھتر ہزار) پونڈ کی آمدنی سے محروم کیا تھا۔ چنانچہ سراج الدولہ نے انگریزوں کے دستک جاری کرنے پر پابندی لگا دی۔

انگریزوں نے نواب کی اجازت کے بغیر اپنی فیکٹریوں کی قلعہ بندیاں کرائی تھیں اس پر بھی سراج الدولہ نے پابندی لگادی۔ انگریز سراج الدولہ کے مخالفین شوکت جنگ اور گھسیٹی بیگم سے سازشوں میں مصروف رہے تاکہ ان میں سے کسی کو سراج الدولہ کے بجائے نواب بنایا جائے۔ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ سراج الدولہ ان کی تجارتی اجارہ داری میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے اس لیے وہ سراج الدولہ کو ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو نواب بنانا چاہتے تھے۔ سراج الدولہ نے انگریزوں کی قاسم بازار کی فیکٹری پر قبضہ کر لیا۔ انچارج وائس سے بے چوں وچرا تعمیل کی۔ اس کے بعد نواب نے فورٹ ولیم فیکٹری پر حملہ کیا وہاں کے انچارج ڈریک نے مقابلہ کیا مگر اسے شکست ہوئی۔ انگریز وہاں سے نکل کر بھاگ گئے اور کچھ انگریزوں کو گرفتار کر کے ایک کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔ یہ واقعہ عام طور پر کال کوٹھری کے واقعہ (Black Hole tragedy) کے نام سے مشہور ہے۔

کلکتہ میں انگریزوں کی شکست کی خبر مدارس پہنچتے ہی رابرٹ کلایو کی سرکردگی میں ایک فوج بنگال روانہ کی گئی اور اس کے علاوہ ایک بحری فوج امیر البحر واٹسن کی نگرانی میں بھیجی گئی۔ کلکتہ 1757ء کی ابتداء میں فتح کر لیا گیا اور نواب پر دباؤ بنایا گیا کہ انگریزوں کی تمام فیکٹریاں واپس کی جائیں اور جو نقصان ہوا ہے اس کا ہرجانہ طلب کیا۔ ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی گئی کہ انکار کی صورت میں نواب کو ایک جنگ کا سامنا کرنا ہوگا۔ ملک کے سیاسی حالات کے پیش نظر سراج الدولہ 9 فروری 1757ء کو کلایو سے معاہدہ کر لیا اور انگریزوں کی فیکٹریاں واپس کرنا اور ہرجانہ دینا منظور کر لیا تھا مگر کلایو کا مقصد سراج الدولہ کو کسی نہ کسی بہانے تخت سے بے دخل کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے میر جعفر سے سازش کی۔ اس سازش میں نواب کی فوج کا سپہ سالار اعلیٰ میر جعفر اور کئی دوسرے عہدیدار شریک تھے۔ سازش کے ذریعہ میر جعفر کو بنگال کا نواب بنانا طے کیا گیا اور اس کے معاوضے میں میر جعفر نے کمپنی کے عہدیداروں کو انعام دینے اور کمپنی کے پچھلے نقصانات کی تلافی کرنے سے اتفاق کر لیا۔ اس سارے سازشی معاملہ میں پنجاب کے ایک ساہوکار کی خدمات حاصل کی گئیں جس کا نام امین چند تھا جو رابرٹ کلایو اور میر جعفر کا درمیانی آدمی تھا۔ امین چند کو بیوقوف بنانے کے لیے جعلی دستاویز تیار کیا گیا جس میں اسے بنگال کی دولت کا کافی حصہ رشوت کے طور پر دینے کا وعدہ تھا تاکہ وہ اس سازش کے راز کو فاش نہ کرے۔

نواب سراج الدولہ نے نند کمار کو تاکید کی کہ اگر انگریز فرانسیسی فیکٹری پر حملہ کریں تو ان کی حفاظت کی جائے لیکن نند کمار نے انگریزوں سے رشوت لے کر فرانسیسی فیکٹری چندر نگر پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا۔ فرانسیسیوں نے نواب کے پاس جا کر پناہ لی۔ کلائیو نے نواب سے فرانسیسوں کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا لیکن نواب نے انکار کر دیا اس طرح پلاسی کی جنگ ناگزیر ہو گئی۔ رابرٹ کلایو نے تین ہزار دو سو (3200) کی فوج کے ساتھ مرشد آباد کی طرف پیش قدمی کی جو بنگال کا پایہ تخت تھا۔ سراج الدولہ کے پاس پچاس ہزار فوج تھی جس کا سپہ سالار میر جعفر پہلے ہی سے انگریزوں سے جا ملا تھا۔ دونوں فوجیں 23 جون 1757ء کو پلاسی کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل

ہو گئیں اس میں کلایو کو فتح نصیب ہوئی۔ نواب سراج الدولہ کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ کلایو نے میر جعفر کو نواب مقرر کیا اور میر جعفر نے حسب ذیل شرائط منظور کیں۔

- کلایو کو ذاتی جاگیر کے طور پر 24 پرگنے دیے گئے۔
- میر جعفر نے منظور کیا کہ انگریزوں کے دشمن نواب کے دشمن ہوں گے۔
- انگریزوں کی فوج قائم کی جائے گی جس کا خرچ نواب دے گا۔
- نواب کو ایک کروڑ ستتر لاکھ (177,00000) تاوان جنگ ادا کرنا ہوگا۔

اس طرح میر جعفر نے انگریزوں کو وہ تمام تجارتی مراعات بھی دیں جو سراج الدولہ نے منسوخ کر دی تھیں۔ جنگ پلاسی اور بنگال کی لوٹ گھسوٹ سے انگریزوں کو وسیع تر وسائل حاصل ہوئے اور اس جنگ کے بعد انگریز حقیقی معنوں میں بنگال کی تجارت کے اجارہ دار بن گئے۔ انگریزوں کی لالچ دن بدن بڑھتی گئیں مزید سہولیات اور مزید نقدی رقم کے ساتھ ساتھ انگریز بالواسطہ انتظامی امور میں بھی دخل اندازی کرنے لگے اور جب میر جعفر نے انگریزوں کی بڑھتی دخل اندازی پر ناراضگی جتائی اور مزید پیسوں کے مطالبات پورے نہیں کیے تو اسے صوبیدار کے عہدے سے دستبردار کر دیا گیا۔

میر قاسم اور جنگ بکسر

نواب میر قاسم (1760 تا 1764) نے انگریزوں سے معاہدہ کیا اور تمام قرضے ادا کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ اس نے بنگال کے علاقے جہاں بدامنی رہتی تھی جیسے مدناپور، چٹاگانوں اور بردوان انگریزوں کو دے کر قرضہ ادا کر دیا۔ انگریزوں کے ہم نوا رام نرائن کو معطل کیا۔ مرشد آباد کی جگہ مونگیر کو اپنی راجدھانی بنایا۔ یہاں رہ کر اس نے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہتھیاروں کی فیکٹریاں قائم کیں۔ انگریزوں کو اپنی فوج سے نکالا۔ اس نے گورنر وینسی ٹاٹ کی بھی پرواہ نہیں کی۔ میر جعفر کے زمانے میں انگریزوں کو نمک اور پان کی تجارت بھی دے دی گئی تھی۔ میر قاسم نے کمپنی کے یہ حقوق بھی رد کر دیے۔ انگریز بغیر ٹیکس دیے تجارت کرتے تھے لیکن ہندوستانی تاجروں کو انگریزوں سے دستک حاصل کرنی پڑتی تھی۔ میر قاسم نے ہندوستانی تاجروں کو بھی بغیر دستک اور بغیر ٹیکس ادا کیے تجارت کی اجازت دے دی۔

نواب بنگال کا یہ رویہ دیکھ کر وینسی ٹارٹ نے مونگیر پر فوج کشی کر دی۔ میر قاسم نے اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ اور شہنشاہ مغل سے مدد مانگی اور فوج لے کر میر قاسم پر چڑھائی کر دی۔ 23 اکتوبر 1764ء کو بکسر کے مقام پر جنگ لڑی گئی۔ اس جنگ میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی بھی میر قاسم کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑے اس میں فتح انگریزوں کو ہوئی۔ اس جنگ کے نہ صرف بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا بلکہ پورے ہندوستان پر اس کے بہت دور رس اثرات پڑے۔ کمپنی نے 1765ء میں کلایو کو دوبارہ گورنر بنا کر بھیجا 1765ء میں کلایو اور شاہ عالم کے درمیان معاہدہ الہ آباد ہوا اس معاہدے کی حسب ذیل شرطیں تھیں۔

- انگریزوں کو قانونی طور پر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی (ٹیکس وصولنے کا حق) حاصل ہوئی۔
- انگریزوں نے شاہ عالم کو 26 لاکھ روپے سالانہ خراج دینا منظور کیا۔
- شاہ عالم کو الہ آباد اور کڑہ کا علاقہ بھی دیا۔
- انگریزوں نے شاہ عالم کو مغل شہنشاہ تسلیم کیا مگر دہلی کے تخت پر قبضہ دلانے کی مدد کی درخواست کو انگریزوں نے نامنظور کر دیا۔
- 1773ء میں معاہدہ بنارس کے تحت شجاع الدولہ کو حسب ذیل شرطیں ماننی پڑیں۔
- 1 شجاع الدولہ نے 30 لاکھ روپے تاوان جنگ ادا کرنا منظور کیا۔
- شجاع الدولہ کو اپنے صوبے میں انگریزی فوجیں رکھنے اور تربیت پر خرچ کی ذمہ داری لینی پڑی۔
- انگریزوں کے دشمن نواب شجاع الدولہ کے دشمن اور انگریزوں کے دوست نواب شجاع الدولہ کے دوست مانے گئے۔
- کلایو نے میر جعرف کو دوبارہ نواب بنادیا۔

مذکورہ بالا معاہدے ہندوستان کی تاریخ ایک تاریک باب تھا۔ خصوصاً بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کے حقوق والا معاہدہ کیونکہ اس سے قبل انگریزوں کو ہندوستان میں مال خریدنے کے لیے سونے اور چاندی کے سکون میں قیمت ادا کرنی پڑتی تھی مگر ان تین ریاستوں کے ٹیکس وصولی کے حق سے انگریزوں کے پاس ہندوستان میں آمدنی کا ایک ذریعہ ہوگیا اور اب وہ اسی آمدنی سے یہاں کا مال خریدتے تھے جس سے ہندوستان کی معیشت کو بھاری نقصان ہوگیا۔

15.3.2 اودھ (Oudh)

اودھ شمالی ہندوستان کا ایک اہم صوبہ تھا۔ مغل قبضے سے قبل یہ مختلف ریاستوں میں تقسیم تھا جیسے آگرہ، بندیل کھنڈ، گڑھوال، کڑھ، بنارس اور جونپور وغیرہ 1722ء میں سعادت علی خاں کو یہاں کا صوبیدار متعین کیا گیا جو مغل حکمرانوں کے ذریعہ مقرر کیا گیا آخری صوبیدار تھا کیونکہ اس وقت کی دیگر ریاستوں کی طرح سعادت علی نے بھی مرکزی سیاست میں دلچسپی کے باوجود اپنے صوبہ کو ایک خود مختار ریاست بنانے پر زیادہ دھیان دیا اور ریاست کی صوبیداری کو موروثی بنادیا۔

اودھ ایک آزاد ریاست:

بنگال اور حیدرآباد کی طرح پہلے ایک نیم آزاد اور پھر ایک خود مختار ریاست بن گیا۔ مغل شہنشاہ کے ذریعہ مقرر کردہ آخری صوبیدار سعادت علی خاں نے مغل دربار میں اپنی خواہشات کے پورے نہ ہونے کے باعث اپنا سارا دھیان اپنی ریاست پر مرکوز کر دیا۔ اور علاقائی زمین داروں اور اشرافیہ طبقہ کی مدد سے ایک علاحدہ سیاسی، معاشی اور فوجی نظام کو تشکیل دیا اور آہستہ آہستہ دلی سے اپنے تعلقات ختم کرتا گیا۔

سعادت علی خاں اور اودھ:

سعادت علی خاں برہان الملک (1739-1724) ایرانی شیعہ تھے اور مغل دربار میں امیر اور وزارت کے عہدے کے مضبوط

دعویدار تھے۔ جاٹوں کے خلاف اس کی خدمات کو دیکھتے ہوئے پہلے آگرہ کا پھر 1722ء میں اودھ کا صوبیدار بنایا گیا وہ اودھ کو ایک خود مختار ریاست بنانے میں کوشاں ہو گیا۔ حالانکہ اوددھ کو خود مختار ریاست بنانا آسان نہیں تھا کیونکہ اودھ کے علاقائی زمین دار اور دیگر اشرافیہ طبقے اپنی آزادی کا ختم ہونا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سعادت علی خاں نے تمام مخالفت کا ڈٹ کر سامنا کیا۔ اس نے باغی اور سرکش زمینداروں کے زور کو کم کیا، مدد معاش کی زمینوں کو محدود کیا، ٹیکس کے نظام کو مزید بہتر بنایا اور پھر حامی زمین داروں اور اشرافیہ طبقہ کی مدد سے ایک خوشحال اور مضبوط ریاست کی داغ بیل ڈالی۔ 1735ء میں کڑہ، جہان آباد، بنارس، جونپور، غازی پور اور چندر گڑھ بھی اس کے زیر نگرانی ہو گئے مگر مغل دربار میں اپنی خدمات انجام دینے کی اس کی دیرینہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور 40-1739 میں اس کی میر بخشی بننے کی درخواست کو بھی مسترد کر دیا گیا۔ سعادت علی خاں نے ایک بڑی فوج کے ساتھ نادر شاہ درانی کے حملے کا مقابلہ مغل شہنشاہ کے ساتھ مل کر کیا جب کہ بہت سے سردار اور صوبیدار اس وقت اپنے کو بچائے رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔ سعادت علی خاں نے نادر شاہ اور محمد شاہ کے درمیان سمجھوتہ کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا مگر یہاں بھی سعادت علی کی نیک نیتی پر شبہہ کیا گیا۔ دوسری طرف نادر شاہ نے بھی سعادت علی سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا۔ 1739ء میں سعادت علی خاں کا انتقال ہو گیا اور ان کا بھتیجہ صفدر جنگ (1754-1739) اودھ کا گورنر بنا اور مغل سلطنت کا وزیر مقرر رہا۔

صفدر جنگ اور اودھ:

صفدر جنگ سعادت علی خان کا داماد اور ولی عہد تھا۔ اس نے سعادت علی خاں کی قائم کردہ نیم خود مختاری کی روایت کو مزید آگے بڑھایا۔ شاہی دیوان کا عہدہ بھی ختم کر دیا گیا۔ ایک نئے نظام کا آغاز ہوا جس میں مختلف طبقات اور مذاہب کے لوگوں کو موقع دیا گیا۔ دلی کی سرپرستی اب محض اونچے عہدوں پر افسروں کی تقرری کے لیے منظوری، مغل شہنشاہ کو ٹیکس کا حصہ بھیجنے اور شہنشاہ کے نام سے فرمان والقاب صفدر جنگ نے ریاست کے نظم ونسق کے ساتھ اس کی توسیع پر بھی دھیان دیا۔ چنانچہ اس نے گنگا کے میدانی علاقوں اور رہتاس وچنار کے ساتھ ساتھ الہ آباد کو بھی اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ ان کامیابیوں کے باعث صفدر جنگ آخر کار سعادت علی خاں کی وزارت کی دیرینہ خواہش پوری کرنے میں کامیاب رہا کیونکہ اودھ کی صوبیداری کے ساتھ اسے مغل دربار کا وزیر بھی مقرر کر دیا گیا۔ حالانکہ کچھ ہی دنوں بعد فرخ آباد پر قبضہ کرنے اور اپنی ریاست کی مزید توسیع کرنے کی وجہ سے اس نے مغل دربار کی ناراضگی مول لے لی اور وزارت کے عہدے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ مگر 1754ء میں دلی پر مراٹھا حملہ کے وقت دی گئی خدمات کے صلہ میں مغل دربار سے اس کے رشتے ایک مرتبہ پھر استوار ہوئے لیکن یہ کچھ ہی دنوں رہے۔

شجاع الدولہ اور اودھ:

شجاع الدولہ صفدر جنگ کا بیٹا تھا اور اپنے والد کے انتقال کے بعد 1759ء میں نیا نواب بنا۔ اپنے والد ہی کی طرح اس نے تین چیزوں پر اپنے دھیان کو مرکوز کیا۔

- ریاست کا نظم ونسق۔
- ریاست کی توسیع۔
- مغل دربار سے اچھے مراسم بنانا۔

سعادت علی خاں کے عہد میں بلا تفریق مذہب وملت یاذات پات کے تقرری کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ابھی تک جاری تھا۔ چنانچہ نائب صوبیدار جیسے اہم عہدے پر راجہ بنی بہادر اور نواب کے ذاتی سکریٹری کے عہدے پر دیشا ستھ برہمن کی تقرری اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شجاع الدولہ نے مغل دربار سے اچھے مراسم رکھے۔ شجاع الدولہ کو شمالی ہندوستان میں ہونے والی کچھ جنگوں میں بھی حصہ لیناپڑا جس میں دو جنگیں کافی اہم ہیں۔ پہلی پانی پت کی تیسری (14 جنوری 1761ء) جو مراٹھا اور افغان سردار احمد شاہ ابدالی کے درمیان ہوئی جس میں شجاع الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دیا تھا تاکہ وہ شمالی ہندوستان میں مراٹھوں کا زور کم کر سکے اور ان کو اودھ سے دور رکھ سکے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔ دوسری جنگ بکسر کی جنگ (1764) تھی جس میں شجاع الدولہ نے انگریزوں کے خلاف بنگال کے نواب میر قاسم اور مغل شہنشاہ شاہ عالم ثانی کا ساتھ دیا مگر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ جنگ جیت نہیں سکا اور اسے الہ آباد کا معاہدہ (12 اگست 1765) کرناپڑا۔

اودھ پر انگریزوں کا قبضہ

پلاسی، بکسر اور جنوبی ہندوستان میں اینگلو فرانسیسی جنگ میں کامیابی سے انگریزوں کو اپنی قوت اور ہندوستانی ریاستوں کی کمزوری کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ یکے بعد دیگرے یہاں کی ہر ریاست پر قبضہ کرتے جارہے تھے۔ اودھ پر انگریزوں کے تسلط کو بتدریج تین ادوار میں سمجھا جا سکتا ہے۔

اودھ (1764 تا 1775): اودھ پر انگریزوں کے تسلط کی ابتدا، شجاع الدولہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے جب شجاع الدولہ میر قاسم اور شاہ عالم ثانی کے ساتھ جنگ بکسر میں ہار گیا اور اس کو الہٰ آباد کے معاہدہ پر دستخط کرنی پڑی۔ اس معاہدے سے اودھ کی خود مختاری کو جھٹکا لگا کیونکہ اس معاہدے کے تحت اودھ نے اپنے دو اہم علاقے کڑھ اور الہٰ آباد گنوادیے، ساتھ ہی پچاس لاکھ تاوان جنگ بھی دینے پڑے۔ جنگ بکسر اور معاہدہ الہٰ آباد سے جو ذلت ہوئی وہ شجاع الدولہ کے لیے ناقابل برداشت تھی لہٰذا اس نے اپنی فوج کی از سر نو تنظیم شروع کردی اور اس کے لیے اس نے فرانسیسیوں سے مدد طلب کی جو انگریزوں کو ناگوار گزری اور انگریزوں نے دوبارہ اودھ پر نکیل کسنے کا ارادہ کیا۔ اس طرح 1773ء میں اودھ کے نواب کے ساتھ ایک اور معاہدہ کیا گیا جو معاہدۂ بنارس کے نام سے جانا جاتا ہے جس کے تحت کڑہ اور الہ آباد ایک بڑی رقم کے بدلے نواب کو واپس بیچ دیے گئے اور اودھ کی حفاظت ودفاع کے نام پر اودھ میں انگریز فوج کی ایک ٹکڑی رکھی گئی جس کا خرچ اودھ کے نواب کے ذمہ تھا۔ ان کی وجہ سے نواب اودھ کی اقتدار پر گرفت کمزور ہوتی گئی اور وہ قرض کے دلدل میں دھنستے چلے گئے اور بالآخر انہیں اپنی ریاست گنوانی پڑی۔

اودھ (1775 تا 1797): شجاع الدولہ کے بعد اس کا بیٹا آصف الدولہ نیا نواب بنا۔ اس کا عہد پر سکون رہا مگر شجاع الدولہ کے عہد میں انگریزوں سے جس چپقلش کا آغاز ہوا تھا اس کا خمیازہ آصف الدولہ اور باقی نوابوں کو بھی بھگتنا پڑا۔ نواب بننے کے بعد آصف الدولہ نے فیض آباد کی

جگہ لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنایا جو ایک طرف نواب کی سرپرستی میں علم و ادب، فنون لطیفہ اور تہذیب کا گہوارہ بنتا جا رہا تھا اور دوسری طرف انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث انگریز فوجیوں کی چھاؤنی بھی بن رہا تھا۔ نواب پر اپنی گرفت بنانے کے لیے انگریزوں نے ایک نیا معاہدہ کیا جس کو معاہدۂ فیض آباد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت آصف الدولہ سے یہ کہا گیا کہ وہ بنگال کے جلاوطن نواب میر قاسم کو پناہ نہیں دے گا۔ اسی طرح اس معاہدے کے تحت نواب کو بنارس، غازی پور، اور جونپور سے بھی دستبردار ہونا پڑا اور اسے راجہ چیت سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس طرح ریاست میں رہنے والی انگریز فوج اور اس کے خرچ میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ معاہدے کی رو سے نواب کو اپنے دربار میں ایک انگریز نمائندہ (Resident) رکھنا پڑا جو نواب اور انگریزوں کے درمیان سفارتی تعلقات رکھنے کے ساتھ نواب پر بھی نگاہ رکھتا تھا۔ اس معاہدے کی شرطوں نے اودھ کی خود مختاری پر چوٹ پہنچانے کے ساتھ ہی سیاسی اور معاشی قوت پر بھی منفی اثرات ڈالے۔ انگریزوں کو ہر ماہ بڑی رقم دینے کی وجہ سے نواب خود اپنی فوج کو وقت پر تنخواہ نہیں دے پا رہا تھا جس سے اس کی فوج کمزور ہوتی گئی، اور بسا اوقات فوج بغاوت بھی کر دیتی۔ اسی طرح ایذیڈنٹ کی دخل اندازی بھی نواب کی پریشانی کا باعث ہوئی۔ انگریزوں نے نواب پر بڑھتے دباؤ کو محسوس کیا اور کسی منفی انجام سے بچنے کے لیے اسے کم کرنے کا فیصلہ کیا اور 1784ء میں گورنر جنرل ہیسٹنگز نے نواب کے کچھ قرض معاف کرنے کا فیصلہ کیا جس سے 1797ء میں نواب کے انتقال تک انگریز اور اودھ کے رشتے بہتر رہے۔

اودھ (1797 تا 1856): آصف الدولہ کے انتقال کے بعد فوراً ہی انگریزوں نے نئے وزیر علی کی جانشینی کو لے کر دخل اندازی کی اور 1798ء میں اس کو بے دخل کر کے سعادت علی کو نواب بنا دیا۔ دوسری طرف 1798ء میں لارڈ ویلزلی نیا گورنر جنرل بن کر آیا۔ جو ہندوستان پر مکمل تسلطن قائم رکھنا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے دو طریقہ اپنایا۔

- نظام معاونت (Subsidiary Alliance)
- اور جنگ

چنانچہ وہ ریاستیں جو انگریزوں سے جنگ نہیں چاہتی تھیں جیسے حیدرآباد، اودھ، پیشوا اور مختلف مراٹھا سردار وغیرہ انہوں نے انگریزوں سے نظام معاون کا معاہدہ کر لیا اور جن ریاستوں نے اس سمجھوتے کو اپنی شان اور عزت نفس کے خلاف سمجھا انہوں نے انگریزوں سے جنگ کی بھلے ہی انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ جیسے ریاست میسور۔

1801ء میں ویلزلی اور اودھ سے نظام معاونت کا معاہدہ کیا جس کے تحت اودھ کے نواب نے اپنی لگ بھگ آدھی ریاست گنوا دی جس میں روہیل کھنڈ، گورکھپور اور دوآب کے بیشتر علاقے شامل تھے۔ اسی نواب کو اپنی ریاست میں مزید انگریز فوج رکھنی پڑی اور ریاست کے انتظامی امور میں ریذیڈنٹ کی دخل اندازی بھی بڑھ گئی جس سے بیشتر اوقات نواب اپنی مرضی سے فیصلہ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ لہٰذا ریاست کی بتدریج بد سے بدتر ہوتی گئی۔ بعد میں آنے والے نواب جیسے ناصرالدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ بھی کسی طرح کی تبدیلی نہیں لا سکے اور بالآخر نواب واجد علی شاہ کے عہد 1856ء میں لارڈ ڈلہوزی نے بدانتظامی کے الزام میں اودھ پر قبضہ کر کے اسے انگریزی حکومت میں شامل کر لیا۔

اودھ کا نظم ونسق:

اودھ ایک جانشین ریاست تھی اس لیے اس کے بہت سے انتظامی امور میں مغل نظم ونسق کی جھلک دکھائی دیتی تھی خواہ نظام ٹیکس ہو یا نظام فوج مگر ایک علاقائی طاقت بننے کے لیے اودھ کے نوابوں کو علاقے کے بااثر طبقات سے بھی میل جول رکھنا پڑا اور انہیں عزت دینے کے ساتھ ہی سرکاری عہدے بھی دینے پڑے۔ ان علاقائی طاقتوں میں زمین دار اور بڑے تاجر اہم تھے۔ بنگال ہی کی طرح اودھ کے نوابین نے بھی کچھ باغی اور سرکش زمین داروں کی سرکوبی کرنے کے بعد باقی زمین داروں سے دوستی کرکے انہیں ان کا جائزہ حق ومقام دیا جس سے انہیں گاؤں اور پرگنہ کا نظام سنبھالنے میں مدد ملی۔ اسی طرح بڑے تاجر اور ساہوکاروں نے بھی شہری انتظام سنبھالنے، نیک دلوں کی دیکھ ریکھ کرنے میں نواب کی مدد کی اور ضرورت پڑنے پر ان تاجروں اور ساہکاروں نے نواب کو قرض بھی دیا۔ اودھ کے نوابین نے علم وہنر، فنون لطیفہ اور تہذیب وتمدن کو بھی فروغ دیا۔ سواصدی پر محیط ریاست اودھ میں ہر صاحب علم اور فن کار کا استقبال تھا۔ زبان وادب کے کتنے ہی ماہرین مختلف ریاستوں سے آکر اودھ کو اپنا مرکز بنایا۔ مرزا رفیع سودا اور میر غلام حسن کو نواب اودھ کی خاص سرپرستی حاصل تھی:۔

15.3.3 حیدرآباد (Hyderabad)

حیدرآباد دکن کی اہم ریاست تھی جو 1512ء سے گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کے ماتحت تھی 1687ء میں اورنگ زیب نے اسے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور اسے جنوبی ہند کے تمام صوبوں کا مرکز بنایا 1713ء سے 1715ء تک یہاں کا صوبیدار چن قلیچ خان تھا جس کو نظام الملک کا لقب بھی دیا گیا تھا۔ 1720ء میں دوبارہ اس کو صوبیدار بنایا گیا پھر دو سال بعد محمد شاہ نے مرکزی دربار میں وزیر بنانے کے لیے نظام الملک کو واپس بلالیا۔ حالانکہ نظام الملک نے محمد شاہ کے مخالف سید برادران کو راستے سے ہٹانے میں مدد دی مگر اس وقت مغل دربار میں امراء کی آپسی رسہ کشی کو دیکھتے ہوئے نظام الملک نے دکن ہی کو بہتر سمجھا اور بغیر شہنشاہ کی اجازت کے حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گیا۔

نظام الملک اور حیدرآباد:

مغل دربار سے ناامید ہو کر نظام الملک آصف جاہ نے اپنا پورا دھیان حیدرآباد پر دیا اور علاقائی زمین داروں، تاجروں اور دیگر اشرافیہ طبقوں سے مل کر ایک ریاستی نظم ونسق کی بنیاد رکھی اور آہستہ آہستہ دلی سے تعلق منقطع کر لیا۔ نظام الملک کو اپنی ریاست کو باقی رکھنے کے لیے جنوبی ہندوستان کی دیگر ریاستوں کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں میسور اور مراٹھا اہم تھے۔ حالانکہ نظام الملک مراٹھا کا سامنا اس وقت سے کر رہا تھا جب وہ (1713 تا 1715) پہلی مرتبہ یہاں کا صوبیدار بنایا گیا تھا، اس وقت نظام الملک نے مراٹھا کا سختی سے سامنا کیا اور ان کے چوتھ اور سردیش مکھی کے مطالبوں کو یکسر مسترد کر دیا مگر 1724ء کے بعد اپنی ریاست میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے نظام الملک کو ان کا مطالبہ ماننا ہی پڑا۔ حالانکہ مراٹھا کی آپس کی خانہ جنگی اور 1726ء میں پیشوا کے حملے کے چلتے نظام الملک نے پیشوا کے بجائے سنبھاجی کو چوتھ دینا شروع کر دیا جو مراٹھا کی دوسری شاخ حکومتِ کولھاپور کا راجہ تھا، جب کہ پیشوا مراٹھا کی پہلی شاخ حکومت سارا کے راجہ ساہو کی نمائندگی کر رہا تھا۔ 1728ء میں پیشوا نے پھر حیدرآباد پر حملہ کیا اور پالکھیڈ کے مقام پر نظام الملک کو شکست دی جس سے نظام الملک کو پھر سے پیشوا کو چوتھ دینا پڑا۔

نظام الملک کے جانشین:

1748ء میں نظام الملک کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ناصر جنگ نواب بنا مگر دوسری طرف اس کے بھانجے مظفر جنگ نے بھی اپنی دعویداری پیش کر دی۔ اس طرح دونوں آمنے سامنے ہو گئے۔ چنانچہ انگریزوں نے ناصر جنگ اور فرانسیسیوں نے مظفر جنگ کا ساتھ دیا۔ نتیجتاً انگریزوں اور فرانسیسیوں میں دوسری اینگلو فرانسیسی جنگ (1750-1749) ہوئی جس میں ناصر جنگ مارا گیا اور فرانسیسیوں نے مظفر جنگ کو نواب بنا دیا۔ مگر مظفر جنگ بھی زیادہ دنوں تک حکومت نہیں کر سکا اور ایک حادثے میں 1751ء میں اس کی موت ہو گئی۔ اس کے انتقال کے بعد نظام الملک کا تیسرا بیٹا صلابت جنگ نواب بنا اور 1760ء تک حیدر آباد کا نواب رہا۔ اس کے انتقال کے بعد نظام الملک کا چوتھا بیٹا نظام علی نواب بنا اور 1803ء تک حکومت کرتا رہا۔ نظام علی کا دور قدرے پر سکون رہا کیونکہ اس کے سب سے بڑے حریف مراٹھوں کا 1761ء میں افغانوں کے خلاف پانی پت کی تیسری جنگ (1761ء) میں ہارنے کے بعد زور کم ہو گیا تھا۔ باقی دو حریفوں میسور اور انگریزوں کا سامنا اس نے میسور کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دے کر کیا۔ بظاہر حیدر آباد اور انگریزوں کے رشتے بڑے اچھے تھے مگر اس کے لیے حیدر آباد کے نوابوں کو ایک بڑی مالی قیمت چکانی پڑی تھی۔

حیدر آباد اور انگریز :

انگریزوں نے نظام حیدر آباد کے معاملے میں پہلی مرتبہ نظام الملک کے انتقال کے وقت جانشینی کے مسئلہ پر دخل اندازی کی، حالانکہ اس وقت وہ ناصر جنگ کو تخت پر بیٹھانے میں ناکام رہے۔ اس کے بعد انہوں نے صلابت جنگ کے وقت ایک دوستانہ معاہدہ کیا جس کو مسولی پٹنم کا معاہدہ کہا جاتا ہے مگر انگریزوں کے لیے اس سے زیادہ کارآمد معاہدہ، معاہدہ حیدر آباد ثابت ہوا جو انہوں نے 1766ء میں کیا۔ اس معاہدے کے تحت وہ ریاست کے مشرقی حصے کی پانچ سرکار یعنی ایلور، راجہ بندی، مصطفی نگر اور مرتضی نگر حاصل کرنے میں کامیاب رہے مگر انگریز نئے نظام، نظام علی کا حال دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ وہ ان کے خلاف جانے کی غلطی نہیں کرے گا، لہٰذا اس پر مزید دباؤ بنانے لگے اور 1768ء میں معاہدہ حیدر آباد کے نام سے ایک اور معاہدہ کیا جس کے تحت حیدر آباد سے انگریزوں کے پرانے دشمن میسور کا ساتھ نہ دینے کا وعدہ لیا گیا۔ نظام حیدر آباد نے بیشتر اوقات انگریزوں کا ساتھ دیا یہاں تک انگریز اور دیگر ہندوستانی ریاستوں جیسے میسور اور مراٹھا جھڑپ کے وقت بھی حیدر آباد نے انگریوں کا ہی ساتھ دیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حیدر آباد ایک طویل عرصہ تک انگریزوں کی توسیعی پالیسی کی زد میں نہیں آیا مگر نظام علی کے آخری دور میں لارڈ ویلزلی نے اس پر اپنی نظام معاونت کی پالیسی نافذ کر دی جس کے تحت نظام کو نہ صرف انگریزوں ایک مرتبہ پھر ایک بڑی مالی قیمت ادا کرنی پڑی بلکہ اپنی خود مختاری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

نظم و نسق:

1724ء میں حیدر آباد کی صوبیداری حاصل کرنے کے بعد نظام الملک اس کی توسیع کے ساتھ اس کے نظم و نسق پر بھی زور دیا۔ حیدر آباد نے بھی علاقائی طاقتوں اور علاقائی روایتوں کے مطابق ایک مخصوص نظام کی بنیاد رکھی۔ نظام الملک نے جاگیرداری نظام کو باقی رکھا لیکن ریاست میں درمیانی طبقوں (وکیل) کا بول بالا تھا۔ یہ وکیل نواب اور امراء کے درمیان بطور ایجنٹ کام کرتے تھے یہاں تک کہ نواب اور

دیگر باہری طاقتوں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں مدد کرتے تھے۔اسی طرح نظام الملک نے مقامی سرداروں کو بھی باقی رکھا جواپنی موروثی زمینوں سے جڑے ہوئے تھے اور نظام الملک کو سالانہ پیش کش دیا کرتے تھے۔

فوج کی تنظیم اور بھرتی میں نظام الملک نے مغل روایت کو باقی رکھا اور پہلے ہی کی طرح فوج کی بھرتی جاگیرداروں اور امراء کے ذریعہ ہوتی رہی۔ اسی طرح خراج وصولنے کے نظام میں بھی حیدرآباد نے پرانے طریقے کو باقی رکھا اور ٹیکس وصولنے کی ذمہ داری جاگیرداروں اور مقامی سرداروں کی تھی۔ خراج کی مقدار پیداوار کا نصف یعنی پچاس فیصد بھی مگر عموماً وصولی جس کو جمع بندی بھی کہتے تھے تخمینہ یعنی کامل سے کم ہی ہوتی تھی۔ جاگیرداری موروثی ہونے اور اجارہ داری کے نظام سے کسانوں کا استحصال بڑھ گیا۔

انتظامی امور میں بھی بعض تبدیلیاں کی گئیں۔ دیوان کا عہدہ ختم کردیا گیا جس سے چھوٹے افسران جیسے دفتری یا دفتر دار جو سرکاری درج رکھتے تھے اور عامل وغیرہ زیادہ طاقت ور ہونے لگے جس سے بدعنوانی کے مواقع بڑھ گئے۔

15.4 باغی ریاستیں (Rebel States)

14ویں صدی کے اوائل میں مغل سلطنت کے کمزور ہونے کی وجہ سے مراٹھا، سکھ جاٹ اور روہیل کھنڈ جیسی ریاستیں وجود میں آئیں جن کو نئی یا باغی ریاست کا نام دیا جاسکتا ہے۔

15.4.1 شیواجی اور مراٹھا (Shivaji and the Marathas)

ایک ریاستی حکمراں کی حیثیت سے شیواجی کا عروج بھی اسی اہمیت کا حامل ہے جو حیدر علی، رنجیت سنگھ، نواب علی محمد اور محمد خان بنگش کو حاصل تھی۔ شیواجی کے والد شاہ جی (1663ء) تک بیجاپور کے حکمراں عادل شاہ کے درباری تھے۔ خدمت کے عوض انہیں پونا کی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ شیواجی نے اس جاگیر میں اضافہ کرکے ریاست بنالی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا مگر مغل حکمراں نے تسلیم نہیں کیا۔ اصل میں تو شیواجی مراٹھوں کی ریاست کے بانی تھے کچھ مورخین کا خیال ہے کہ شیواجی پورے ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

شیواجی نے سب سے پہلے بیجاپور کے کچھ علاقوں پر قبضہ کیا۔ بیجاپور کے حکمراں نے افضل خاں کو شیواجی کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ شیواجی نے افضل خاں کو قتل کردیا اور نگ زیب نے جب دکن کی فتح کی تو شیواجی کی بغاوت بھی رونما ہوئی۔ شیواجی نے مغل شہنشاہ کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کردیا تو اورنگ زیب نے شائستہ خاں کو شیواجی کی سرکوبی کے لیے بھیجا لیکن شائستہ خاں کی ہار ہوئی۔ اس کے بعد جے سنگھ کو بھیجا گیا اور وہ اپنے اثر سے شیواجی کو آگرہ لانے میں کامیاب ہوا۔ شیواجی اپنے والد کے زمانے میں ہی آس پاس کے علاقوں پر حملہ کرکے ان کو اپنی جاگیر میں شامل کرنا شروع کردیا تھا 1647ء میں اپنے سرپرست کونڈادیو کے انتقال کے بعد وہ مزید آزادی کے ساتھ فیصلے لینے لگا اور آس پاس کے علاقوں پر اپنی یورش تیز کردی۔ جنوبی ہندوستان کی بہت سی چھوٹی ریاستوں کو جیتنے کے بعد وہ بیجاپور، گجرات، گولکنڈہ

جیسی بڑی ریاستوں پر بھی حملہ کرنے لگااوران سے چوتھ کا مطالبہ کیا یہاں تک کہ وہ مغل سلطنت سے بھی سیدھی ٹکر لینے لگااور بہت سے مغل علاقے جیسے کونکن، سورت وغیرہ پر بھی حملہ کر کے کثیر مال غنیمت حاصل کیا۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے شیواجی کی سرکوبی کے لیے کئی فوجی مہم چلائی جن میں بیشتر ناکام رہیں، آخر 1765ء میں مغل اور شیواجی کے درمیان پرندر کا معاہدہ ہوا مگر وہ بھی بہت کامیاب نہیں رہا۔ 1674ء میں شیواجی نے رائے گڑھ کے مقام پر اپنی تاج پوشی کر کے باقاعدہ ایک سلطنت کا آغاز کیا۔ 1681ء میں شواجی کے انتقال کے بعد جانشینی کی کشمکش کی وجہ سے مراٹھوں کا زور ختم ہو گیا۔

مراٹھا وفاق:

شیواجی کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا سمبھاجی اپنے چھوٹے بھائی راجہ رام کو مراٹھوں کا نیا راجہ بنا۔ 1689ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور راجہ رام کو راجہ بننے کا موقع ملا۔ راجہ رام نے 1711ء تک حکومت کی اور اپنے والد ہی کی طرح مغل اور دیگر ریاستوں کے خلاف چھاپے ماری کی مہم جاری رکھی۔ اس دوران اس کو مغل حملوں کے باعث اپنا دارالحکومت رائے گڑھ سے جنجی اور جنجی سے ستارہ منتقل کرنا پڑا۔ راجہ رام کی وفات کے بعد اس کے بیٹے شیواجی ثانی کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے اس کی بیوی تارابائی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ دوسری طرف 1707ء میں سمبھاجی کے بیٹے ساہو کو جس کو 1689ء میں مغل فوج نے اس کی ماں کے ساتھ گرفتار کر لیا تھا، مغل شہنشاہ بہادر شاہ اول نے آزاد کر دیا جس سے ساہو اور تارابائی میں تخت کے لیے جدوجہد شروع ہو گئی اس کے لیے کھیڑ کی جنگ ہوئی جس میں تارابائی کی شکست ہوئی۔ ساہو مراٹھا راجہ بن گیا اور 1749ء تک حکومت کرتا رہا۔

ساہو کے دور حکومت میں مراٹھوں کے سیاسی نظام اور حکومت کی نوعیت میں کئی تبدیلیاں واقع ہوئیں سب سے اہم تبدیلی یہ تھی کہ پیشوا جو مراٹھا نظام کے آٹھ پردھانوں میں سے ایک پردھان تھا، نیم خود مختار ہو گیا اور ساتھ ہی اس نے اس عہدے کو موروثی بنا دیا۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ مراٹھا ریاست ایک مرکزی قوت سے مراٹھا سرداروں کے ایک وفاق میں بدل گئی جس کے تحت پیشوا نے مراٹھا ریاست کو اہم مراٹھا سرداروں میں تقسیم کر دیا تھا اور نیم آزاد ہو کر اپنی سیاسی و فوجی سرگرمیاں انجام دیتے تھے اور مراٹھا راجہ چھترپتی کو سالانہ پیشکش دیتے تھے۔

مراٹھا چھترپتی اور پیشوا:

بالاجی وشوناتھ (1720۔1773ء) پہلا پیشوا تھا جس نے اس عہدے کو خود مختار اور موروثی بنا دیا تھا۔ 1713ء میں پیشوا بن کر اس نے ساہو کی ریاست کو مضبوط بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ وہ تقریباً سارے مراٹھا سرداروں کی وفاداری ساہو کی طرف کرنے میں کامیاب رہا۔ اسی طرح اس نے اپنی فوجی مہم سے مراٹھا سرحد کی توسیع کی۔ مراٹھا ریاست کے لیے اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس نے مغل دربار سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت نہ صرف مغل شہنشاہ فرخ سیر نے مراٹھا لیاقت کو تسلیم کر لیا بلکہ چوتھ اور سردیش مکھی

دینے کا بھی وعدہ کر لیا۔ پیشوا کے ان کارناموں سے چھترپتی اور مراٹھا ریاست کا مرتبہ بلند ہونے ساتھ ساتھ خود پشوا کا مقام کافی بلند ہوا اس کے بعد اس کے بیٹے کی پیشوا بننے کی راہ ہموار ہوئی۔

بالاجی وشوناتھ کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ (1720- 1740) بیس سال کی عمر میں پیشوا مقرر ہوا۔ اور ایک ماہر جنگ جو تھا۔ اس کے دور میں مراٹھا طاقت اور حکومت کو زیادہ عروج حاصل ہوا۔ جنوبی ہندوستان میں سدّھی نوابوں کو ہرانے کے بعد 1739ء میں پرتگالیوں سے بسین اور سالیٹ اور نظام الملک سے مولوہ اور نبدیل کھنڈ جیتنے میں کامیاب رہا۔ ایک اور قابل ذکر چیز جو باجی راؤ کے دور میں ہوئی وہ مراٹھا ریاست کا وفاقی حکومت میں تندیل ہونا تھا۔ باجی راؤ نے پندوستان میں ہندو پر بادشاہی قائم کرنے کا نعرہ بلند کیا تھا اسے اس منصوبے میں کافی حد تک کامیابی ہوئی، جب باجی راؤ نے شمال میں دہلی کی طرف توسیع سلطنت کا ارادہ کیا تو سیناپتی ترمبک راؤ سے اختلاف ہو گئے۔ ترمبک راؤ نے نظام الملک سے ربط قائم کیا۔ باجی راؤ نے نظام الملک اور ترمبک راؤ کو 1731ء میں شکست دے دی اور نظام الملک کو باجی راؤ سے معاہدہ کرنا پڑا۔ اس کے بعد باجی راؤ نے جے سنگھ سے دوستی کر کے 1737ء میں دہلی پر فوج کشی کر دی مغل شہنشاہ نے نظام الملک کو مدد کے لیے بلایا۔ باجی راؤ نے اس جنگ میں مغل فوج کو بھی شکست دے دی۔ محمد شاہ کو معاہدہ کرنا پڑا اور نرمدا اور چمبل کے درمیان کا علاقہ مراٹھوں کو دینا پڑا۔ پچاس لاکھ روپے تاوان جنگ کے طور باجی راؤ کو ادا کیا۔ 1740ء میں پیشوا باجی راؤ کا انتقال ہو گیا۔

1740ء میں باجی راؤ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا پیشوا بالاجی باجی راؤ (1740-1761) پیشوا بنا اس نے باجی راؤ کی پالیسی کو جاری تو رکھا مگر بالاجی باجی راؤ میں اپنے والد کی صلاحیتیں مفقود تھیں۔ بالاجی باجی راؤ ن میسور، کرناٹک اور بیجاپور کے کچھ علاقے جیتے۔ 1757ء میں بالاجی نے ملہار راؤ ہولکر اور رگھوناتھ راؤ کی سرکردگی میں دہلی کی فتح کے لیے فوج بھیجی۔ رگھوناتھ راؤ نے پہلے تیمور شاہ سے پنجاب چھین لیا اس وقت تک احمد شاہ ابدالی کو مراٹھوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر پہنچ چکی تھی۔ مراٹھا دہلی پہنچ گئے تھے مگر 1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا تا کہ وہ پنجاب کو مراٹھوں سے دوبارہ حاصل کرلے اور مغل سلطنت کو مراٹھوں سے بچا سکے۔ 1761ء میں پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی جس میں مراٹھوں کی شکست ہوئی جس کے صدمے سے بالاجی باجی راؤ نکل نہیں پایا اور اس طرح مراٹھوں کی بڑھتی رفتار بھی رک گئی۔ مورخین نے مراٹھوں کی ناکامی کے اسباب بیان کیے ہیں ان کے خیال میں مراٹھوں کی شکست کی اصل وجہ یہ تھی کہ بالاجی باجی راؤ کے زمانے میں گوریلا کے طریقوں کو خیرباد کہہ دیا تھا اور میدان جنگ میں مقابلہ ہونے لگا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مراٹھوں کی فوج میں زیادہ تر عارضی سپاہی ہوتے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ہندو حکمرانوں نے مراٹھوں کے بجائے مغل سلطنت کا ساتھ دیا۔

مراٹھا سردار:

مراٹھا وفاق کی بنیاد دراصل مراٹھا سرداروں پر تھی جو چھترپتی اور پیشوا کے زیر سرپرستی پورے ہندوستان کو قابو میں کرنے میں لگے ہوئے تھے اور سامنے آنے والی ہر ریاست پر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم حملہ آور ہو کر چوتھے اور سردیش مکھی کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ان سرداروں یا خاندان میں چار بہت اہم تھے۔ (1) ناگپور میں بھونسلے (2) اندور میں ہولکر (3) بڑودہ میں گائیکواڑ (4) اور گوالیار میں سندھیا،

پیشوا کے کمزور ہونے سے مذکورہ چاروں خاندان کا زور بڑھا اور یہ نیم خود مختار ہو کر مرکزی و شمالی ہندوستان کی ریاست جیسے حیدرآباد، بنگال، اودھ، میسور اور روہیل کھنڈ وغیرہ پر حملہ آور ہو کر ان سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول رہے تھے کچھ مراٹھا سردار مغل شہنشاہ کی جانشینی میں دخل اندازی کر رہے تھے۔

مراٹھا نظام حکومت:

شیواجی نے ایک مرکزی نظام حکومت بھی قائم کیا تھا۔ آٹھ وزراء کی جماعت حکومت کے معاملات میں اس کی مدد کرتی تھی وزراء کی یہ جماعت اشتاپردھان (Ashtapardhan) کہلاتی تھی۔

- پیشوا — معاشی اور 1 عمومی انتظام کا ذمہ دار یعنی چیف منسٹر
- مجمدار — خراج کا ذمہ دار یعنی وزیر مالیات
- سوماننتا، دبیر — یعنی وزیر خارجہ/سکریٹری
- سیناپتی یا سہ نو باتھ — فوجی کمانڈر/سپہ سالار
- نیایادھیش — قاضی منصف/چیف جسٹس
- سیچیو یا شر نویس — وزیر مراسلات/خط و کتابت کا نگراں
- پنڈت راؤ — مذہبی امور کا ذمہ دار/اوقاف کے محکمے کا ذمہ دار
- واقعہ نویس/درباری مورخ، وزیر داخلہ

مذکورہ وزراء کی مدد سے شیواجی حکومت کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ اس نظام میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ پیشوا خود مختار ہو گیا اور مراٹھا ریاست ایک مرکزی حکومت سے ایک وفاق میں تبدیل ہو گئی جس میں مختلف سردار اپنے حیطۂ اختیار میں حکومت کرتے تھے۔

15.4.2 سکھ (Sikhs)

سکھ بغاوت کو رجعت پسند مورخین نے جان بوجھ کر مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی ہے جب کہ سکھوں کی بغاوت میں سیاسی اور معاشی حالات کو دخل تھا۔ پروفیسر عرفان حبیب کے نزدیک سکھ، جاٹ اور مراٹھا کی بغاوتوں میں طبقاتی کشمکش کا عنصر تھا۔ 1707ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد گرو گوبند نے جانشینی کی جنگ میں شہزادے معظم کا ساتھ دیا اور جب وہ بہادر شاہ اول کے لقب سے شہنشاہ بنا تو گرو گوبند سنگھ مغل دربار میں منصب دار مقرر کیے گئے جب وہ بہادر شاہ کے ساتھ دکن کی طرف کوچ کر رہے تھے تو ایک پٹھان نے 1708ء میں انہیں قتل کر دیا، گرو گوبند سنگھ کی ذاتی ملکیت کے وارث ان کے متبنیٰ بیٹے اجیت سنگھ ہوئے۔ گرو گوبند سنگھ کے انتقال کے بعد سکھ قوم میں پھوٹ پڑ گئی۔ سکھ سردار اپنی جاگیریں بنانے میں مصروف ہو گئے۔ گرو گووند سنگھ کے شاگرد بندا بہادر نے اعلان کیا کہ وہ ہی گرو گوبند سنگھ ہیں۔ تمام سکھ اس کے ساتھ ہو گئے بندا بہادر نے پہلے سونی پت کے فوجدار کو ہرایا پھر سہ ہند کے فوجدار کو شکست دی اور بہت سے شہروں پر قبضہ کیا۔ بندا بہادر نے جالندھر میں سلطان پور اور اتر پردیش میں سہارن پور پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔

بہادر شاہ اول جب دکن سے واپس آئے تو انہوں نے شاہی فوج کو سکھوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ابھیجا شاہی فوج نے سکھوں کے قلعے سرہند، سدھورا اور لوہ گڑھ پر قبضہ کرلیا لیکن سکھوں نے جنگ جاری رکھی۔ خرج سیر کے زمانے میں راجپوتوں کی مدد سے سکھوں کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔ بندا بہادر کو سزائے موت دی گئی۔ اس کے بعد کپور سنگھ عرف حسا سنگھ نے 1764ء میں دوبارہ جدوجہد جاری کی۔ فوجی تنظیم کا نام خالصہ رکھا لیکن بندا بہادر کے بعد سکھ کافی عرصے کے لیے خاموش ہو گئے۔

15.4.3 جاٹ (Jats)

جاٹ قوم کے لوگ زراعت پیشہ تھے۔ یہ لوگ پنجاب، ہریانہ، مغربی اتر پردیش، راجستھان، گوالیار میں رہائش پذیر تھے۔ یہ بہت بہادر اور سخت جان تھے۔ جاٹ اور مغلوں کا جھگڑا اورنگ زیب کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ 1669ء میں جاٹوں کے لیڈر گوکل جاٹ نے عبدالغنی کو قتل کردیا تھا۔ اورنگ زیب کی شاہی فوج نے گوکل جاٹ کی بغاوت کو کچل دیا۔ راجہ رام کی بغاوت کو 1688ء میں اورنگ زیب نے کچل دیا۔ بعد چوڑامن جاٹ لیڈر بنا اس نے اورنگ زیب کی دکن مہم سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو بڑھالیا وہ 1707ء سے 1713ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی طاقت کو بڑھاتا رہا، فرخ سیر نے اس کی سرکوبی کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ جب چوڑامن نے سرکشی کی تو اس کی تو اس کی سرکوبی کے لیے سوائی جسے سنگھ کو شاہی فوج لے کر بھیجا یہ جنگ 1716ء سے شروع ہو کر 1718ء تک چلی آخر کار چوڑامن کو شکست ہوئی اور معاہدہ امن کے ساتھ 50 لاکھ روپے تاوان کے طور پر دینا پڑا۔

محمد شاہ کے زمانے میں سوائی جسے سنگھ نے چوڑامن کے بھتیجے بدن سنگھ کو اپنے ساتھ ملا کر چوڑامن کی طاقت کو مکمل طور پر ختم کردیا۔ اس نے خودکشی کرلی۔ جاٹوں میں لوٹ مار اور ڈکیتی کا رجحان عام ہو گیا تھا۔ بدن سنگھ نے انہیں باقاعدہ طور پر منظم کیا۔ انہیں زراعت کا پیشہ اور فوجی پیشہ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ بھرت پور کی قلعہ بندی، لڑائی 1752ء میں مغلیہ حکومت نے اسے بھرت پور کا راجہ تسلیم کرلیا اس کے بیٹے سورج مل جاٹ نے اپنی حکومت کو مراٹھوں اور افغانوں سے محفوظ رکھا اور اس طرح جاٹوں کی ایک خود مختار ریاست تشکیل پا گئی۔

15.4.4 روہیل کھنڈ (Rohilkhand)

روہیل کھنڈ ریاست کی بنیاد اور اس کے بانی نواب علی محمد کا عروج ہندوستان کی تاریخ میں ایک بہت دلچسپ باب ہے۔ روہیل کھنڈ کا پرانا نام کٹیہسر تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں اس علاقے میں پٹھانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک پٹھان داؤد خان مغلیہ فوج میں ملازم تھے۔ مراٹھوں کے خلاد داؤد خاں نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی بہادری کے انعام میں اسے بدایوں کا علاقہ دے دیا تھا۔ دائود خاں کے قتل کے بعد اس کی متبنی بیٹا علی محمد اس کی جاگیر کا جانشین بنا۔ علی محمد خاں نے فتوحات کرکے اس جاگیر میں آنولہ کا اضافہ کیا اور مغل وزیر سے نوابی کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے کٹیہسر، شاہ آباد، مراد باد، سنبھل اور بریلی کے علاقے فتح کیے اسی کا نام روہیل کھنڈ رکھا گیا۔ نواب علی محمد خان کے انتقال کے بعد حافظ رحمت خان نے روہیل کھنڈ کی حفاظت کی مگر شجاع الدولہ کی سیاست کی وجہ سے اس صوبے کی تقسیم ہوئی اور بعد کو یہ صوبہ بھی انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا۔

15.5 آزاد ریاستیں (Independent States)

مغل سلطنت کے زوال کے وقت کچھ ایسی ریاستیں بھی قائم ہوئیں جو نہ تو مغل سلطنت کی جانشین تھیں اور نہ باغی بلکہ حالات کی نزاکت کے باعث ان ریاستوں کا خود وجود ہوا۔ ان ریاستوں میں میسور، کیرلا، (ٹراونکور) اور راجپوت ریاستیں سب سے اہم تھیں۔

15.5.1 میسور (Mysore)

میسور موجودہ ریاست کرناٹک کا ایک شہر ہے جو 18 ویں صدی میں ایک نہایت طاقت ور اور اہم ریاست تھی۔ میسور اصل میں وجے نگر کی ہندو مملکت کا ایک حصہ تھا جو وجے نگر سے 1565ء کی جنگ کے بعد اوڈیار سلطنت کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک راجا نندراج کے تحت خود مختار بن گیا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد ایک دوسرے سردار نے اپنی ذہانت اور بہادری سے نندراج کو ہٹا کر خود راجہ بن گیا۔ یہ سردار حیدر علی تھا جس نے نہ صرف میسور کی سرحد میں توسیع کی بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم ریاست بھی قائم کی۔

حیدر علی اور میسور:

حیدر علی نندراج کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے داخل ہوا تا اس کی بہادری اور عقل مندی کی وجہ سے نندراج نے اسے 500 سپاہیوں کا کمانڈر مقرر کر دیا تھا۔ 14 اگست 1754ء کو نندراج کے مقابلے محمد علی کی مدد کے لیے انگریز اور تجنور کی جو فوجیں اکٹھا ہوئیں حیدر علی نے ان پر حملہ کر کے شکست دی اس کامیابی سے خوش ہو کر نندراج نے حیدر علی کو ڈنڈی گل کے علاقے کا دیوان مقرر کر دیا۔ ڈنڈی گل کے پولیگار قبیلے نے نندراج کے خلاف بغاوت کر دی اور لگان دینے سے انکار کر دیا۔ حیدر علی نے پولیگاروں پر حملہ کر دیا اور انہیں شکست دے دی۔ ان کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

1758ء کے بعد میسور کے راجہ اور وزیر نندراج میں اختلاف ہو گیا حیدر علی نے دونوں کے بیچ صلح کرائی اسی طرح نندراج اور اس کے بھائی دیوراج میں اختلاف ہو گیا تھا ان کے بیچ بھی حیدر علی نے صلح کرائی۔ اس کارکردگی کی وجہ سے میسور سلطنت کا پورا انتظام حیدر علی کے ہاتھ میں آ گیا۔ حیدر علی نے اپنی عقل مندی اور سیاسی بصیرت انتظام سلطنت کو ٹھیک کیا۔ 1780ء میں حیدر علی کو انگریزوں سے جنگ لڑنی پڑی اس میں حیدر علی نے انگریزوں کو کئی مورچوں پر لہرایا۔ حیدر علی کا انتقال ہو گیا۔ حیدر علی نے مختصر سے وقت میں کورگ، مالا بار، بلاری، گوٹی اور چوڑاپہ جیسے اہم علاقے جیت کر اپنی قلمرو میں شامل کیے۔ اس کے اہم اور قابل ذکر کارناموں میں انگریزوں سے نبرد آزمائی اور جدید طرز کی حکومت کا قیام ہے۔

ٹیپو سلطان اور میسور:

1782 میں اپنے والد حیدر علی کے انتقال کے بعد ٹیپو نے ریاست کی ذمہ داری سنبھالی حالانکہ وہ نو عمری ہی سے اپنے والد کے ساتھ فوجی مہم میں ساتھ رہا، ٹیپو سلطان نے ریاست کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ہی انگریزوں سے جم کر مقابلہ کیا۔ ٹیپو نے جب حکومت کی

باگ ڈور سنبھالی تو اس وقت اس کی ریاست انگریزوں سے برسرپیکار تھی جس کو اس نے جاری رکھا اور 1784ء میں ایک معاہدہ کے تحت باعزت طریقے سے جنگ بندی ہوئی۔ مدارس کے گورنر میکارتنی نے مارچ 1784ء منگلور میں ٹیپو سلطان سے معاہدہ کیا جس میں انگریزوں کو ٹیپو سلطان کی شرطیں منظور کرنی پڑیں۔

ٹیپو سلطان کا ایک اہم فیصلہ وڈیار خاندان کے برائے نام بادشاہت کو ختم کر کے ایک سلطنت کا قیام ہے۔ اسی کے ساتھ ٹیپو سلطان نے نظام ٹیکس، فوج اور دیگر انتظامی امور میں اہم تبدیلیاں کیں اور اپنی بگڑتی ہوئی معیشت کو سنبھالتے ہوئے انگریزوں اور جنوبی ہندوستان کی دیگر ریاستوں جیسے مراٹھا اور نظام حیدر آباد سے مزاحمت جاری رکھی آخر کار انگریزوں سے لڑتے ہوئے چوتھی اینگلو میسور جنگ میں 1799ء کو شہید ہو گیا۔

پروفیسر محب الحسن کے مطابق ''انتظام سلطنت'' مذہبی رواداری اور بہادری کا ثبوت نے انصاف و عدل کی تصویر پیش کی۔ محب الحسن کے مطابق ''ٹیپو سلطان کے زمانے میں میسور معاشی طور پر بے حد خوشحال تھا، زراعت کے ساتھ وہاں صنعتی ترقی بھی ہوئی تھی۔ ٹیپو کی قابل قدر خدمات میں سب سے اہم یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کے حکمرانوں کو ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے متحد کر کے برطانوی سامراج کو ختم کرنا چاہا تھا مگر اس کا ساتھ کسی نے نہیں دیا۔ اس لحاظ سے اگر ٹیپو سلطان کو جنگ آزادی کا پہلا شہید کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔

میسور اور انگریز :

میسور واحد ریاست تھی جس نے انگریزوں سے دوستی نہیں کی۔ انگریز بھی میسور کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے، دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ میسور اور انگریزوں کے درمیان اقتدار کو لے کر چار جنگیں ہوئیں جو حسب ذیل ہیں۔

پہلی اینگلو میسور جنگ (1766تا1769)

اس جنگ کی ابتداء ریاست کرناٹک میں انگریز اور میسور کے درمیان ایک تنازعہ کو لے کر ہوئی۔ انگریزوں نے مراٹھا اور نظام حیدرآباد کا ساتھ لیا مگر حیدر علی نے ان میں پھوٹ ڈال کر اور مراٹھا و نظام سے مال غنیمت کا وعدہ کر کے اپنی طرف ملا لیا پھر مدارس پر حملہ کر کے انگریزوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا دونوں کے بیچ معاہدہ مدارس (1769) ہوا جس میں ایک دوسرے سے جیتے ہوئے علاقے واپس کرنے اور مستقبل میں کسی بھی حملہ آور کے خلاف ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا گیا۔

دوسری اینگلو میسور جنگ (1780تا1784)

اس جنگ کی اصل وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے معاہدۂ مدارس کی خلاف ورزی کی۔ 1771ء میں مراٹھوں نے میسور پر حملہ کیا مگر معاہدہ مدارس کے باوجود انگریز میسور کی مدد کو نہیں آئے، جس سے میسور نے انگریزوں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا اور جب انگریزوں نے ''ماہے'' پر جو کہ میسور کا حصہ تھا قبضہ کرنے کی کوشش کی تو دونوں کے بیچ جنگ چھڑ گئی اس جنگ میں حیدر علی انگریزوں کو شکست دینے والا

ہی تھا کہ اس کی وفات ہو گئی جس کے بعد ٹیپو سلطان نے کچھ دنوں تک جنگ کو جاری رکھا پھر یہ جنگ معاہدہ منگلور (1784ء) کے بعد ختم ہو گئی۔

تیسری اینگلو میسور جنگ (1790تا1792ء)

دو جنگوں اور دو معاہدوں کے بعد دونوں فریق ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانی اور گروہ بندی میں لگے ہوئے تھے۔ ٹیپو سلطان کے فرانس اور ترکی سے مدد کی کوشش اور کیرلا میں دونوں فریق کے مفادات کا ٹکراؤ اس جنگ کی اہم وجہ تھی۔ سابق جنگوں کی طرح ابتداء میں ٹیپو سلطان انگریزوں پر حاوی تھا اور ان کے ایک کمانڈر جنرل میڈو کو ہرا بھی چکا تھا۔ مگر تبھی گورنر جنرل کارنواس ن خود کمان ہاتھ میں لی اور کمک فراہم کرنے لگا جس سے انگریزوں کا حوصلہ بند ہو گیا۔ 1790ء میں کارنوالس نے میسور پر حملہ کر دیا دو سال تک جنگ جاری رہی ٹیپو نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر شکست ہوئی۔ 1792ء میں ٹیپو اور انگریزوں میں معاہدہ سری رنگا پٹنم ہو گیا جس کے تحت میسور کی تقریباً نصف سلطنت انگریزوں کے حوالے کرنی پڑی۔ تیس لاکھ پونڈ جنگ کا ہرجانہ ادا کیا اور دو بیٹوں کو ضمانت کے طور پر کارنوالس کے حوالہ کیا۔

چوتھی اینگلو میسور جنگ (1799ء)

تیسری جنگ میں ہارنے کے بعد بھی ٹیپو سلطان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ اس نے اپنی معاشی حالت درست کرنے کی کوشش کی۔ 1799ء میں لارڈ ویلزلی نے ٹیپو سلطان کے سامنے امدادی صلح کرنے کی تجویز رکھی۔ ٹیپو سلطان نے انکار کر دیا۔ ویلزلی نے اپنے بھائی ارتھر ویلزلی کی سرکردگی میں انگریزی فوجیں ٹیپو کی ریاست پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیں اس جنگ میں ٹیپو کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹیپو نے سرنگا پٹنم کے قلعہ میں پناہ لی۔ انگریزوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک بار پھر ٹیپو کے سامنے انگریزوں نے اپنی شرائط رکھیں اور صوبے کا نصف حصہ مانگا اور ساتھ ہی 20 لاکھ پونڈ کی بھی مانگ کی۔ ٹیپو سلطان راضی نہیں ہوا۔ آخر کار انگریزوں نے ٹیپو کے وزیر پورنیا کے ساتھ سازش کر کے ٹیپو کے سیناپتی قمر الدین خاں اور دیوان میر صادق نے بھی غداری کی اور انگریزوں سے مل گئے۔ ان لوگوں کی سازش سے انگریز قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ٹیپو سلطان آخری جنگ ہوئی اور ٹیپو اس جنگ میں 1799ء میں مارا گیا۔ اس جنگ میں مراٹھا اور نظام نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔

ریاست میسور کا نظم و نسق:

میسور ریاست 18ویں صدی کی ان چند ریاستوں میں سے تھی جس کی تعمیر و تشکیل جدید طرز پر ہو رہی تھی۔ حیدر علی اور اس کے بعد ٹیپو سلطان نے اس ریاست کی تشکیل و تعمیر میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس ریاست کے نظم و نسق، فوجی تنظیم اور مال گزاری کا طریقہ عام روایت سے ہٹ کر جدید طرز کا تھا۔

فوجی نظام:

مسیور ایک فوجی ریاست تھی جس کو اپنی بقاء و تحفظ کے لیے مضبوط و مستحکم فوج کی ضرورت تھی کیونکہ میسور کو نہ صرف اپنے علاقائی زمین داروں (poligars) کو قابو میں رکھنا تھا بلکہ ارد گرد کی تقریباً سبھی حریف ریاستوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ اس لیے حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے جدید فوجی نظام کے طرز پر اپنے سپاہیوں کو نقد تنخواہ دینے کا فیصلہ کیا تاکہ فوج معاشی طور پر مطمئن ہو کر فوجی خدمات بحسن وخوبی انجام دے سکے اور فوج کی بھرتی میں زمین داروں کے منفی اثرات سے بچا جا سکے۔ ٹیپو نے فوج کو مزید منظم اور بااثر بنانے کے لیے اور سپاہیوں کی تربیت کے لیے فرانسیسی کمانڈوروں کی تقرری کی۔ ٹیپو نے فوج کو جدید اسلحہ، گولہ بارود بھی فراہم کیا تاکہ اس کی فوج انگریزوں سے مقابلہ کر سکے۔

معاشی نظام:

حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ایک مستحکم معاشی نظام کی بھی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف ریاست کی عوام خوش حال تھی اور فوج کے اخراجات بھی بآسانی پورے ہو رہے تھے۔ میسور کا معاشی نظام دراصل کسانوں اور تاجروں سے ملنے والے ٹیکس پر قائم تھا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے کسانوں اور تاجروں کے لیے بہتر نظام بنانے کی کوشش کی اور انہیں ہر ممکن سہولیات فراہم کیں۔ چنانچہ زرعی زمین کو ان کی نوعیت کے لحاظ سے کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا اور اسی حساب سے مال گزاری یعین خراج طے کیا گیا۔ اجارہ زمینیں ایک مقررہ ٹیکس کے عوض کرائے پر دی جاتی تھیں۔ زمیوں کی جانچ ہوتی تھی، کسانوں کو ضرورت کے وقت رعایت بھی دی جاتی تھی، باقی ریاستوں کی طرح ٹیکس وصولنے کی ذمہ داری جاگیرداروں یا درمیان طبقوں کو نہیں دی گئی بلکہ اس کے لیے سرکاری افسر مقرر کیے گئے۔

حیدر علی اور ٹیپوسلطان نے تجارت کے فروغ کے لیے بھی بہت سے اقدام کیے تاکہ تاجروں کے ساتھ ہی ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ اندرونی تجارت کو فروغ دینے کے ساتھ ہی بیرونی تجارت پر بھی دھیان دیا گیا تاکہ اشیاء اور مصنوعات کی اچھی قیمت مل سکے اور تاجروں کی آمدنی زیادہ ہو جگہ جگہ تجارتی مراکز قائم کیے گئے جہاں تربیت یافتہ سرکاری افسران خود تجارت کرتے تھے جس میں عوام کو بھی اپنا پیسہ لگانے کی آزادی تھی اور اس میں ان کو 35 فیصد منافع دیا جاتا تھا۔ ان اقدامات سے ریاست کی معاشی حالت بہت بہتر ہو گئی۔

15.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

18 ویں صدی ہندوستان کے لیے علاقائی ریاستوں کے عروج کا عہد تھا۔ مغل سلطنت کے زوال اور مراٹھا طاقت کے عروج و زوال کے بعد کئی علاقائی ریاستیں وجود میں آئیں جن میں بنگال، حیدرآباد، اودھ، مراٹھا، سکھ، جاٹ، روہیل کھنڈ، میسور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بنگال، حیدرآباد اور اودھ یہ جانشین ریاستیں تھیں اور مراٹھا، سکھ جاٹ اور روہیل کھنڈ نئی یا باغی ریاستیں تھیں میسور کو ہم آزاد ریاست میں رکھ سکتے ہیں۔ ان کا تفصیلی تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔

15.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

خدوخال	:	ظاہری صورت یا شکل
دستک	:	درآمد برآمد کا لائسنس
اودھ	:	موجودہ یوپی کا مشرقی حصہ اور بہار کا شمالی حصہ

15.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغل سلطنت کی بنیاد کس نے ڈالی؟
2. کس کے عہد حکومت سے اس کے زوال کی شروعات ہوئی؟
3. مغل سلطنت کے بعد ابھرنے والی ریاستوں کو کتنی قسموں میں درجہ بند کر سکتے ہیں؟
4. شہر آشوب کس کی تصنیف ہے؟
5. کن دو مورخین نے زوال سے متعلق الگ نظریہ پیش کیا؟
6. بنگال ریاست کی بنیاد کس نے ڈالی؟
7. بنگال کا آخری آزاد حکمراں کون تھا جو پلاسی کی جنگ میں مارا گیا؟
8. پلاسی کی جنگ کب ہوئی؟
9. بکسر کی جنگ کس کے درمیان ہوئی؟
10. اودھ کے پہلے نواب کون تھے؟

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جانشین ریاست بنگال، حیدرآباد اور اودھ پر مختصر نوٹ تحریر کریں۔
2. علی وردی خاں کی شخصیت اور سیاسی بصیرت پر روشنی ڈالیے۔
3. مراٹھوں کو طاقتور بنانے کے لیے باجی راؤ کی کوششوں کو بیان کریں۔
4. حیدر علی نے میسور ریاست کو مضبوط کرنے کے لیے کیا اقدام کیے۔
5. تیسری اینگلو میسور جنگ کن کن کے بیچ لڑی گئی اور اس کے نتائج کیا رہے۔

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اودھ ریاست کے عروج اور ارتقا پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. مراٹھا ریاست کے عروج اور ارتقا پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. میسور ریاست کے عروج اور ارتقا پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

15.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Brittlebank, Kate, *Tiger* : *The Life of Tipu Sultan*, Juggernaut, New Delhi, 2016.
2. Grover, B.L., and Mehta, Alka, *A New Look on Modern Indian History*: *From 1707 to the Modern Times*, S. Chand and Co. Ltd., New Delhi, 2015.
3. Habib, Irfan ed., *State and Diplomacy under Tipu Sultan*: *Documents and Essays*, Indian History Congress and Tulika, New Delhi, 2001.
4. Hasan, Mohibbul, *History of Tipu Sultan*, Aakar Books, Delhi, 2006 (first pub. 1951).
5. Majumdar, R.C., H. Raychaudhuri, and K. Datta, *An Advanced History of India*, St. Martin's Press, MacMillan, New York, 1967.
6. Shaik Ali, B., *Tipu Sultan*, National Book Trust, India, 1972.

اکائی 16۔ ہندوستان میں اٹھارہویں صدی: ایک مباحثہ

(Eighteenth Century India: A Debate)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 اٹھارہویں صدی کے مخصوص اوصاف

16.3 اٹھارہویں صدی پر بحث کی نوعیت

16.4 بحث کا پس منظر

16.5 اٹھارہویں صدی پر بحث

16.6 اکتسابی نتائج

16.7 کلیدی الفاظ

16.8 نمونہ امتحانی سوالات

16.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

16.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

16.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

16.0 تمہید (Introduction)

ہندوستانی باشندوں کے لیے اٹھارویں صدی مروجہ روایات واقدار کے زوال کا عہد تھا۔تاریخ میں مغل سلطنت کبھی بھی اتنی کمزور اور غیر محفوظ نظر نہیں آئی جتنی کہ اس وقت ہو چکی تھی۔نادر شاہ افغان 1739 اور مراٹھوں کے حملوں نے اسے بے حد کمزور کر دیا تھا۔اس کے متعدد قلعوں پر افغان، مراٹھوں اور سکھ جنگجوؤں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مغل سلطنت کے منصب دار آپسی گروہ بندی اور ذاتی اقتدار کی ہوس میں اس قدر مصروف تھے کہ وہ سلطنت کی بقا کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔ سلطنت کے مالی ذرائع تقریباً سوکھ چکے تھے اور انتظامی

افسران بدعنوانی اور اور ذاتی مفادات کو پورا کرنے میں مصروف تھے۔ سیاسی اور مالی استحکام کے زوال کے ساتھ ساتھ مغل سلطنت کے لیے یہ بے حد شرمندگی کا باعث تھا کہ اس کے دو حکمرانوں احمد شاہ(1748۔1754)اور شاہ عالم دوم(1759۔1816)کو اندھا کر دیا گیا تھاجب کہ عالمگیر ثانی(1754۔1759)کو درباری گروہ بندی کا شکار بنا کر قتل کر دیا گیا تھا۔ جس تیزی سے یہ سب ہوا وہ حیرت انگیز تھا۔ 1700 میں اورنگزیب کے عہد حکومت میں مغل سلطنت علاقائی وسعت میں انتہائی عروج پر تھی۔ 1730آتے آتے یہ متعدد سیاسی اکائیوں میں بٹ چکی تھی۔ان میں سے کچھ جیسے ،اودھ، بنگال اور حیدرآباد 'جانشین حکومتوں کے طور پر ابھرے،جب کہ دوسرے جیسے مراٹھے اور جاٹ مستقل مغل سلطنت کی دشمنی اور پر تشدد مزاحمت کی بنیاد پر ابھرے۔آئندہ تیس سالوں میں ہندوستان کی سیاسی قسمت واضح طور پر ایک مختلف سمت میں آگے بڑھ رہا تھی۔ایک یورپی طاقت، برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی، مشرقی ہندوستان کے زیادہ تر حصے کو فتح کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور اس نے برصغیر کے دیگر حصوں میں حالات پر فیصلہ کن اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ان کامیاب سیاسی منصوبوں کی بنیاد پر کمپنی دھیرے دھیرے ہی سہی لیکن مضبوطی کے ساتھ ابتدائی نوآبادیاتی نظام کی راہ ہموار کر رہی تھی۔ان تمام تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کہ اس وقت کے لوگ یہ سوچنے لگے کہ ان کی دنیا الٹ پلٹ ہو رہی ہے۔

ان تبدیلیوں کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے جدید مورخین اٹھارہویں صدی کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے اور دھیرے دھیرے ان کے درمیان یہ ایک پر جوش موضوع بحث بن گئی۔اس کی وجہ سے اس صدی کی تاریخ نویسی میں بہت کچھ اہم پیش رفت دیکھنے میں آئی ایک طرف صرف جہاں کئی پہلوؤں کی وضاحت میں اختلافات ہیں وہیں دوسری طرف کئی پہلوؤں پر واضح طور پر اتفاق بھی ہے۔پرانی تشریح کہ مغل سلطنت کا زوال اورنگ زیب کے مذہبی تعصب کی وجہ سے ہوا،اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا گیا ہے۔جہاں اورنگ زیب کو مراٹھوں، جاٹوں اور کچھ راجپوت قبیلوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا،وہیں وہ مسلم امرا اور منصبداروں سے بھی یکساں طور پر پریشان تھا جو آخر کار مغل دربار میں گروہ بندی اور سازشی ماحول کو بڑھانے میں کامیاب رہے۔دوسری طرف کئی طاقتور راجپوت حکمراں خاندان، سلطنت کے وفادار رہے۔

اس سے پہلے کے اس دقیانوسی تصور کو بھی مسترد کر دیا گیا کہ یہ اخلاقی تنزلی اور ثقافتی زوال کی صدی تھی۔اب علاقائی ریاستوں کی متحرک ثقافتی زندگی کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے جن میں سے بہت سی اعلیٰ مغل ثقافت کی وارث تھی اور ان روایتوں کو انہوں نے علاقائی سطح پر متعارف کرایا۔ لکھنؤ اور حیدرآباد ادبی اور ثقافتی سرپرستی کے مراکز کے طور پر ابھرے تھے اور اس طرح تہذیبی ملن کی مثال بنتے جا رہے تھے۔ اٹھارویں صدی کا بنارس شمالی ہندوستان میں مذہبی تعلیم اور مذہبی زیارت کے مرکز کے طور پر اپنی منفرد حیثیت کے ساتھ تجارت اور بینکاری کے ایک عظیم مرکز کے طور پر ابھرا۔ بنگال میں نادیہ، سنسکرت تو دیا بھاگ ہندو قانون سیکھنے کا مرکز تھا اور بشنوپور وہ جگہ بن گئی جہاں وسیع علاقائی تعمیری اور موسیقی طرز پروان چڑھے۔ جنوب میں مراٹھا حکمرانوں کی سرپرستی میں تنجور، مذہب، موسیقی اور رقص کے شعبوں کی ترقی کا ایک اہم مرکز بن گیا۔اس طرح مورخین اب سلطنت کے زوال اور اس کے بعد ہونے والے حالات کو مذہبی تعصب یا کچھ حکمرانوں کی کمزوری کے نتیجہ کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ ایک مسلسل تعمیری کمزوری(continuous structural weakness)

کی طرح دیکھتے ہیں۔ لیکن اس تعمیری اور ساختیاتی کمزوری کے اسباب اور نوعیت کے بارے میں شدید اختلافات اور متعدد نظریات ہیں۔ کچھ لوگ اسے معاشی بحران کا نتیجہ سمجھتے ہیں جو حد سے زیادہ استحصال کرنے والے طبقے کی وجہ سے ہوا۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو پورے عمل کو معاشی ترقی کے ایک طویل مدتی عمل کے طور پر دیکھتے ہیں جس سے مقامی احیا کو تقویت ملی۔ ریاست اور سماج کے درمیان بدلتے ہوئے تعلقات کی بھی مختلف تشریحات، ہیں۔ معاشی ترقی کی فطرت و عوامل کیا تھے ؟ اور سلطنت اور معاشی ترقی سے ہونے والے ثمرات کی تقسیم سے متعلق جھگڑے کے نتائج کیا ہوئے۔ حالانکہ اٹھارویں صدی صرف مغل سلطنت کے زوال اور علاقائی ریاستی نظام کے استحکام تک محدود نہیں تھی۔ اس صدی کے درمیان برصغیر میں اور بھی بہت سی بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ان کے بارے میں مورخین مختلف رائے رکھتے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے نہیں ملتی۔ بحث و مباحثہ کے کئی پہلو ہیں۔ پہلا ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت سے سیاست میں پیش قدمی، دوسرا کیا ہندوستان میں نو آبادیاتی رجحان پہلے سے موجود تھا یا باہر سے آکر پلا بڑھا اور تیسرا اس کے سماجی اور معاشی اثرات، ان میں تسلسل اور تبدیلی اور نئے نو آبادیاتی ڈھانچے میں ان کی اہمیت کیا تھی۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- اٹھارہویں صدی کے مخصوص اوصاف کو سمجھ سکیں گے۔
- اٹھارہویں صدی کی بحث کی نوعیت کا جائزہ لے سکیں گے۔
- اٹھارہویں صدی کے ہندوستان پر ہونے والی بحث کے پس منظر کو جان سکیں گے۔
- اٹھارہویں صدی کے ہندوستان پر ہونے والی بحث کا جائزہ لے سکیں گے۔

16.2 اٹھارہویں صدی کے مخصوص اوصاف (Significant Features of Eighteenth Century)

اٹھارویں صدی کے وسیع تر متحرک عوامل کو سمجھنے اور مختلف افکار و نظریات کے ذریعے وسیع تر پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے اس صدی کی مندرجہ ذیل اہم خصوصیات کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔

اول۔ اٹھارویں صدی نے دو تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا۔ ایک یہ کہ وسیع تر مغل سلطنت کی تقسیم کے نتیجے میں مختلف چھوٹی چھوٹی صوبائی اور علاقائی ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس تبدیلی اور مغل سلطنت کے زوال کے پیچھے کی وجہ، عظیم سلطنت کا بحران تھا۔ ایک طرف جہاں یہ علاقائی اور سماجی گروہوں کے درمیان سیاست کی از سر نو تقسیم تھی وہیں دوسری تبدیلیاں اور بھی زیادہ گہری تھی اور یہ اس صدی کے وسط میں تب رونما ہوئی جب جنگ پلاسی 1757 اور جنگ بکسر 1763 کے نتیجے کے طور پر انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی نے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ اس طرح ایک غیر ملکی تجارتی کمپنی، ہندوستان میں ایک حکمراں طاقت کے طور پر منظم ہو گئی اور اس نے اپنی سیاسی طاقت کا استعمال فوجی اور تجارتی مقاصد کے لیے کیا۔

دوم۔ مورخین نے اٹھارہویں صدی کے اثرات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے اسے ایک طویل صدی کے طور پر دیکھنے کا عمل شروع کیا ہے۔ جدید وضاحتوں کے مطابق اس صدی کے سیاسی تغیرات 1680 کی دہائی میں علاقائی بغاوتوں اور انتشار کے درمیان سامنے آنا شروع ہوئے۔اس انتشار کی گردآلود فضا 1720 کے آتے آتے علاقائی ریاستوں کے استحکام کے ساتھ ساتھ صاف ہو چکی تھی۔1750 سے کمپنی کی قیادت میں ایک نئے سیاسی منظر نامے کی ابتدا ہوتی ہے اور یہ 1820 تک جاری رہا جس دوران تقریباً تمام ہندوستانی ریاستیں انگریز کمپنی کی ماتحتی میں آگئیں یا کمپنی کی دوستی قبول کر چکی تھیں۔اس طرح اٹھارویں صدی اپنی سیاسی اہمیت کے نظریے سے سترویں صدی کی آخری دو دہائیوں اور انیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں کو بھی اپنے میں شامل کر لیتی ہے۔ معاشی نقطہ نظر سے بھی اس صدی کو 'طویل' سمجھنا فائدہ مند ہے۔اب اس بات کے ٹھوس شواہد فراہم ہیں کہ کہ نئی ریاستوں کی سیاسی تشکیل نو کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی تعمیر کا عمل بھی وقوع پذیر ہوا۔ جہاں کچھ علاقوں کا زوال ہوا وہیں کچھ دوسرے علاقے زمیندار اور تاجروں کی وجہ سے معاشی طور پر ترقی پذیر ہوئے اور اس نظریے کو کہ اس صدی کے وسط سے ہی معاشی انتشار کا عمل شروع ہو چکا تھا کے مقابلے جدید تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ کمپنی کے اقتدار میں آنے کے بعد علاقائی ریاستوں پر تجدید کاری کے دباؤ کے باوجود معاشی ترقی کا عمل کل اچانک سے ہی نہیں رک سکا تھا۔بنگال میں بھی جہاں کمپنی کی حکومت بہت مضبوط تھی تجارت اور زراعت میں ترقی آئی حالانکہ یہ تھوڑے بدلاؤ کے ساتھ ہوئی۔انیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں تک حالات ایسے ہی بنے رہے یہاں تک کہ اٹھارویں صدی کی سست رفتار ترقی بالکل ہی رک گئی۔

سوم۔ایک اہم پہلو اور بھی حال ہی میں ابھر کر سامنے آیا ہے وہ ہندوستانی معیشت کے عالمی معیشت کے ساتھ رشتوں کا جائزہ لینا ہے۔ بحر ہند، اٹلانٹک اور پیسیفک کے ساتھ مل کر ایک ایک وسیع تھا تر تجارتی نیٹ ورک کا حصہ تھا۔ابتدائی تجارتی عمل کے یورپ مرکوز ہونے نے ہندوستان کی تجارتی زندگی کی فطرت اور اس کے مستقبل پر گہرا اثر ڈالا۔اس طویل تجارتی عرصے میں ہندوستان نے ہمیشہ اشیا اور خدمات فراہم کیں، لیکن یورپی تجارت کے عالمی نظام کے زیر اثر طلب کی صورت میں ہندوستان فائدے میں تھا اور اس ذریعے سے کافی مقدار میں دولت ہندوستان آتی تھی۔اٹھارویں صدی کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے لیے یہ تبدیلیاں کافی اہم ہیں۔اگر ہم یہ دھیان رکھیں کہ ہندوستان کی مالی اور تجارتی زندگی خاص طور پر ان تعلقات پر ٹکی ہوئی تھی جو آگرہ اور دہلی کے ساتھ افریقہ، جنوبی، مشرقی ایشیا اور یورپ سے تھے تو ہم مغل دور سے مابعد مغل دور کے درمیان تسلسل اور پھر یہاں سے ابتدائی نوآبادیاتی عہد تک کے سلسلے کو باآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ابتدائی نوآبادیاتی مداخلت نے ان تعلقات کو اور مضبوط کر دیا۔اس کی ایک مثال ہمیں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ایشیائی تجارت میں آئی تبدیلیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے جب ہندوستان اور مغربی ایشیا کا تجارتی رشتہ انگریز تاجروں کی دیکھ ریکھ میں مشرق اور جنوب مشرقی ایشیا کی سمت مڑ گیا تھا۔ سترہویں صدی کے مقابلے اٹھارویں صدی میں عالمی سطح پر معاشی توسیع ہوئی اور ہندوستان کی سمندری تجارت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس لیے کوئی بھی نظریہ جو اٹھارویں صدی کو معاشی بحران کا دور مانتا ہو شبہ سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔

16.3 اٹھارہویں صدی پر بحث کی نوعیت (Nature of the Eighteenth Century Debate)

اٹھارویں صدی میں ہونے والی تبدیلیاں جس تیزی سے رونما ہوئیں، اس کے پیش نظر مختلف پہلوؤں پر الگ الگ وضاحتیں اور نظریات ہیں۔ موٹے طور پر یہ بحث اس صدی کو دو حصوں میں بانٹے جانے سے شروع ہوتی ہے اور مختلف نظریات رکھنے والے مورخین کو بھی دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ اگر ہم 1750 تک کے عہد کو لیں تو دو طرح کے نظریات سامنے آتے ہیں۔

- سلطنت مرکوز (Empire Centric)
- علاقہ مرکوز (Region Centric)

1750 کے بعد بھی ہمیں دو نظریات نظر آتے ہیں۔

- ہندوستانی نظریہ (Indian Approach)
- یورپی نظریہ (Europian Approach)

اٹھارویں صدی کے نصف اول پر بحث کرتے ہوئے کچھ مورخین مغل سلطنت اور اس کے انتظامی اداروں کی مرکزیت اور سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں ان کے کردار کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق سلطنت کے زوال کے تباہ کن نتائج پیدا ہوئے۔ اس نظریے کے علمبرداروں کی نظر میں اس کی وجہ سے ملک میں سیاسی بدنظمی اور لاقانونیت پھیل گئی۔ حالیہ وضاحتوں میں اس زوال کو انتظامی امور میں گراوٹ کے طور پر دیکھا گیا ہے لیکن ان سب سے کوئی حتمی نظریہ نہیں ابھر سکا ہے۔ سلطنت کے زوال کے بعد ابھرنے والی علاقائی ریاستوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ مغل صوبے کے طور پر ان کی ترقی جیسی تھی ویسی بعد میں نہیں ہو سکی۔ اس نظریے کے طرفدار جاٹ، سکھ اور مراٹھا باغیوں کو لٹیروں کے گروہوں سے زیادہ نہیں مانتے تھے۔

مندرجہ بالا نظریہ کے مخالف وہ لوگ ہیں جو اٹھارویں صدی کے واقعات علاقائی پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ سلطنت کو اہمیت دینے کے بجائے جیسا کہ سلطنت مرکوز نظریہ میں کیا گیا، علاقہ مرکوز نظریے کے طرفداران سماجی فرقوں پر توجہ دیتے ہیں جو سلطنت کے مختلف گوشوں میں اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے کے عمل کے دوران ملک کی سیاسی اور معاشی سمت متعین کرتے تھے۔ ایک سطح پر مغل صوبائی حکومت کا ڈھانچہ ہی بنیادی طور پر تبدیل ہو گیا جس نے بنگال، اودھ اور حیدرآباد جیسی خود مختار ریاستوں کو ابھرنے کے لیے ماحول سازگار بنایا۔ دوسری طرف مراٹھے اور سکھ سیاسی طاقتوں نے جن کا عروج مغل حکمرانوں کی مخالفت میں ہوا، اجس نتظامی ڈھانچے کو اپنے اپنے علاقوں میں قائم کیا اس میں انہوں نے زیادہ تر مغل طرز کو ہی اپنایا۔ اس بدلے ہوئے علاقائی پس منظر میں صوبائی حکومتوں نے مغل امراء کو علاقائی طور پر اپنی طاقت بڑھانے کے نئے مواقع فراہم کئے، اور اس کے ساتھ ہی ان کے خاندان اور متعلقین کو زرعی زمینوں کے مالکانہ حقوق اور اجارہ داری کے اختیارات حاصل کرنے کا موقع ملا جو مزید آنے والے دنوں میں پشتینی جائیداد بن گئی۔ علاقائی سطح پر ترقی سے ان کی حالت اور مضبوط ہو گئی.

1750 کے بعد کے حالات کے بارے میں یورپی مکتب فکر ایک فاتح اور توسیع پسند اقتدار (خاص طور پر برطانیہ) کے قیام کو ترجیح دیتا ہے جس نے بد نظمی اور بے ترتیبی کے شکار ہندوستان کو شکست دی۔ یہ ہندوستان کے قومی اور مارکس وادی مکتب فکر کے مورخین کا سب سے اہم نظریہ ہے جو ہندوستان کی معاشی بد حالی کے اسباب کو تاریخی تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ قوم پرست مورخین اٹھارویں صدی میں ہندوستان میں پھیلی بدانتظامی کو اس ملک کی تاریخ میں گو کہ عارضی لیکن زبردست کمی مانتے ہیں، جس کی وجہ سے ایک ترقی پذیر قوم ایک غیر ملکی طاقت کی ماتحتی میں آکر اس کی نوآبادی بن گئی۔ روایتی مارکسوادی مکتب فکر برطانوی حکومت کو ایک ضروری برائی مانتے ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے اٹھارہویں صدی کے جاگیر داری نظام کا خاتمہ ہوا۔ حال کے کچھ مورخین برطانوی حکمرانی کو ایک ایسے نظام کے طور پر دیکھتے ہیں جو مسلسل منافع، اشیاء اور بازار کی تلاش میں تھی اور جس کو کسی کی ترقی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے بارے میں مورخین کے نظریات میں کچھ مشترک خیالات بھی ہیں۔ پہلا یہ کہ کل ہند خود مختار سیاسی نظام میں ہی انتظام اور استحکام ممکن ہے، کیونکہ یہ استحکام اٹھارویں صدی میں ختم ہو گیا اس لیے اس دور میں بد نظمی، بدامنی اور زوال کا راستہ ہموار ہوا۔ دوسرے یہ کہ سبھی نے مانا ہے کہ اس صدی میں عدم تسلسل پیدا ہوا۔ مندرجہ بالا دونوں ہی نظریات انگریزی حکومت کے قیام کو بنیادی طور سے عدم تسلسل اور ہندوستان کے روایتی طرز حکومت یا تمدن کے برخلاف مکمل طور پر غیر ملکی اور بیرونی تسلط کے طور پر دیکھتے ہیں۔

دوسری طرف ہندوستانی زاویہ نگاہ سے مطالعہ کرنے والے نوآبادیاتی نظام کی سمت میں ہونے والی تبدیلیوں کو کچھ الگ ہی نظریے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو صرف فتح اور قبضہ کرنے کے عمل کے طور پر نہ دیکھ کر ہندوستان کے یورپ سے دیرینہ تعلقات کے نتیجے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک غیر ملکی حکومت کے طاقت کے بل پر قیام کے بجائے اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کس طرح سے ہندوستانی سماج کے حالات نے انگریزی حکومت کو بڑھاوا دیا۔ اس دلیل کے مطابق ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام میں صرف شہری ضرورتوں نے ہی نہیں بلکہ ہندوستانی اداروں نے بھی تعاون کیا۔ قومی اور ہندوستانی مکتبہ فکر اٹھارویں صدی کو صرف بدامنی سے بھرپور عہد نہیں مانتے بلکہ ان کے مطابق مغل سلطنت کی وارث ریاستوں نے ہندوستان کو سیاسی استحکام عطا کیا۔ مغل سلطنت کے زوال میں ہندوستان کے معاشی بحران کی تصویر دیکھنے کے بجائے قومی مکتب فکر کا ماننا ہے کہ اٹھارویں صدی میں بھی ہندوستان کی تجارتی اور فوجی صلاحیتیں برقرار رہیں جس کا استعمال کمپنی نے اپنے فائدے کے لیے کیا۔ ایک طرف جہاں کمپنی کی اس بے جا مداخلت کی عوامی سطح پر زبردست مخالفت نظر آتی ہے، وہیں دوسری طرف ان کی کامیابی میں ملکی سطح پر مختلف اداروں کا بھی ہاتھ تھا۔ حالانکہ انگریزی حکومت، ہندوستانی نظام حکومت کی اساس یعنی زراعت، تجارت اور وسائل انسانی کی صلاحیتوں پر منحصر تھی، لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اسے اپنی ضرورتوں کے مطابق تبدیل کر لیا۔ ہندوستانی مکتب فکر کے مطابق اٹھارویں صدی کسی عدم تسلسل کی نشاندہی نہیں کرتی بلکہ اس میں گہرے تسلسل کی موجودگی کو ظاہر کرتی ہے جس میں پہلے سے چلے آرہے ادارے اور تنظیمیں برقرار رہے۔ البتہ ان کی شکل تھوڑی تبدیل ہو گئی تھی اور چاروں طرف تجارتی سرگرمیوں کا پھیلاؤ ہوا۔ اس نظریے کے حمایتی اکثر کیمبرج اسکول کے علمبردار کہلاتے ہیں اور متعدد ہندوستانی مورخین کا بھی یہی نظریہ ہے، لہٰذا انہیں مجموعی طور پر تحقیق پرست مورخین کا نام دیا جا سکتا ہے۔

16.4 بحث کا پس منظر (Background to the Debate)

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کو اپنی پوری تاریخ کے سب سے زیادہ بد نظمی والے دور سے گزرنا پڑا۔ مغل سلطنت جس نے براعظم ہند پر دو صدیوں تک حکومت کی، اندرونی رسہ کشی اور بیرونی حملوں کی وجہ سے زوال پذیر ہونا شروع ہو گیا۔ سلطنت کے زوال کے بعد، متعدد مقامی طاقتوں نے خود مختاری کے لیے شاہی خاندان کی مخالفت کی اور اسی دوران یورپی طاقتوں نے برصغیر ہند پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔

اٹھارویں صدی مختلف مکاتب فکر کے دانشوروں کے درمیان تاریخی بحث کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ یہ عہد وسطیٰ اور جدید دور کے درمیان منتقلی کے ایک مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اٹھارویں صدی میں مغل اقتدار کا زوال، خود مختار ریاستوں کے عروج سے جڑا ہوا تھا۔ ابتدائی تاریخ دانوں نے اس دور کو تاریک دور یا لاپرواہی، انتشار اور غیر ملکی قبضے کے طور پر شمار کیا تھا لیکن حالیہ یا ترمیم پسند مطالعات (Revisionist Studies) نے اٹھارویں صدی کی ان ریاستوں کو تغیر پذیری اور ترقی کے عناصر رکھنے والی الگ الگ ہستیوں کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ اکائی بنیادی طور پر اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ پر مورخین کے درمیان ہونے والی بحث کے تجزیہ پر مرکوز ہے۔ اس میں مختلف مکاتب فکر کے مورخین کے نظریات پر بحث کی گئی ہے جیسے مارکسی مکتب فکر کے علی گڑھ مورخین (Aligarh Historians of the Marxist School)، ترمیم پسند مکتب فکر (Revisionist School)، کیمبرج مکتب فکر (Cambridge School)، اور جدید ترمیم پسند مکتب فکر (Neo-revisionist) وغیرہ۔ یہ تاریخ دان مغل سلطنت کے زوال، خود مختار ریاستوں کے عروج اور ان کی معاشی خوشحالی اور ہندوستان میں انگریزوں کے غلبے سے متعلق بحث کرتے رہے ہیں۔ اٹھارویں صدی کا ہندوستان، ہندوستانی تاریخ کے ابتدائی نوآبادیاتی دور میں ایک بہت اہم دور کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہندوستان میں اٹھارویں صدی دو اہم تبدیلیوں کے ساتھ وابستہ تھی جس نے اقتدار اور سیاست کی ساخت کو تبدیل کیا اور سماج اور اقتصاد کی از سر نو ترتیب کی۔

1. پہلی۔ اٹھارہویں صدی کے پہلے نصف میں مغل ریاست سے علاقائی سیاسی نظاموں (اودھ، بنگال، حیدر آباد، وغیرہ) کی طرف منتقلی۔
2. دوسری۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک قسم کی کمپنی یا نوآبادیاتی ریاست کے طور پر ابھرنا ہے۔

ان دونوں واقعات کا ان مورخین نے خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، جو نہ صرف اٹھارویں صدی میں تبدیلی کی نوعیت پر بحث کرتے ہیں بلکہ ہندوستان میں ابتدائی نوآبادیاتی حکومت کے قیام کے سلسلے میں اس کے اثرات پر بھی بحث کرتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے پہلے نصف کی تاریخ نویسی نے مغلوں کے زوال کے ساتھ ساتھ اس 'تسلسل' کو بھی اجاگر کیا جسے ترمیم پسند مکتب فکر کو ترقی دینے والے دوسرے مورخین نے دیکھا۔

ایک طویل عرصے تک، اٹھارویں صدی کو تاریک دور(''Dark Age'') سمجھا جاتا تھا، جس کی خصوصیت مغلوں کا سیاسی زوال، معاشی تنزلی، جنگ اور بد نظمی تھی۔ تاہم، پچھلی چار دہائیوں میں، نئے علاقہ مرکوز (ترمیم پسند) مطالعات کا ایک سلسلہ ابھرا ہے، جس میں اس صدی کے روشن پہلوؤں پر مختلف نقطہائے نظر کے ذریعے زور دیا گیا ہے۔ ان مطالعات کے ذریعے ایسے کافی شواہد حاصل ہوئے ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اٹھارویں صدی کا پہلا نصف مکمل اور محیط اندھیروں کی صدی نہیں تھی۔ اگر اس نے چند خطوں کے سیاسی و معاشی زوال کو دیکھا تو ساتھ ہی بہت سے دوسرے خطوں کا ثقافتی، سماجی اور معاشی ارتقا بھی اسی دور میں ہوا۔

مغل سلطنت کے سیاسی زوال کے تنازعہ نے اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں معاشی اور سماجی تبدیلی کی نوعیت کے حوالے سے ایک بحث کو جنم دیا۔ مغل سلطنت کا سیاسی خاتمہ اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے پہلے نصف کی سب سے اہم پیشرفت ہے۔ اس اہم ترین واقعے نے مورخین کی کئی نسلوں کی توجہ مبذول کرائی ہے جو مغلوں کے زوال کے اسباب پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ اس سے دو بڑے مکاتب فکر کا ارتقا ہوا۔ مورخین کے ایک گروپ (علی گڑھ سکول) نے معاشی بحران اور حکمراں طبقے کے استحصال کے نتیجے میں مغل سلطنت کے زوال کی حمایت میں دلیل دی۔ اسکول (ترمیم پسند اسکول) نے اس سلسلے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ علاقائیت کے عروج کے لحاظ سے سیاسی ہنگامہ آرائی، معاشی خوشحالی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ دو مختلف نظریات اٹھارویں صدی میں 'تاریک دور بمقابلہ معاشی خوشحالی' کی بحث کو تشکیل دیتے ہیں۔

16.5 بحث (The Debate)

مغل سلطنت کے زوال کی ابتدائی تاریخ نگاری، حکمرانوں اور ان کے امرا کی انتظامی اور مذہبی پالیسیوں پر مرکوز تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے برطانوی منتظم دانشوران اور ہندوستانی قوم پرست مورخین دونوں نے سلطنت کا تجزیہ حکمراں اشرافیہ کے کردار کے لحاظ سے کیا۔ جادوناتھ سرکار(Jadunath Sarkar) کی تصنیفات میں اورنگ زیب پر توجہ مرکوز رہی، وہ شہنشاہ جس نے سلطنت کے زوال کا آغاز ہوتے دیکھا۔ خاص طور پر اس کی مذہبی پالیسی اور بعد میں اس کی دکنی مہمات کو مغل سلطنت کے زوال کی سب سے بڑی وجہ تسلیم کیا گیا۔ سرکار نے کسانوں کی بغاوتوں کو اورنگ زیب کی مسلم راسخ العقیدہ روش کے خلاف 'ہندو ردعمل' کے طور پر بیان کیا جس نے بالآخر مغلوں کے سیاسی استحکام کو تباہ کر دیا۔

اٹھارویں صدی کا ہندوستان سیاسی طور پر افراتفری اور معاشی طور پر بحران زدہ دور کے طور پر ابھرا۔ 1950 کی دہائی کے آخر سے ان دانشوروں کی طرف سے ایک مختلف نقطہ نظر اپنایا گیا، جو بڑی حد تک مارکسی نظریات سے مطابقت رکھتے تھے۔ انہوں نے مادیت پسندی کے لحاظ سے مغل سلطنت کے زوال کی وضاحتیں فراہم کرنا شروع کر دیں۔

اٹھارویں صدی کے 'جاگیرداری بحران' کا نظریہ جسے ستیش چندر (Satish Chandra) نے پیش کیا جس میں جاگیر اور منصب کے مغل اداروں کے کارکردگی میں بنیادی خامیوں کو سترہویں صدی کے آخر میں مالیاتی بحران کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔اٹھارویں صدی کے جاگیرداری بحران کی تعریف ستیش چندر نے ان الفاظ میں کی ہے: 'دستیاب سماجی زائد پیداوار، انتظامیہ کی لاگت کو ادا کرنے، کسی نہ کسی قسم کی جنگوں کی ادائیگی اور اپنی توقعات کے مطابق حکمراں طبقے کو زندگی کا معیار فراہم کرنے کے لیے ناکافی تھا۔' ان اداروں کی درست کارکردگی کو یقینی بنانے میں مغلوں کی ناکامی اورنگ زیب کے دور حکومت میں سب سے زیادہ واضح ہوگئی اور یہ سلطنت کے خاتمے کے عمل کا آغاز کرنے والی تھی۔

1980 کی دہائی میں، ستیش چندر کے بعد والے کام نے ایک بار پھر سلطنت کے سیاسی۔انتظامی بحران کے معاشی پہلوؤں کی طرف توجہ مرکوز کردی۔انہوں نے دلیل دی کہ جیسے جیسے جاگیریں کم اور نسبتاً بنجر ہوگئیں، تخمینہ شدہ محصول (جمع) اور اصل پیداوار (حاصل) کے درمیان فرق بڑھ گیا۔اس نے محصولات کی وصولی کو باقاعدہ بنانے والے ریاستی کارکنوں کی صلاحیت پر منفی اثر ڈالا۔ مخصوص معاشی اثرات والے ایک جاگیرداری بحران نے آخرکار مغل استحکام کا خاتمہ کردیا۔

مغل سلطنت کے زرعی نظام پر اپنی تصنیف *The Agrarian System of Mughal India, 1556-1707* میں، عرفان حبیب (Irfan Habib) نے مغلیہ سیاست کی مرکزی نوعیت کو بڑے پیمانے پر قبول کیا اور مغل زمینی محصول کی نمائندگی کرنے والے فاضل پیداوار کے بڑے حصے پر روشنی ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی، اس نے اصرار کیا کہ مغل سلطنت کا مرکزی حکمراں طبقہ یعنی منصبدار، ایک دوسرے بکھرے ہوئے مقامی موروثی ماتحت حکمراں طبقے یعنی زمینداروں کے ساتھ تعاون اور مخالفت کے رشتے میں تھا، جو کہ فاضل پیداوار میں ان کے شریک تھے۔انہوں نے مغلوں کے زوال اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی اور سماجی بدامنی کو مالی نقطہ نظر سے بیان کیا۔

عرفان حبیب نے زور دے کر کہا کہ 'مغل ہندوستان میں ریاست کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس نے نہ صرف استحصالی طبقوں کے محافظ کے طور پر کام کیا بلکہ وہ بذات خود استحصال کا بنیادی آلہ تھا۔' حبیب نے استدلال کیا کہ دہلی کی طرف سے طلب کی گئی زمینی آمدنی کی بلند شرح بڑے پیمانے پر دیہی استحصال کا سبب بنی، جس کے نتیجے میں کسانوں کی نقل مکانی اور بغاوت ہوئی۔اس نے ایک زرعی بحران پیدا کیا جس کے نتیجے میں سلطنت کی سیاسی عمارت کمزور پڑ گئی۔

مقامی زمین داروں کی کھلم کھلا مخالفت کی ایک بڑی وجہ جاگیرداروں کا بڑھتا ہوا ظلم ہو سکتا ہے۔ابتدائی شہنشاہوں نے تبادلے کے نظام کے ذریعے ان کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔ عرفان حبیب نے دلیل دی ہے کہ اس مغلیہ نظام کی وجہ سے اور اس سے فائدہ اٹھا کر جاگیرداروں نے کسانوں پر ظلم کیا۔ چونکہ ان کا اکثر تبادلہ ہوتا رہا، اس لیے انھوں نے اپنی جاگیر میں کسی بھی طویل مدتی دلچسپی کا کوئی تعلق نہیں پیدا کیا اور کسانوں کا خیال کیے بغیر، اپنے مختصر دور کے دوران زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے کی کوشش کی۔اس کی وجہ سے سلطنت

کے معاشی نظام میں گڑبڑیاں پیدا ہوئیں۔

مغل سلطنت کے زوال کو ایک 'ثقافتی' ناکامی کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ایم اطہر علی(M. Athar Ali)نے اپنی تصنیف *Mughal India: Studies in Polity, Ideas, Society and Culture* میں کہا کہ 'ثقافتی اور نظریاتی ناکامی' اسلامی سیاسی تشکیلات کی اپنی فوجوں اور پیداواری صلاحیتوں کو جدید بنانے یا ان میں انقلاب لانے میں ناکامی کی بنیادی وجہ تھی۔

ٹیکنالوجی کے میدان میں کوئی نئی ایجاد نہیں کی گئی۔ ہندوستان میں توپ خانے کے نئے ہتھیاروں کو ڈیزائن کرنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی گئی۔ مسکٹ اور بندوقیں بنانا محض ایک ہنر ہی رہا جس میں سائنس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا، لیکن یورپی دنیا میں ٹیکنالوجی اور سائنس کے میدان میں پہلے ہی انقلاب آچکا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان میں ابھی تک مجمع البحرین جیسی تصانیف کو مرتب کرنے اور ویدانت کی آفاقیت کو ثابت کرنے پر زور دیا جارہا تھا۔ اگرچہ ثقافتی تغیر پسندی بلاشبہ نئے خیالات کے اخذ کرنے اور تکنیکی اور پیداواری صلاحیتوں کی اعلیٰ سطح کو فروغ دینے یا جذب کرنے کے لیے اہم ہے۔ یہ استدلال کرنا کہ اچانک اس میں روکاوٹ پیدا ہوئی اور اس کے نتیجے میں پوری مسلم آفاقی دنیا کا جمود کا شکار ہوگئی، ایک بہت بڑا دعویٰ ہے۔ مزید یہ کہ یہ دیکھتے ہوئے کہ ان نئی ریاستوں نے طویل عرصے سے جنگ کے لیے نئی تکنیکوں کو اپنانے اور ایجاد کرنے، طرز حکمرانی کی ابتدائی جدید شکلوں (خاص طور پر افسر شاہیوں) کو یکجا کرنے اور تجارتی نیٹ ورک رکھنے کی زبردست صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا جس میں سماجی لچک اور فراخدلی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ ان تمام وجوہات کی وجہ سے سلطنت سیاسی اور معاشی طور پر کمزور ہو گئی۔

اقتدار عالم خان(Iqtidar Alam Khan)نے اپنا نظریہ پیش کیا جس میں عام طور سے رائج تکنیک سے بہتر ٹیکنالوجی تیار کرنے میں ناکامی پر زور دیا گیا اور یہ بالآخر مغل سلطنت کے زوال کا سبب بن گیا۔ ان کے مطابق 16ویں اور 17ویں صدی کے آخر میں بارود کی تیاری اور استعمال کے فن اور کسانوں اور زمینداروں کے درمیان بھی دستی بندوقوں کے پھیلنے نے مقامی عناصر کو شاہی اقتدار سے مقابلہ کرنے کے لائق بنایا۔ ان کے پیش کردہ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مغل شروع سے ہی شمالی ہندوستان میں دستی بندوق استعمال کرتے تھے۔

1528 میں بابر نے آتشی اسلحے کی تیاری اور تفنگچیوں کو ادائیگی کے لیے اپنے امرا کی تفویض میں 3/1 کی کمی کردی۔ 17ویں صدی تک بندوقوں کا آزادانہ استعمال کیا جاتا تھا۔ رفیع الدین ابراہیم شیرازی اپنے تذکرہ الملوک میں کہتے ہیں کہ جگدیش پور کے قریب بندوقوں سے مسلح لڑائی میں کئی امرا بھی مارے گئے۔ مانوچی نے بھی بندوق کے ساتھ عام کسانوں کا ذکر کیا ہے۔ ذخیرۃ الخوانین میں ہمارے پاس اس بات کا ثبوت ہے کہ کسان اپنے کھیتوں میں ہل چلاتے تھے اور ان کی بندوقیں زمین میں پھنسی ہوتی تھیں اور اس طرح، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ کسان اب مغل حکومت کا سامنا کرنے کے لیے اٹھ سکتے تھے۔ یہ وہی تھے جو کسانوں کی بغاوتوں کی قیادت کر رہے تھے، جس نے سلطنت کے سیاسی استحکام کے خاتمے میں مدد کی۔

مغل مرکوز مورخین کی طرف سے مغل سیاست کے تجزیے کے لیے 'ترمیم پسند نقطہ نظر' نے اب کئی شکلیں اختیار کرلی ہیں۔ سی اے بیلی (Sir C.A. Bayly) نے مغل سیاسی اور معاشی ڈھانچے کے انتشار کے تجزیے کے لیے 'ترمیم پسند نقطہ نظر' کو پہلی بار استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ 'مغلوں کی حکومت کا بنیادی مقصد وسعت اور مرکزیت تھا۔ اس نے مغل سلطنت کے زوال میں ایک مثبت عنصر دیکھا، جہاں 'کاروباری گروہ یا سماجی طبقات نے اٹھارویں صدی میں مغل سیاست کی 'تجارت کاری' اور 'عدم مرکزیت' کے ذریعے زراعت کو بڑھانے اور تجارت کو تیز کرنے میں اپنا کردار ادا کیا اور پھر اس کے لیے اپنی وفاداریاں سب سے زیادہ فائدہ مند طاقت یعنی انگریزوں کی طرف منتقل کردیں۔ اس طرح برطانوی فتح ایک ہند۔ برطانوی معاملہ تھا اور یہ بیلی کی 'تسلسل' کی تجویز کی انتہا تھی۔

اپنی کتاب *Rulers, Townsmen, and Bazars: North Indian Society in the Age of British Expansion, 1770-1870* میں تجویز کیا کہ علاقائی سیاسی اکائیوں کا حتمی شکل اختیار کرنا، تین اہم پیش رفتوں کا نتیجہ ہے۔

1. سب سے پہلے، ایک پرجوش بین ذاتی تجارتی تنظیم کا ظہور اور سیاست میں اس کی شمولیت کے نتیجے میں بچولیوں کے ایک نئے طبقے کا ظہور ہوا۔
2. دوم، متوسط طبقے کے ابھرنے کا عمل (gentrification) جس نے کاتبوں، محاسبوں اور دیگر مغل کارکن گروہوں کے ایک طبقے کو اکٹھا کیا۔
3. سوم، عسکری مالیاتی نظام کا مطلب بڑی فوجوں کی دیکھ بھال اور محصولات کی وصولی میں ان کی تعیناتی تھی۔

بیلی کے کام میں اصل زور، شاہی طاقت سے وابستہ بچولیوں کے عروج پر ہے، جو مغل فوجی اور مالیاتی اداروں اور طاقت کے نئے مراکز کے طور پر ان کے ابھرنے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ یہ مالگذاری اکٹھا کرنے والے بچولیے، جنھوں نے مختلف عہدوں سے اپنی طاقت حاصل کی اور جنھوں نے دہائی کے آخر میں انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ تعاون کیا، کو سی اے بیلی اور سنجے سبرامنیم (Sanjay Subrahmanyam) نے عہدیدار سرمایہ دار (Portfolio Capitalists) کے طور پر درجہ بند کیا ہے۔ اپنے حالیہ کام میں بیلی، علاقائی سیاستوں کے ذریعہ 'ہندوستانی معلوماتی تنظیم' پر استعمال کیے جانے والے بڑھتے ہوئے مقامی کنٹرول کو ظاہر کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں اس کے رسمی اور غیر رسمی نیٹ ورکوں کی افسری تنظیم میں اضافہ ہوا۔

مظفر عالم (Muzaffar Alam) اپنی تصنیف *The Crisis of Empire in Mughal North India: Awadh and the Punjab 1707-1748* میں ابتدائی اٹھارویں صدی کے اودھ کے مطالعے کے دوران بہت زیادہ معاشی عروج اور خوشحالی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں خطے میں زمینداروں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ معاشی خوشحالی بڑھتی ہوئی تجارت کاری اور معیشت میں سکوں کے چلن کے اضافے کا نتیجہ تھی جو مغلوں کے دورِ عروج میں شروع ہوئی تھی۔ دولت مند

زمینداروں نے اپنے نئے حاصل کردہ اثاثوں سے فائدہ اٹھایا اور مغل احکام کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے استدلال کیا کہ مغل اقتدار کی مرکزیت کا زوال لازمی طور پر لامرکزیت کا ایک پیچیدہ عمل رہا ہوگا، جس میں مقامی اشرافیہ جو مغلیہ تسلط کے تحت خوشحال ہوئے تھے، خود مختاری کی علامتوں اور اشیا کو زیادہ سے زیادہ ہتھیانے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ اٹھارویں صدی کے بہار پر اپنے مضمون میں، عالم نے علاقائی اور شاہی فارسی ادب اور اردو شاعری دونوں سے ثبوت کے ساتھ اپنے مالیاتی نشوونما کے استدلال پر زور دیا۔ یہ مواد، درباری روزناموں کے برعکس، بہت سے سماجی گروہوں کی زندگیوں کو چھوتا ہے۔ اس مواد کی بنیاد پر، عالم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اٹھارویں صدی کا بحران، اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ مسئلہ ہے جتنا کہ سلطنت کے دہلی مرکوز انتظامی اور مالیاتی مطالعات نے اب تک پیش کیا ہے۔

کیرن لیونارڈ (Karen Leonard) مغل سلطنت کے زوال کا 'عظیم نظریہ' پیش کرتی ہیں، جو *Comparative Studies in Society and History* میں شائع ہوئی۔ ان کے مطابق، معاشی وسائل کی دستیابی اور تقسیم کی تلاش نے ایک گروہ کو نظرانداز کر دیا تھا جس کا مغل ریاست سے تعلق تھا اور سیاسی نظام میں جن کا کردار بہت اہم تھا جیسے ساہوکار، صراف، مہاجن اور خاص طور پر وہ لوگ جو عظیم فرموں سے جڑے تھے۔ انہی عظیم فرموں نے سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

انہوں نے دلیل دی کہ مقامی بنکاری فرمیں مغل ریاست کی ناگزیر اتحادی تھیں اور بہت ممکن ہے کہ بڑے امرا اور شاہی افسران ان بنکاری فرموں پر براہ راست انحصار کرتے تھے۔ چنانچہ اس طرح، عظیم فرموں کے وسائل، قرض اور تجارت دونوں کی، مغلوں سے دیگر علاقائی سیاسی طاقتوں کی طرف منتقلی نے سلطنت کے دیوالیہ ہونے اور بالآخر اس کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔

مالگذاری اکٹھا کرنے میں بنکاری فرموں کا بڑھتا ہوا اہم کردار تھا۔ یہ کافی حد تک واضح ہے کہ 1750 تک یہ مہاجن ہی تھے جنہوں نے قرض یا نقد کی فراہمی کے ذریعے زمینی محصولات کی اصل وصولی تک رسائی کو کنٹرول کیا۔ سلطنت کے زوال کا دور مرکزی مغل حکومت کو قرضے کی مسلسل فراہمی کو جاری رکھتے ہوئے، علاقائی اور مقامی سطحوں پر محصول وصولی میں بینکنگ فرموں کی بڑھتی ہوئی شمولیت کے ساتھ ہی واقع ہوا تھا۔ یہ شمولیت 1650 سے 1750 تک آتے آتے مزید بڑھ گئی اور اس نے مہاجنوں کو پہلے سے زیادہ براہ راست، پورے ہندوستان میں سیاسی اقتدار کے عہدے فراہم کیے۔ ان عظیم فرموں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی شورش نے مغل سلطنت کے زوال کی راہ ہموار کی۔ پہلی پہل دیکھنے سے عظیم فرم نظریہ 1690 سے 1720 تک سلطنت کے زوال کی ممکنہ وضاحت پیش کرتا ہے، لیکن پھر اس نظریے کو ایک سنگین چنوتی جے ایف رچرڈز (J.F. Richards) نے دی جو اس نظریہ میں دستاویزات کے سنگین مسائل دریافت کرتے ہیں۔ درحقیقت، کیرن لیونارڈ خود تسلیم کرتی ہیں کہ ان کا تمام مواد، ثانوی ذرائع (secondary sources) سے اخذ کیا گیا ہے۔ مزید برآں، رچرڈز کو کیرن لیونارڈ سے اتفاق کرنا مشکل لگتا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ 'میں اس بات پر یقین سے بہت دور ہوں کہ عظیم فرم کی اصطلاح، جیسا کہ لیونارڈ نے اس کی تعریف کی ہے، مغل معیشت پر بحث کے لیے مفید ہے۔ ان کے مطابق، مختلف قسم کے تجارتی گروہ تھے جو مختلف شعبوں میں ضروری خدمات انجام دیتے تھے۔ اناج کے سوداگر یا ساہوکار (بقال، مہاجن) جو کسانوں، گاؤں کے مکھیاؤں، دیہی اشرافیہ کو

نقد قرض دے کر زمینی مالگذاری نظام کے لیے رقم کی فراہمی سے وابستہ تھے اور وہ قصبوں سے بڑے شہروں اور شاہی شہروں میں غلہ وغیرہ خریدتے، ذخیرہ کرتے، بھیجتے اور بیچا کرتے تھے۔ صراف (پیسہ تبدیل کرنے والے یا پیسہ قرض دینے والے) ہنڈیوں (مبادلہ کے بل) اور ڈپازٹ بینکنگ (بیاج کے ساتھ پیسہ جمع کرنے) کی ایک محدود شکل کے ذریعے قلیل مدتی مالیات میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ سکوں اور دھاتوں کا بھی سودا کرتے تھے۔ اسی طرح، ایک اور گروپ دلالوں (brokers) کا تھا جو کہ ایک انتہائی ماہر تجارتی گروپ تھا۔

جے ایف رچرڈز کی دکن میں مغل انتظامیہ کی تحقیق نے اس نظریے کو چنوتی دی کہ اس علاقے میں قابل استعمال جاگیروں کی کمی تھی۔ ان کے اس تحقیق کے نتیجے میں کہ دکن خسارے کا علاقہ نہیں تھا، اس نظریے پر سوالیہ نشان لگا دیا کہ بے جاگیری (جاگیروں کی عدم موجودگی) سلطنت کے بحران کی ایک بڑی وجہ تھی۔

رچرڈ بارنیٹ (Richard Barnett) اپنی تصنیف *North India Between Empires: Awadh, the Mughals, and British, 1720-1801* میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اودھ کی اٹھارویں صدی کی تاریخ، شمالی ہندوستان میں مغلوں کے بعد کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ پائیدار حکومت اور برطانیہ کے ساتھ ماتحت اتحاد (subsidiary alliance) کے نظام کے تحت آنے والی پہلی ہندوستانی ریاست، اپنے آپ میں کامیابی کی ایک کہانی ہے۔ بارنیٹ کے اٹھارویں صدی کے اودھ کے مطالعے میں سب سے زیادہ اشارہ اس کی ثقافتی زندگی کی طرف ہے۔ یہ ثقافتی میدان ہی تھا جس میں کہ اودھ سب سے واضح طور پر مغلوں کی جانشین ریاست کے طور پر ابھرتا ہے۔ مغلوں کا دارالحکومت غیر محفوظ ہونے پر شاعروں اور فنکاروں نے دہلی کو چھوڑ دیا۔

اینڈریا ہنٹز (Andrea Hintz) نے اپنی کتاب *The Mughal Empire and Its Decline: An Interpretation of the Sources of Social Power* میں بتایا کہ عظیم مغل چھتری جو برصغیر میں پھیلی ہوئی تھی، اٹھارویں صدی کے دوران پیوند کی شکل میں رفتہ رفتہ بہت رنگ برنگی ہو چکی تھی اور جس نے کئی جانشین ریاستوں جیسے اودھ، بنگال، حیدر آباد، مراٹھوں اور سکھوں کے ابھرنے کو نشان زد کیا۔ ان جانشین ریاستوں نے ایک ہی قسم کے نیٹ ورکوں پر کام کیا تاکہ شاہی مرکز میں وسائل کے بہاؤ کو نہ صرف روکا جا سکے بلکہ اس کو مستقل طور پر الحاق، غاصبانہ قبضے اور تسلط کے ذریعے الٹا کر دیا جائے۔

اشین داس گپتا (Ashin Das Gupta) اپنی کتاب *Indian Merchants and the Decline of Surat: c. 1700-1750* میں اشارہ کرتے ہیں کہ کاروباری تجارتی اداروں نے دورِ زوال میں سامان کی نقل و حمل اور قرض اور بیما خدمات کی فراہمی کی نگرانی کے لیے سیاسی حدود سے تجاوز کیا۔ اگرچہ اندرون ملک تجارت میں اضافہ ہوا، لیکن یورپیوں کی پیش قدمی کے پیش نظر برآمدی تجارت اور بندرگاہی شہروں کو نسبتاً تنزلی کا سامنا کرنا پڑا۔

چیتن سنگھ (Chetan Singh) اپنی کتاب *Region and Empire: Punjab in the*

Seventeenth Century میں عالم کے ذریعے قائم کردہ علاقہ مرکوز رجحان کی پیروی کرتے ہوئے، تجویز کرتے ہیں کہ پنجاب جیسے کچھ صوبوں میں سیاسی بدامنی کا تعلق ایک طرف مغل میدانی علاقوں کی زرعی معیشت اور دوسری طرف مستقل زندگی کی طرف بڑھ رہے حاشیائی قبائلی سماج کے درمیان پیدا ہونے والے تناؤ سے ہے۔ مؤخر الذکر عمل نے قبائلی سماجوں کے ڈھانچے کو تبدیل کردیا اور زرعی معیشت پر دباؤ بڑھادیا، جو پہلے ہی دباؤ کا شکار تھی۔ اس طرح، اٹھارویں صدی کے واقعات کی جڑیں ان معاشی عمل کاریوں میں تھیں جنھوں نے سلطنت کے آغاز سے ہی اس کی کارکردگی کو شکل دی۔

پرسنن پارتھاسارتھی (Prasannan Parthasarthi) اور ڈیوڈ واشبروک (David Washbrook) جیسے نو ترمیم پسند مکتب سے تعلق رکھنے والے مورخین نے اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ترمیم پسند استدلال پر سوال اٹھایا ہے۔ پارتھاسارتھی نے اپنے مضمون 'Merchants and the Rise of Colonialism' میں وضاحت کی ہے کہ جنوبی ہندوستان میں مزدوروں کی کمائی بہت زیادہ تھی اور ان کا معیار زندگی ان کے برطانوی ہم منصبوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھا۔ یہ اعلیٰ زرعی پیداوار کی وجہ سے تھا جس نے کاریگروں کو کم اجرت پر زندہ رہنے کے قابل بنایا اور صنعت کو پیداواری لاگت اور قیمت کے لحاظ سے ایک مسابقتی منزل دی۔

تاجروں کے معاملے میں طلب میں اضافے کا مطلب زیادہ طاقت کا حصول تھا۔ واشبروک کا استدلال ہے کہ 18ویں صدی کی آخری دہائیاں کم درجہ لوگوں اور غیر ہنرمندوں (pariahs) کے لیے سنہری دور تھیں۔ اس دور کی جنگوں نے مزدوری کی طلب میں اضافہ کیا۔ تجارتی ریاستوں کے درمیان اپنی فوجوں کو کھانا کھلانے کے لیے تجارت اور نقد رقم کے لیے مسابقت نے بھی ایسے مواقع پیدا کیے جن کے اندر مزدور بہتر شرائط پر گفت وشنید کر سکتے تھے اور آخر کار، کچھ مزدوروں کے زرعی سرگرمیوں سے الگ ہونے نے باقی رہ جانے والوں کی سودے بازی کی طاقت کو بڑھادیا۔ اس طرح، کم از کم کچھ علاقوں میں مزدوروں کے لیے، 18ویں صدی نسبتاً خوشحالی کا دور تھا۔

16.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہم اٹھارویں صدی کی سیاست کا اس طرح خلاصہ کر سکتے ہیں کہ اس دور کی معیشت اور سماج، تبدیلی اور تسلسل دونوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کو تاریک دور بنام روشن اور تغیر پذیر دور کی بحث کے طور پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ 18ویں صدی کی تاریخی بحث اس لیے بھی گہری اور اہم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس میں عظیم مغل سلطنت کے زوال، علاقائی ریاستوں کے عروج، شمالی ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی قبضے کے آغاز اور مقامی سماج اور معیشت پر اس کے اثرات کا مشاہدہ کیا گیا تھا۔ مختلف مکاتب فکر کے تجزیوں کی بنیاد پر یہ واضح ہے کہ 18ویں صدی کو مکمل زوال کے دور کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا، چاہے وہ سیاسی، سماجی یا معاشی طور پر کیوں نہ ہو۔ یہ ایک حادثاتی دور تھا جو دو سلطنتوں کے درمیان ایک فاصلہ تھا یا مغربی لوگوں (Occidentals) کے ذریعے تہذیب کا تحفہ دیے جانے سے پہلے کا تاریک دور تھا۔ یہ ایک ایسا دور تھا جس میں تبدیلی کی نشان دہی کی گئی تھی کیونکہ نئی علاقائی پالیسیاں ابھریں اور ساتھ ہی ساتھ مقامی معاشی اور ثقافتی عناصر کو کمپنی راج

نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہندوستان کی اٹھارویں صدی کی تاریخ کی نوعیت پر بحث نے مغل ہندوستان کے زوال اور علاقائی طاقت کے عروج، خاص طور پر معاشی میدان میں اور ہندوستان میں کمپنی کی طاقت کی توسیع کا مطالعہ کرنے والے دونوں طرح کے مورخین کو مشغول کر دیا ہے۔

16.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

چوہدری: نیم موروثی پرگنہ سطح کا اہلکار، بنیادی طور پر محصول کی وصولی سے متعلق۔

فلورین: چاندی کا سکہ پہلی بار بارہویں صدی میں فلورنس اور اس کی خوبصورتی کے لیے مشہور ہے۔ ہندوستان میں یہ سکہ ڈچ تاجروں کے ذریعہ بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا تھا اور اس کی قیمت تقریباً چالیس سینٹ تھی۔

جگت سیٹھ: روشن۔ دنیا کے بینکرز۔ یہ وہ عنوان تھا جسے بنگال کے مشہور جین بینکاروں نے دیا تھا۔ یہ سراج الدولہ کے دور میں تھا۔ دولہ کے دور میں اس وقت کے جگت سیٹھ نے ایک اہم کردار ادا کیا اور سراج کے ماموں میر کے ساتھ مل کر غداری کا کردار 1757 میں پلاسی کی جنگ کے نتائج کا تعین کرتے ہوئے جعفر، امی چند اور رائے درلبھ۔

جاگیرداری نظام: امیروں کو تنخواہ کے بدلے دیے جانے والے کام۔ اس طرح تفویض کردہ علاقوں کو جاگیر اور اس کا حامل جاگیردار کہا جاتا تھا۔ تاہم، جاگیردار کو زمین الاٹ نہیں کی گئی تھی بجائے اس کے کہ اس نے اپنے تفویض کردہ رقبے سے آمدنی/محصول وصول کیا۔ جاگیریں اکثر قابل منتقلی ہوتی تھیں۔

جوت دار: گاؤں کا زمیندار۔ جوتیدار زمینوں پر قبضہ کرتے تھے۔ زمینداروں سے طویل مدتی لیز پر اور پھر اس کی کاشت حصص کی بنیاد پر ٹھیکے پر کی گئی۔ زمیندار کی طرف سے زمین کو رعایتی نرخوں پر دوبارہ کاشت میں لانے کے مقصد کے لیے دی گئی لیز۔ تاہم، جوٹس میں کسانوں کے حقوق کو روایتی ضابطوں کے ایک سیٹ سے تسلیم کیا گیا تھا۔

منصب داری نظام: منصب کا مطلب درجہ ہے۔ مغل بیوروکریسی میں داخل ہونے والے ہر فرد کو منصب الاٹ کیا جاتا تھا۔ اس کے دوہرے درجات ہیں۔ زات اور سوار۔ Zat نے سرکاری درجہ بندی میں اپنے ہولڈر کی حیثیت اور ہولڈر کی ذاتی تنخواہ کا تعین کیا۔ سوار کا درجہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ایک منسبدار کو کتنا دستہ (گھوڑے، سوار اور سامان) رکھنا تھا۔ طلقدار زمیندار کا متبادل۔ یہ اصطلاح 17ویں صدی کے آخر میں استعمال ہوئی۔

زمیندار: موروثی اعلیٰ حقدار۔ زمیندار تھا۔ جمع شدہ کل محصول کے فیصد کا حقدار۔ یہ عام طور پر جمع کردہ کل محصول کا 10% تھا (حالانکہ 25% تک مختلف ہوتا ہے)۔ جب زمیندار ریاست کے لیے محصول جمع کر رہا تھا تو اسے نانکر کے نام سے جانا جاتا تھا اور جب ریاست براہِ راست اس کو پاس کر کے محصول وصول کرتی تھی تو وہ ملکانہ کا حقدار تھا۔

16.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. Occidentals سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. دیابھاگ کس چیز کے سیکھنے کا مرکز تھا؟
3. کس مغل حکمراں کو درباری گروہ بندی کا شکار بنا کر قتل کر دیا گیا تھا؟
4. کس کمپنی نے ہندوستان پر اقتدار حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی؟
5. اورنگ زیب کو خاص کر کن لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا؟
6. کن جنگوں کے نتیجے کے طور پر انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی نے سیاسی میدان میں قدم رکھا؟
7. معاشی نقطہ نظر سے بھی اس صدی کو 'طویل' سمجھنا فائدہ مند یا نقصان دہ؟
8. اگر ہم 1750 تک کے عہد کو لیں تو کتنی طرح نظریات سامنے آتے ہیں؟
9. 1750 کے بعد کے دو نظریات کا نام بتایئے۔
10. ترمیم پسند مطالعات سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

16.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. حکمراں کی شخصیت کو آپ کس حد تک زوال کا سبب مانتے ہیں؟
2. مرکزی حکومت کے اقتدار کی کمزوری کس حد مغل سلطنت کے زوال کا سبب بنی؟
3. کیا آپ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اٹھارویں صدی 'تاریک دور' تھی؟
4. اٹھارویں صدی کے دوران علاقائی سلطنتوں کے ابھرنے کا تجزیہ کیجیے۔
5. آپ اٹھارویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں کیا تسلسل اور تبدیلیاں دیکھتے ہیں؟

16.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اٹھارہویں صدی کے مخصوص اوصاف بیان کیجیے۔
2. اٹھارہویں صدی کی بحث کے پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
3. اٹھارہویں صدی کی بحث پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

16.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Alam, Muzaffar, *The Crisis of Empire in Mughal North India*: *Awadh and the Punjab, 1707-1748*, Delhi, 1986.
2. Alavi, Seema (ed.), *The Eighteenth Century in India*, Delhi, 2002.
3. Ali, M. Athar, 'The Eighteenth Century: An Interpretation', *Indian Historical Review*, Vol. 5, 1978-79.
4. Barnett, R.B., *North India between Empires*: *Awadh, the Mughals and the British*, *1720-1801*. Berkeley, University of California Press, 1980.
5. Bayly, C.A., *Empire and Information*: *Intelligence Gathering and Social Communication in India*, *1780-1870*. Cambridge University Press, Cambridge, 1996.
6. Bayly, C.A., and Subrahmanyam, Sanjay, 'Portfolio Capitalists and the Political Economy of Early Modern India', *Indian Economic and Social History Review*, Vol. 25, No. 4, 1988, pp. 401-424.
7. Bayly, C.A., *Rulers*, *Townsmen and Bazaars*: *North Indian Society in the Age of British Expansion*, *1770-1801*, Cambridge, 1983.
8. Chandra, Satish, *Parties and Politics at the Mughal Court*, *1707-1740*, People's Publishing House, Bombay, 1973.
9. Chandra, Satish, *Medieval India*: *Society, the Jagirdari Crisis and the Village*, MacMillan, Delhi, 2018.
10. Habib, Irfan, *The Agrarian System of Mughal India*, *1556-1707*. Asia Publishing House, Delhi, 1963.
11. Leonard, Karen, 'The Great Firm Theory of the Decline of Mughal Empire', *Comparative Studies in History and Society*, Vol. 21, No. 2, 1979, pp. 151-167.
12. Marshall, P.J. (ed.), *The Eighteenth Century in Indian History*: *Evolution or Revolution*, Delhi, 2003.
13. Parthasarathi, P., 'Merchants and the Rise of Colonialism' in B. Stein, and S. Subrahmanyam eds., *Institutions and Economic Change in South Asia*, Delhi, 1996.
14. Richards, J.F., 'Mughal State Finance and the Premodern World Economy', *Comparative Studies in Society and History*, Vol. 23, No. 2, 1981. pp. 285-308.
15. Singh, Chetan, 'A Critique of Revisionist Approaches', *Proceedings of Indian History Congress*, 52nd Session, Delhi, 1991.
16. Washbrook, David, 'Land and Labour in Late Eighteenth–Century South India: The Golden Age of the Pariah', in Peter Robb ed., *Dalit Movements and the Meanings of Labour in India*, Delhi, 1993.

نمونہ پرچہ امتحان

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

Master of Arts ماسٹر آف آرٹس

Subject Code : MAHS102CCT

Paper II : Political and Administrative Institutions in India (12^{th}-18^{th} Centuries)

دوسرا پرچہ: ہندوستان میں سیاسی اور انتظامی ادارے (بارہویں تا اٹھارہویں صدی)

1^{st} Semester Examination ، پہلا سمسٹر امتحان

Time : 3 hours وقت : 3 گھنٹے   Marks : 70 نشانات : 70

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔
(1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. تاریخِ اکبری کا مصنف کون ہے؟

ii. منتخب التاریخ کس کی تصنیف ہے؟

iii. خزائن الفتوح ۔۔۔۔۔۔ کی فتوحات سے متعلق ہے؟

iv. ہندوستانی تاریخ سے متعلق بیرونی کی مشہور کتاب کا کیا نام ہے؟

v. تاریخ فیروز شاہی کو برنی نے کس بادشاہ کے نام معنون کیا ہے؟

vi. فتوح السلاطین کا مصنف کون ہے؟

vii. کن جنگوں کے نتیجے کے طور پر انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی نے سیاسی میدان میں قدم رکھا؟

viii. معاشی نقطہ نظر سے بھی اس صدی کو 'طویل' سمجھنا فائدہ مند یا نقصان دہ؟

ix. اگر ہم 1750 تک کے عہد کو لیں تو کتنے طرح نظریات سامنے آتے ہیں؟

x. 1750 کے بعد کے دو نظریات کا نام بتائیے۔

حصہ دوم

2. آداب الحرب والشجاعۃ کس طرز کی تصنیف ہے؟ بیان کیجیے۔

3. منہاج السراج کی تصنیف طبقاتِ ناصری کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

4. حکمراں کی شخصیت کو آپ کس حد تک مغل سلطنت کے زوال کا سبب مانتے ہیں؟

5. مرکزی حکومت کے اقتدار کی کمزوری کس حد مغل سلطنت کے زوال کا سبب بنی؟

6. کیا آپ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اٹھارویں صدی 'تاریک دور' تھی؟

7. اٹھارویں صدی کے دوران اودھ کے ابھرنے کو بیان کیجیے۔

8. پدری افسر شاہی حکومت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

9. شیر شاہ کی زندگی پر نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

10. ہندوستان میں فارسی تاریخ نویسی کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے۔

11. مغل عہد کے مورخین اور ان کی تصنیفات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

12. دہلی سلطنت کی نوعیت پر مختلف نظریات کی وضاحت کیجیے۔

13. دہلی سلطنت میں سماجی طبقات پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

14. مغل سلطنت کے زوال کے نظریات پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

اہم نکات